HISTORY OF Maulana Moh…
DEOBAND

مولانا ملا محمد محمود صاحب دیوبندی

Moulana

۱۳۳۵
۳۷ر

میں مشغول رہتا گھر میں کھانا پکت جاتا سب کھا لیتے لیکن میری والدہ کسی قدر آٹا بچا کر میری منتظر رہتیں۔ گرمی کے دوپہر میں جب بارہ بجے میں جاتا فوراً خود تازہ روٹی پکا کر کھلاتیں۔ اِن مخدومہ کا انتقال سنہ ۱۳۰۱ھ میں حضرت کے والد ماجد سے تیئیس برس پہلے ہو گیا تھا ÷

اِن کی وفات کے روز ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ حضرت کے والد ماجد کی پنشن کا عرصہ سے انتظام ہو رہا تھا۔ پنشن کا باضابطہ حکم اِن مخیرہ بی بی کے انتقال سے نصف گھنٹہ بعد پہنچا۔ صاحبزادے نے والد ماجد سے فرمایا کہ "تمھاری والدہ کی وفات سے نصف رزق کم ہو گیا ÷

حضرت مولانا سنہ ۱۲۶۸ ہجری[۱] (سنہ ۱۸۵۱ عیسوی[۲]) میں بمقام بریلی (جبکہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم تھے) عالم ظہور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہارِ مسرت کیا۔ اور **محمود حسن** نام رکھا اور تاریخی نام بعض ظریف علما نے ولد ذو الفقار علی تبلایا۔ حسب دستور شرفائے ہند والدہ کی آغوش شفقت میں پرورش پائی۔ لیکن دودھ اکثر ایک مرضعہ دیوبند کی رہنے والی کا پیا۔ چھ سال کی عمر میں یہ صاحب طالع سعید بچہ" جو آگے چلکر محدثِ یگانہ، استاذ العلماء ہونے والا تھا۔ **الف با** پڑھنے بیٹھا۔ سیرۃً و صورۃً نہایت مقدس اور بہت معمر بزرگ میانجی منگلوری صاحب سے قرآن مجید کا اکثر حصہ پڑھا اور کسی قدر میانجی مولوی عبد اللطیف صاحب سے۔ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی انہیں سے پڑھی۔ اُسکے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور اُستاذ مولوی مہتاب علی صاحب سے تحصیل فرمائی۔ مولانا کے ہم عمر لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی مولانا کی طبعی صلاحیت ظاہر و ہویدا تھی۔ کوچہ گردی اور رزیل کھیلوں سے ہمیشہ اجتناب رہا ہے۔ البتہ سیر و شکار سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا ÷

حضرت مولانا کی عمر پندرہ سال کی تھی اور ابھی آپ قدوری اور تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دیوبند میں خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ ہجری کو ایک عربی مدرسہ کا اجراء ہوا اور مولانا ملا محمد محمود صاحب دیوبندی (ایک بزرگ عالم جو گوشہ علمائے دیوبند کے استاد ہیں) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی تجویز سے پندرہ روپیہ ماہوار

---

[۱] ماہ شوال روز دوشنبہ یوم ولادت معلوم ہوا ہے مگر مشکوک ہے ۱۲ [۲] سنہ ۱۸۵۷ء یعنی غدر کے زمانہ میں آپکی عمر چھ سات سال کی تھی اور اکثر میرٹھ رہتے تھے جہاں آپکے والد ماجد کا تبادلہ ہو گیا تھا اور کبھی دیوبند ÷

مشاہرہ پر مدرس مقرر ہوئے۔ اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں (جو ہمیشہ سے بزرگانِ دین کی قیامگاہ رہی ہی) تعلیم عربی شروع ہوئی +

سبحان اللہ کیا مبارک ساعت تھی اور کیسے متبرک حضرات تھے کہ اُن کی معمولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس اور پنجاب اور کابل تک کے طلبہ جمع ہو گئے۔ اکیس طالبعلموں کی جمعیت پر مدرسہ کا اجرا ہوا تھا۔ اور اخیر سال اور وقتِ امتحان تک اٹھتر آدمیوں کا اجتماع ہو گیا۔ اور حق تعالیٰ کی عنایت اور بانیوں کی حسنِ نیت سے رفتہ رفتہ وہ مختصر مکتب عظیم الشان دار العلوم ہو گیا۔ اطراف واکنافِ عالم کے لوگ کھنچکر آ گئے۔ اور احادیثِ نبویہ اور علومِ اسلامیہ کے چشمے جاری ہو گئے والحمدُ للہِ علیٰ ذٰلک +

اس موجودہ زمانہ کی طرح اُسوقت جابجا عربی مدارس جاری نہ تھے اور مدرسہ جاری کرنا ایک ایسا اہم و دشوار کام سمجھا جاتا تھا جس کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا۔ اور اُسکا جاری رہنا ایک امر محال نظر آتا تھا۔ چونکہ معتقد علیہ بے لوث بزرگوں اور مشہور مقتدا حضرات کی تجویز تھی۔ اور اہلِ شہر نیک نیت و صاحب دین تھے بسبب اُمید سے بڑھکر اعانت فرمائی۔ اور رفتہ رفتہ اطلاعِ عام ہوئی مالی امداد اور طلبہ کا رجوع یوماً فیوماً زائد ہوا کارکن حضرات کی ہمت بندھی اور کام بحسن اسلوب جاری رہا +

جب طلبہ کی کثرت ہوئی اور مسجد اور اُسکے حجروں میں درس تدریس وقیامِ طلبہ کی گنجایش دشوار ہو گئی۔ تو ایک مکان متصل مسجد قاضی کرایہ پر لیا گیا۔ اور سنہ ۱۲۹۱ ہجری کے آخر میں مدرسہ کے لئے تعمیر مکان کی تجویز ہو کر انتظام واہتمام اور چندہ شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۲۹۳ ہجری میں مبارک ہاتھوں سے وسیع پیمانہ پر بنیاد رکھی گئی۔ اور بتدریج ترقی ہو کر بفضلہ تعالیٰ آج ایک اسلامی یادگار اور مسلمانوں کے لئے قابلِ فخر عمارت موجود ہے۔ بزرگوں کی برکت سے مدرسہ میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی مدرسینِ عربی میں اضافہ کیا گیا اور فارسی و قرآن شریف کا بھی مستقل مدرس رکھکر انتظام کیا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ابن مولانا مملوک علی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو اجمیر میں سو روپیہ مشاہرہ پر مدرس رہ چکے تھے اور پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ارشاد سے اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھکر اواخر سنہ ۱۲۸۳ ہجری میں

تشریف لائے اور نہایت قلیل مشاہرہ بیس روپیہ (کچھ عرصہ کے بعد تیس روپیہ) پر صدر مدرس قرار پائے۔ (مولانا موصوف ایک جامع العلوم والفنون صاحب قوت قدسیہ بزرگ مشاہیر زمانہ میں سے تھے۔ آپکے وجود باجود سے مدرسہ دیوبند میں ایک روح تازہ آگئی۔ اور مدرسہ اور طلبہ کو قابل یادگار فیوض و برکات حاصل ہوئے ۱۳۰۲ھ میں بمرض ہیضہ اپنے وطن نانوتہ ضلع سہارنپور میں درجۂ شہادت حاصل فرمایا (رحمۃ اللہ علیہ) ٭

ہمارے حضرت مولانا اجرائے مدرسہ کے بعد مدرسہ کے سابقین اولین طلبہ میں داخل ہوئے ۱۲۸۳ھ میں آپنے کنز الدقائق، میبذی، مختصر معانی وغیرہ پڑھکر سالانہ امتحان دیا اور آیندہ سال ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، مقامات وغیرہ میں امتحان دئے۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستّہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ اُستاد حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے شروع کی۔ مولانا ممدوح میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے۔ پھر مطبع دہلی منتقل ہوگیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہوئے۔ اور کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لیجاکر مقیم رہتے۔ حضرت مولانا نے ان سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال اُستاد کی ساتھ رہکر دل و جان سے قابل رشک خدمت کرکے سعادت حاصل کی۔ اور سفر وحضر میں سلسلۂ درس جاری رکھکر اُستاد کی شفقت اور اپنی ذکاوت سے بکمال تحقیق کتابیں پڑھی ٭

مولانا کی خدمت میں سبق پڑہنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھیرنا تو گویا گناہ کبیرہ تھا۔ اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا مکدر ہوجاتے اور سبق کا لُطف ہی جاتا رہتا۔ جو شخص ذہین و مستعد ہوتا اور اصل کتاب کو پہلے سے سمجھا ہوا ہوتا وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی اُمید کرسکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں۔ عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ لوگ خوشی سے قبول کرتے اور حاضر ہوتے ٭

مولانا کا طرز ہی جُدا تھا حدیث ہو یا منطق، کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب وغریب تحقیقات بیان فرماتے۔ جس سے ہر مسئلہ کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہد طور پر

ہوجاتی تھی اور اس قسم کے مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی کے خیال میں آئے تھے نہ کسی نے سُنے ✣
حضرت کو قدرتی طور پر سعادتِ ازلی سے مولانا کے مضامین سے خاص مناسبت تھی۔ اور اسی کے ساتھ طبع سلیم، ذہن رسا، حافظہ قوی، یہ سب وجوہ مزید شفقت کا باعث تھی۔ اور سب سے بڑھکر مولانا کی بصیرت اور نورِ فراست جس سے نظر آرہا تھا کہ یہی شخص کمالاتِ قاسمی کا آئینہ ہوگا اور علومِ انبیا کا وارث ✣

اسی طرح رفتہ رفتہ ۱۲۸۹ھ تک حضرت نے تمام صحاحِ ستہ اور دیگر فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرمائی اور اسی زمانہ میں باوقاتِ مختلفہ ادب کی بعض کتب اپنے والد ماجد سے اور حساب وغیرہ دیگر فنون کی کتابیں مدرسہ میں پڑھکر علومِ عقلیہ و نقلیہ میں اعلیٰ استعداد حاصل کر کے فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور بطور معین المدرسین درس دینے لگے ✣

۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسۂ دستاربندی اور اہلِ اسلام کے مجمع عام میں (بہمراہی مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی و مولانا عبد الحق صاحب پوری سلمہٗ وغیرہ) سندِ فراغ اور دستارِ فضیلت اکابر علما اور خیارِ عباد اللہ کے دستِ حق پرست سے عطا ہوئی ✣

تعلیم و تدریس خدمت علم و اشاعت حدیث

حضرت مولانا تحصیلِ علوم سے فراغت پانے سے پہلے ہی ۱۲۸۹ھ میں معین المدرسین کی حیثیت سے مختلف کتب کی تعلیم دے رہے تھے۔ اور فراغِ تحصیل کے بعد تو باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں جبکہ حضرت مولانا کے علاوہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اوّل اور مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم اور مولانا ملا محمود صاحب مدرس سوم کار تعلیم کر رہے تھے روز افزوں ترقی اور کثرتِ کارِ تعلیم کی وجہ سے دار العلوم کے درجۂ عربی میں ایک چہارم مدرس تنخواہ دار کی ضرورت اور وسعت منتظمین دار العلوم نے محسوس کی۔ چند ذی استعداد طلبہ جو اُسی زمانہ میں فارغ التحصیل ہوئے تھے اُن باخلاص منتظمین کے پیشِ نظر تھے پہلے اور بعض طلبہ کو منتخب کرنے کا ارادہ ہوا جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محنت اور شوق کے اعتبار سے مولانا سے بھی فائق نظر آتے تھے۔ لیکن اُس زمانہ کے مقدس مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے

جنکا سینہ نورِ معرفت سے معمور تھا اپنی فراستِ صادقہ سے نظرِ انتخاب حضرت مولانا پر ڈالی - اور مولانا کے والد ماجد سے ذکر کیا ؛

آپ کے والد ماجد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کو چونکہ خدا تعالیٰ نے وسعتِ اموال عطا فرمائی تھی اور طبیعت نہایت شریف و غیور واقع ہوئی تھی - اسلئے یہ گوارا نہوتا تھا کہ اُن کے فرزند مدرسے کچھ معاوضہ لیکر خدمت کریں - لیکن دوسرے بزرگان مدرسہ کو اسی میں بہت سے مصالح پیش نظر تھے اس لئے اِن سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھکر خاموش ہوئے - اور حضرت مولانا ۱۲۹۲ھ میں ماہوار پندرہ روپیہ ماہوار مدرس مقرر ہوئے ؛

مولانا اگرچہ درجہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ " ابتدا میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی میں غنیمت سمجھتا تھا " لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے - اور اب رفتہ رفتہ آپکی علمی استعداد اور خداداد ذہانت ظاہر ہونے لگی اور اوپر کے درجہ کی کتابیں بھی حسب موقعہ آپ کے درس میں آنے لگی - چنانچہ ۱۲۹۳ھ میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ نو کتابوں کے اسباق روزانہ بے تکلف پڑھایا کرتے تھے - اور ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دیگر کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی ؛

حضرت کے باضابطہ تقرر کو ابھی تیسرا ہی سال تھا کہ شوال ۱۲۹۴ھ میں بزرگانِ ہندوستان کے قافلے نے بیت اللہ کا قصد کیا - حضرت مولانا محمد قاسم صاحب - حضرت مولانا رشید احمد صاحب جیسے مقبول حضرات سالارِ قافلہ ہوں تو پھر قافلہ کی کیفیت کا کیا پوچھنا - صدہا دیندار مسلمان مفلس و تونگر ہمراہ ہو گئے - حضرت مولانا محمد مظہر صاحب (جنکے نام پر سہارنپور کا اسلامیہ مدرسہ مظاہر علوم مشہور ہے) اُن کے بھائی مولانا محمد منیر - مولانا محمد حسین صاحب صوفی الہ آبادی اور بہت منتخب بزرگانِ دین شریک قافلہ تھے - اور مدرسۂ دیوبند تو گویا بالکل خالی ہو گیا - اُس کے دونوں سرپرست تو سالارِ قافلہ ہی تھے مہتمم صاحب یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اور مدرس اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی تشریف لیگئے - اور فخر اکابر حضرت مولانا بھی زیارتِ حرمین کے شوق اور خدمتِ اُستاد کی آرزو میں ہمراہ ہوئے اور ہندوستان سے ایسا مقدس مجمع اور مشہور و معروف قافلہ روانہ ہوا کہ اُسکی نظیر نہ گذشتہ زمانہ میں

ملسکتی ہے نہ آئندہ اُمید ہی۔ جس اسٹیشن پر گاڑی پہنچتی شوقِ زیارت میں اہلِ اسلام کا ہجوم نظر آتا جتنی دیر گاڑی ٹھیرتی مصافحہ اور دست بوسی کی عزت حاصل ہوتی رہتی ÷

بمبئی پہنچکر تقریبًا بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہوکر تیرہ ۱۳ روز میں بخیریت جدہ پہنچگیا۔ وہاں سے اونٹ کی سواری پر مکہ معظمہ پہنچکر طواف وزیارت سے مشرف ہوئے۔ اور شیخ العرب والعجم مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے دیدار پُر انوار کی سعادت حاصل فرمائی۔ اور بعد فراغت احکام حج مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ اور خدا تعالیٰ کی عنایت سے بیس روز کا قیام نصیب ہوا ÷

اُستاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی مہاجر مدنی تشریف فرما تھے۔ سب حضرات اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جناب ممدوح بھی کمالِ شفقت اور گوناگون عنایات فرماتے۔ اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق وعنایات حسب درجات ومراتب گفتگو فرماتے۔ مگر ہمارے حضرت کا کمال دیکھئے کہ اُستاذ (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت وسندِ حدیث لینا خلافِ نیازمندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جب حضرت اُستاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے بکمالِ بشاشت ہمارے مولانا کو سندِ حدیث عنایت فرمائی ÷

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استدعاء خفیہ پر شیخ العرب والعجم نے ہمارے حضرت مولانا کو نہ صرف شرفِ بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت واجازتِ بیعت سے بھی ممتاز کیا۔ بعض بزرگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ اخیر زمانہ میں اجازت نامہ تحریر فرماکر ہندوستان روانہ فرمایا تھا۔ لیکن ان امور میں باہم تعارض نہیں۔ جب بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو باشارۂ حضرت شیخ العرب والعجم سب نے ارادۂ واپسی فرمایا اور جدہ پہنچکر کلفت انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک ایسے جہاز میں سوار ہوگئے جسمیں مسافر کثیر اور جگہ نہایت قلیل اور تنگ تھی۔ باوجود باہمی مروت وایثار کے سب کو نہایت دقت اور تکلیف پیش آئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو مقاماتِ مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانہ کعبہ کے ادب واحترام کی وجہ سے دُور تک پاپیادہ چلنے کی تکلیف سے ہدہ[1] پہنچکر بخار ہوگیا۔ اور پھر جہاز کی تنگی

[1] جدہ اور مکہ معظمہ کا درمیانی پڑاؤ ہے بعض اسکو حدہ کہتے ہیں ۱۲ ÷

اور کشمکش سے اسپر اضافہ ہوا یعنی سوار ہونے کے تیسرے روز مولانا ممدوح کو بخار و دورہ صفرا پیش آیا۔ اور رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھا کہ سب مایوس ہوگئے۔ چونکہ جہاز میں وبا تھی۔ دو تین آدمی روزانہ نذر اجل ہوجاتے تھے۔ اسلئے اور زیادہ خطرہ تھا۔ نہ دوا تھی نہ علاج نہ جائے راحت و سکون۔ تاہم حضرت مولانا نے خوب حق خدمت ادا کیا۔ شدت مرض میں تمام تمام رات بیدار رہے۔ عدن پہنچے تو لیموں خریدے۔ کہیں سے کنین کہیں سے گلاب دستیاب کرکے کھلایا پلایا۔ مولانا کو کسی قدر افاقہ ہوا تو قافلہ کی جان میں جان آئی۔ چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا۔ دو ایک روز قیام کرکے حضرت مولانا اپنے اُستاذ اور پیر و مرشد کو اُن کے وطن قصبۂ نانوتہ میں پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آئے ✤

مدرسہ میں حضرت مولانا کی جگہ تقریباً چھ ماہ تک مولانا عبد العلی صاحب نے کام کیا اور واپسی سفر کے بعد حضرت مولانا بدستور سابق درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ اور چونکہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دیوبند ہی قیام فرمالیا۔ اسلئے استفادۂ کمالاتِ اُستاذ کے لئے حضرت مولانا کی دلچسپی مشاغل علمیہ میں اور بھی زیادہ ہوگئی ✤

اس زمانہ میں حضرت مولانا دن رات محنتِ شاقہ میں مصروف رہتے۔ نو نو اور دس دس اسباق مطالعہ اور محنت[۱] سے پڑھاتے۔ اپنی کتاب "ایضاح الادلّہ" تحریر فرماتے۔ اور حضرت اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کو سُنا کر صلۂ خوشنودی و تحسین حاصل فرماتے۔ اور شب کا بہت سا حصّہ علاوہ کتب بینی کے عبادت و ورد و وظائف میں گذارتے ✤

حضرت مولانا ضعیف الجثہ تھے۔ لیکن قوی الہمت ہونیکے علاوہ حق تعالیٰ نے آپکے قویٰ بھی نہایت مضبوط بنائے تھے کہ اسقدر محنت برداشت کرنے کے بعد ہشاش بشاش رہتے اور اُستاد معظم کی خدمت میں بھی قصور نہ ہوتا جو واپسیٔ حج کے بعد اکثر مریض رہتے تھے ✤

حضرت مولانا اپنے اِن مشاغل حسنہ میں جنکو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے نہایت محویت کے

[۱] اسی سال کے اخیر میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تحصیل علم کے لئے دیوبند تشریف لائے اور منجملہ اسباق کے ملا حسن اور مختصر معانی حضرت مولانا کے متعلق ہوئے اور اخیر زمانہ تحصیل تک ہدایہ اخیرین۔ حمد اللہ۔ میر زاہد ملا جلال میر زاہد رسالہ اور چند کتب حدیث حضرت سے پڑھی ۱۲ ✤

سانحہ مشغول تھے کہ ناگاہ ۱۲۹۷ھ میں واقعۂ ہائلہ اور صدمۂ جانفرسا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی وفات کا پیش آیا۔ مولانا ممدوح واپسی سفر حج میں مریض ہوکر صحتیاب ہو گئے تھے لیکن کھانسی کی شکایت رہ گئی تھی اور کبھی کبھی تنفس کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۹۵ھ میں ضیق النفس کے یہ دورے کئی مرتبہ پڑے جن سے جناب ممدوح ضعیف ہو گئے۔ سہارنپور میں آپ کے اُستاد مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) کو اوّل فالج ہوا تھا اور پھر بخار اور ضعف میں مبتلا تھے۔ مولانا اُن کی عیادت کے لئے سہارنپور تشریف لیگئے اور اُن کے ارشاد سے چودہ روز وہاں قیام فرمایا وہیں مولانا کو تنفس کا شدید دورہ واقع ہوا اور ساتھ ہی ذات الجنب بھی۔

دیوبند سے خدام خبر سنکر سراسیمہ و پریشان ہو کر گئے اور مولانا کو ریل میں لے آئے۔ تکلیف زیادہ تھی فصد وغیرہ مختلف علاج ہوئے تو کچھ صحت کی صورت ہو گئی۔ مگر چونکہ ضعف بدرجہ غایت تھا اسلئے پھر حرارت شدید ہو گئی۔ جسمیں کبھی کبھی غفلت ہو جاتی تھی۔ شنبہ کے روز تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی اور گفتگو بالکل موقوف ہو گئی۔ پنجشنبہ (۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) کو دوپہر تک یہی کیفیت رہی۔ بعد نماز ظہر بلا کسی خاص کرب اور بے چینی کے یکایک روح مبارک پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

شہر اور مدرسہ میں عموماً اور حضرت کے خدام و تلامذہ پر خصوصاً ایک قیامت برپا ہو گئی جس کا بیان دُشوار اور باعثِ طول ہے۔ طریق رضا و تسلیم و صبر و شکر اختیار کر کے غسل و کفن میں تعجیل کیگئی۔ حضرت کے جان نثار خادم مسیح دیوبند حکیم مشتاق احمد صاحب رئیس نے شہر سے باہر مگر مدرسہ سے قریب ایک قطعہ اپنی مملوک زمین کا اُسیوقت وقف کیا (جو آجکل مرقد علما و طلبہ و جوارِ صالحین بنا ہوا ہے) اور بعد نمازِ مغرب راضی بقضا ہو کر عظیم الشان اسلامی مجمع نے اُس خزانۂ علوم و کمالات کو سپردِ خاک کیا۔

تیسرے دن بروز شنبہ سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث (قدس سرہٗ) نے بھی وفات پائی اور صرف ایک دن کے فاصلہ سے زمانہ کے دو بہترین محدثوں سے دنیا خالی ہو گئی۔ اور طبقۂ صلحا اور اہلِ علم پر غم پر غم اور صدمہ پر صدمہ پڑا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اِن حضرات کی وفات پر بہت لوگوں نے مرثیے کہے تاریخیں لکھی ایک صاحب نے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا دَائِمًا
۱۲ ۵ ۹۷

مادۂ تاریخ نکالا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے "کیا چراغ گل ہوا" اور "مصیبت پڑ آئی مصیبت" ۱۲۹۷ سے تاریخ نکالی۔ حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب مفتی مدرسہ اور مولانا حبیب الرحمن صاحب ظلہم کے والد ماجد خاقانی ہند مولانا **فضل الرحمن** صاحب قدیم رکن مدرسہ نے ایک لگداز طویل مرثیہ نظم فرمایا جس کے چار شعر یہ ہیں ؎

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا	کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر درونہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا	مثالِ خمِ فلکِ جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں رنگ زرد اس غم سے	لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
سنِ وفات کہے فضل نے ز روی الم	وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ

اور حسان الہند مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اس واقعہ فاجعہ میں بزبان عربی اس طرح اظہار درد کیا ؎

يا قاسم الخير من للعلم والدين	اذا ارتحلت وارشادٍ وتلقينِ
يا قاسم الخير من للطارقين ومن	للضارعين ومكروب ومحزون
يا قاسم الخيرِ اسمع من لكربتنا	يا قاصم الضير قُل من للمساكين
من للمدارس من للوعظ من لهدىً	من للنكات وتوضيحٍ وتبيين
من للشريعة او من للطريقة او	من للحقيقة اذ ارسيت في الطين
رحلت عنا ولم يوجد عديلك في ال	علوم والفضل من عرب الى صين
يا عين جودي بدمع غير منقطع	على الذي جلّ من مدحٍ وتابين
بحر العلوم امام الكون اكرمه	مبارك الاسم والزيتون والتين
لقد مضى صاحبي من في مصيبته	برئتُ من ذكر اسلاءٍ وتسكين
من لي بصدرٍ عن الاحزان منقطع	من لي بقلب بصبرٍ غيرِ مقرون
وهوّن البين اني لاحق بكم	اذا ارتحلتم وان احيى الى حين

سقى الاله ضريحا انت ساكنه
ويرحم الله من يملى دبتامين

مخدوم المستاد کی وفات کے حادثہ نے حضرت مولانا کو بالکل پژمردہ کر دیا تعلیم و تعلم سے دل سرد ہو گیا رنج و غم تو تھا ہی اسکے ساتھ یہ خیال بھی دلنشین ہو گیا تھا جسکو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارے مشاغل علمی اور درس تدریس صرف اسلئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھنے لگیں - اب کہ حضرت ہی رخصت ہو گئے اس قیل وقال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ - فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لینگے"

حضرت مولانا نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی - حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے مگر حق تعالیٰ نے آپکے ذریعہ سے احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادت مقدر فرمائی تھی - حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (قدس سرہٗ) کو خود بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا صدمہ کچھ کم نہ تھا - کیونکہ آپ سے زیادہ مولانا کا قدر شناس کون ہو سکتا ہے - لیکن حوادث و نوازل کے وقت اہل عزم و ثبات خود بھی سنبھلتے ہیں - اور دوسروں کو بھی سنبھالتے ہیں - اور حق تعالیٰ کے علم میں جو امر مقدر ہوتا ہے باوجود ظاہری نامساعدت کے اُسکے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے +

مولانا نے ایک دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ میں لے آئے - زاویہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں جو کچھ فرق ہے وہ حضرت بھی خوب سمجھے ہوئے تھے مگر ایک دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کے فوائد کو ترجیح دیتا تھا - مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد نے الہام ربانی اور لطیفۂ غیبی کا کام دیا - بزرگوں کی عظمت اور اُن کے اوامر کی وقعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجۂ کامل رہی ہے - مولانا ممدوح کے ارشاد کی تعمیل کی اور بچشم گریاں درس جاری فرما دیا +

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی (رحمۃ اللہ علیہ) بھی ترک تدریس میں حضرت مولانا کے ہم خیال اور شریک حال تھے ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے - لیکن اہل دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہو گئے -

حضرت مولانا نے رفتہ رفتہ سرگرمی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں خدمت تعلیم کو انجام دینا شروع کیا

درس تدریس کی مصروفیت کے ساتھ عبادتِ الٰہی کا شغل بھی جاری تھا۔ عشاء کے بعد بہت دیر تک کتب بینی کرنا اور پھر تھوڑی دیر آرام کرکے اپنے مولیٰ کی عبادت اور بطرز مسنون ادائے تہجد میں مشغول ہونا اور بعد تہجد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا اور پھر صلوٰۃ الفجر کے بعد سے تمام دن تعلیم میں مصروف رہنا اُس زمانہ میں آپکا معمول تھا۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں دار العلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوح خود بھی ایک نمونۂ سلف، جامع العلوم، صاحب شریعت و طریقت بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ہم عصر اور جانشین سمجھے جاتے تھے۔ مدرسہ کے سرپرست اگرچہ مولانا رشید احمد صاحب قرار پائے تھے مگر چونکہ آپکا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا اسلئے ہر وقت اور ہر معاملہ میں شریکِ حال نہ رہ سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی ذات بابرکات سے کلّی و جزوی ہر قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہونچتی تھی۔ اور ہر قسم کے فیوض و برکات سے مدرسہ متمتع ہونا رہتا تھا اِدھر یہ کہ تمام علماء عصر مولانا کے والد ماجد مولانا مملوک العلی صاحب کے خوشہ چین اور شاگرد تھے۔ ایسے قوی الاثر جامع الصفات عالم کے سایہ سے محروم ہوجانا دار العلوم کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا لیکن سوائے صبر و تسلیم چارۂ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی۔ جو فنونِ ریاضیہ میں خصوصیت کے ساتھ امام کہلانیکے مستحق تھے بمشاہرہ چالیس روپیہ مدرس اول مقرر ہوئے۔ مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی پینتیس ۳۵ روپیہ مدرس دوم اور حضرت مولانا تیس ۳۰ روپیہ مشاہرہ پر مدرس سوم اور مولانا عبد العلی صاحب مدرس چہارم +

اس تغیر سے تقریبًا دو ہی سال کے بعد دار العلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم ملا محمود صاحب کی وفات ہوگئی اور حضرت مولانا انہیں کے مشاہرہ پر مدرس دوم ہوگئے۔ ترقیٔ مدارج اور اضافہ مشاہرہ سے حضرت مولانا کے کار تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ حضرت بخلوص و للہیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے اور طلبہ نہایت شوق اور گرویدگی کے ساتھ دن رات میں جب موقع ملتا تھا حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحب۔ مدرس اول اپنی ذاتی ضروریات کے خیال اور بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لیگئے۔ تعلیم تو حضرت پہلے ہی سے بڑی جماعتوں کو دے رہے تھے اور جیسا کہ معلوم

ہو چکا ہے۔ اب سے بارہ سال پہلے سنہ ۱۲۹۲ھ و سنہ ۱۲۹۵ھ سے کتب صحاح و بخاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے۔ اب آپ مولانا سید احمد صاحب کے مشاہرہ پر بالاتفاق آراء اکابر و اصاغر مدرس اوّل نامزد ہوئے۔ اُس وقت سے آخر عمر یعنی سنہ ۱۳۳۹ھ تک تینتیس ۳۳ سال حضرت مولانا صدر مدرس رہے اور جو کچھ ترقی آپکی ذات بابرکات سے مدرسہ کو ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے مولانا کو کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی۔ اور جیسا کہ اُن کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دار العلوم کی خدمت کو خدا تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھکر بجا لاتے رہے مشاہرہ قبول فرماتے تھے مگر بضرورت اور بکراہت۔ اگر وہ متاع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھلاتے اور صدہا روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے لیکن آپنے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے اُستاذ (قدس سرہٗ) کے لگائے ہوئے باغ دار العلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی۔ دار العلوم دیوبند کے مخالفوں نے بدنیتی سے موقع بموقع دل میں رنجش ڈالکر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکامیاب رہے پیر جی عبد الرزاق صاحب گنگوہی مہتمم مدارس اسلامیہ دہلی نے محبت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موقع نہ چھوڑا مگر دل میں یہ حسرت ہی لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت دہلی قیام فرما کر فیوض جاری فرمائیں۔ اور بجا طور پر شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کی نیابت کا حق ادا فرمائیں +

سنہ ۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ آپکا مشاہرہ پچاس روپیہ ہو گیا۔ آپنے خاموشی سے قبول فرما لیا۔ دو مرتبہ اُستاد شفیق کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "محمود حسن کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہوگے"۔ دونوں مرتبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا۔ لیکن حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ادب سے مجبور تھے۔ اجازت نہ دی بلکہ ہنسکر فرمایا کہ "نہیں اُن کو کہنے دو ہرگز نہ چھوڑو"۔ مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہو گئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کیساتھ آپ کے پچہتر روپیہ مقرر ہوئے تو آپنے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ لینا بالکل موقوف کر دیا۔ پھر بھی اُسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے +

حضرات منتظمین کی جانفشانی اور تدابیر حسنہ اور مدافعت اعدار کو بھول جانا کفران نعمت ہے اور مناسب

مواقع پر اُسکا مفصل اظہار واجب ولازم - مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کیساتھ ظاہری مستعدی و تندہی و دلسوزی نے بھی مدرسے کے لئے باران رحمت کا کام کیا اور مدرسۂ دیوبند کو ایک عظیم الشان دار العلوم کی حیثیت تک پہونچا دیا - صبح کی نماز ادا فرماکر درس کیلئے آجاتے - کبھی پیشاب یا وضو کیلئے درمیان میں "اُٹھے" تو مضایقہ نہیں ورنہ متصل درس دیتے ہوئے "گیارہ" اور "بارہ" بج جاتے تھے اور ظہر کے بعد پھر یہی شغلہ موجود تھا +

حضرت مولانا تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، منطق، معانی، کی کتب محنت اور شوق سے بے تکلف پڑھاتے تھے اور جیسا کہ پہلے تحریر ہوا ہے ابتدا میں تو بہت ہی زیادہ مشغولیت و مشقت برداشت فرماتے تھے مگر آخر میں بھی سنہ ۱۳۲۰ھ تک پانچ چھ گھنٹہ روزانہ درس دیتے تھے - اس زمانہ کے بعد کچھ بوجہ ضعف و امراض کے اور نیز اسلئے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ مولانا انور شاہ صاحب، مولانا حسین احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب مدرسہ میں موجود تھے - آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹے درس دیتے تھے - اور ترمذی شریف و بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بہ طمانیت تمام کرا دیتے تھے -

حضرت نے سنہ ۱۲۸۹ھ سے بحیثیت معین المدرسین دار العلوم میں کار تعلیم شروع فرما دیا تھا اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ مدرس ہو گئے تھے - اس لحاظ سے حضرت نے چوالیس سال کامل خدمت تعلیم میں بسر فرمائے اور سنہ ۱۲۹۵ھ سے سنہ ۱۳۳۳ھ تک تو اڑتیس ۳۸ سال کامل علی الاتصال حضرت نے علم دین کی اشاعت فرمائی - اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا - نہ اور کوئی ایسا شغل پیش آیا - نہ کوئی ایسا مرض لاحق ہوا جس سے کار تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا - یہ نصف صدی کا زمانہ کچھ کم نہیں ہے ہندوستان میں کیا ان آخری قرنوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علما شمار ہو سکتے ہیں - جنہوں نے اسقدر طویل زمانہ افادۂ تلامذہ اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں گذارا ہو -

حضرت سے چونکہ خدا تعالیٰ کو یہ علمی کام لینا تھا اور فیوض جاری کرانے منظور تھے - اس لئے ظاہری مختصر قد و قامت اور ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قویٰ نہایت مضبوط بنائے تھے - باوجود خدمت تعلیم میں اسقدر محنت کرنیکے اور باوصف شب بیداری اور ذکر اللہ کے نہ ضعف دماغ کی شکایت رہتی تھی نہ ضعف بصر کا خلل - نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقویات کے خواہاں معمولی سادہ غذا استعمال

فرماتے تھے اور وہ بھی نہایت قلیل۔

اس عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپکے علوم وکمال خصوصاً فنِ حدیث کے تبحّر اور مہارت کی دنیا میں شہرت ہوگئی تھی اور جابجا آپکے فیوض پھیل گئے تھے۔ ہر نواح میں آپکے شاگرد یا شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعثِ اشاعت علوم وموجب ہدایتِ خلق اللہ بنگئے۔ دار العلوم دیوبند میں ایک دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی قابلِ اعتماد علمی درسگاہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں آپکے بلا واسطہ یا بواسطہ شاگرد مسندِ درس پر متمکن نہوں کابل، قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، اور یمن تک کے لوگ آپکے فیوض سے مالامال ہوکر گئے۔ مولانا محمد اسحق صاحب امرتسری ایک باخدا عالم نمونۂ اتقیائے سلف اور مصداقِ علی دین العجائز نے مدینہ منورہ جاکر درس جاری فرمایا۔ اونکی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا صدیق احمد صاحب اسی مقدس دار الہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان پر اور مسجدِ نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام) میں اشاعتِ علم کرنے لگے۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی مولانا حسین احمد صاحب کا حلقۂ درس خاص مسجد نبوی میں سید العرب والعجم کے روضۂ منورہ کے سامنے ایسی عظمت وبرکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہگئے۔ اور شرفاءِ مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے لگے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء +

حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھکر درس دیا ہے۔ اخیر میں مرض بواسیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے لحافی دار گدہ بنوا کر رکھدیا تھا۔ اُسپر بضرورت بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی وکراہت محسوس کرکے +

مولانا کا حلقۂ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا دوسرے مدارس کے فراغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مودب طریق سے حاضر خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت ووقار سے درس دیتے۔ اِدھر اُدھر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دوسروں کی تحقیر اپنی تعریف کا نام ونشان نہ تھا۔ ہنسی مذاق اور تفریح طبع کے جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود۔ خطاب بالکل عام ہوتا تھا۔ کسی کی خصوصیت نہ تھی۔ کم سواد طالب علم قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے۔ اور بیموقع سوال

کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے تھے اسطرح کہ حلقۂ درس بالکل مجلس مناظرہ بنجاتی تھی۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کردیتے تھے اور کبھی جامع مانع تقریر شفائے لما فی الصدور کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکۂ تام تھا۔ دو چار دفعہ اسی طرح ٹالتے رہتے بہت ردّ و بدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوتِ استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا۔

بہت سے ذی استعداد ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنیکے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے شکوک و شبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ سنکر سرِ نیاز خم کرکے معترف ہوتے کہ یہ علم کسبی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

حلقۂ درس دیکھکر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ تحدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا قرآن و حدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر۔ اور صحابہ و تابعین، فقہا و مجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں نہ منہ میں کف آتا تھا۔ نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے۔ نہایت سُبک اور سہل الفاظ سے بامحاورہ اُردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا اُمنڈ آرہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان ضعیف الجثہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن ہزار ہا سُننے والے موجود ہیں کہ جب صدر درسگاہِ نودرہ میں تقریر فرماتے تو (باوجود درجۂ قرآن مجید و مکتبِ فارسی کے بچوں کے شور و غل کے) مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابلِ فہم آواز آتی تھی۔

لہجہ میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا۔ چہرہ بنالینا یا آنسو بھر لانا حضرت کا کام نہ تھا لیکن خدائے تعالےٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دلنشین ہو جاتی تھی۔ اور سُننے والا یہی سمجھکر اُٹھتا تھا کہ جو فرما رہے ہیں حق ہے اسلئے بہت سے لوگ جو دور ہی دور سے دشمنوں کے افترا کئے ہوئے عقائد فاسدہ سنکر بدعقیدہ ہو جاتے تھے

اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند آکر تحصیل علم کرنے میں اسی لئے مانع ہوتے تھے کہ یہ بھی اُسی رنگ میں رنگے جائیں گے +

اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق و دقائق نقل فرماتے اور اپنی تحقیقات عجیبہ اور مضامین عالیہ سُناتے مگر مفسرین و محدثین شُرّاح و مصنفین کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کہیں شائبہ تنقیص بھی آنے پاتا مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلثہ (رحمہم اللہ) بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے۔ لیکن جب امام ابو حنیفہ رح کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل۔ شاہد پر شاہد۔ قرینہ پر قرینہ۔ بیان کرتے چلے جاتے تقریر رُکتی ہی نہ تھی۔ اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے۔ دُور دُور کی مختلف المضامین احادیث جنکی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اُترتی جاتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

باایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب و احترام، اور اُنکے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ "مذاہب مجتہدین حق ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ۔ اُن کی تنقیص موجب بدبختی ہے اور سوءِ ادب باعث خسران" +

بیشک حضرت رحمہ اللہ مَنْ عَمِلَ بِمَا یَعْلَمُ وَ اٰتَاہُ اللّٰہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کے مصداق اور اس شعر کے محمل تھے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا   بے کتاب و بے معید و اوستا

اسکے ساتھ ہی آپنے نہایت محنت شاقہ اُٹھاکر اور بقول شخصے "دو چراغ کھا کر" کتب بینی اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا خصوصاً شروح احادیث بکمال غور و فہم مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا عینی اُٹھا لاؤ۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح یا ہدایہ کی۔ فرمایا اُسکو تو کئی مرتبہ دیکھ چکا۔ ہدایہ کی شرح لے آؤ۔

لیکن حضرت صرف شُرّاح کی تعلیم کے احاطہ میں محصور نہ تھے۔ بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں شروح وحواشی کے مطالعہ سے آپکے ذہن مصفیٰ میں آتے تھے جو دیدہ تھے نہ شنیدہ۔ حضرت نے شروح احادیث کا

عطر نکالکر رکھدیا ہے اور ہمارے فقہاء و شراح کے مجمل دلائل کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ باید و شاید - محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کیساتھ خاص تعلق تھا -

امام بخاری کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھولدئے تھے یہانتک کہ نظر بندی مالٹا کی یکسوئی میں آپ نے خود بخود اس داعیۂ الٰہی سے مجبور ہوکر تراجم بخاری کے متعلق تحریرات لکھنی شروع فرمائی تھی بخاری کے متعلق کوئی شخص کچھہ سوال کرتا تو خوش ہوجاتے اور بیان فرمانا شروع کردیتے -

امام مسلم نے جو اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاری پر تعریض کرکے گرفت کی ہے - اُسپر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاری کے خادم و عقیدت مند ہوگئے - کاش اسی طرح امام ابوحنیفہ اور امام بخاری کی ملاقات ہوجاتی تو اپنے سب اعتراض واپس لے لیتے +

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت کو شرح صدر کردیا تھا اُسی کا اثر طلبہ پر پڑتا تھا بمقتضائے آنچہ از دل خیزد در دل ریزد - وہ دقیق فرق اور وہ لطائف دلسوز سناتے کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اُٹھتے - اگر امام صاحب کے مناقب بیان فرمانے لگتے تو ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا بیان فرماتے چلے جاتے تھے سلسلۂ کلام ختم ہی نہوتا تھا - مالٹا سے واپسی کے بعد ایک روز حسب عادت عصر کی نماز پڑھکر بیٹھے مجمع تھا - امام صاحب کا ذکر آگیا پھر کیا تھا لطائف، دقائق، حالات، واقعات بیان ہونے لگے - اور جب تک مغرب کی اذان نہوگئی سلسلہ ختم ہی نہوا +

حضرت مولانا کا طرز تحدیث اور جمع بین اقوال الفقہاء والاحادیث بالکل وہی تھا جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس سرہما) کا تھا - حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اقوال کو نہایت اعتبار و اعتماد کے ساتھ نقل فرماتے اور نہایت ادب سے نام لیتے - آپکی سند حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی پر منتہی ہوتا ہے آپکے کمال تبحر پر نظر فرماکر اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہما نے بقاعدۂ محدثین آپکو اجازت حدیث عطا فرمائی تھی - لیکن درس و تدریس اور قرات و تحدیث کے لحاظ سے آپکی سند حدیث دو طرح حضرت

شاہ ولی اللہ صاحب تک اور اُن کے اساتذۂ کرام کے ذریعہ سے محدثین مؤلفینِ کتب اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہے +

اوّل - عن مولانا الشیخ محمد قاسم - عن مولانا الشیخ عبد الغنی - عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق عن مولانا الشاہ عبد العزیز - عن مولانا الشاہ ولی اللہ - رحمۃ اللہ علیہم اجمعین +

ثانی - عن مولانا الشیخ احمد علی السہارنفوری - عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق - عن مولانا الشاہ عبد العزیز - عن مولانا الشاہ ولی اللہ - قدس اللہ اسرارہم +

حضرت مولانا کے بلاواسطہ فارغ التحصیل و عالم شاگرد چالیس[۴۰] سال میں کم درجہ[۱] اوسط پچیس[۲۵] سالانہ رکھنے کے بعد ایک ہزار ہوتے ہیں - اور معمولی شاگردوں اور بعض کتب پڑھکر چلے جانے والوں اور بالواسطہ شاگردوں کی تو کچھ انتہا ہی نہیں +

دار العلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چونکہ خلوص و تقدس بدرجۂ کمال موجود تھا اسلئے ابتدا ہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا اور اُن کی ظاہری و باطنی توجہ کے آثار و برکات اُس میں جلوہ نما ہو رہی تھے اور اُسی کا نتیجہ اسکو بھی سمجھنا چاہیئے کہ دیگر اکابر کے بعد حضرت مولانا اُسکی صدر مدرسی کے لئے تجویز کئے گئے پھر آپکی علمیت و شہرت و عظمت اور شب و روز کی محنت اور ایثار و خلوص اور باطنی ہمت کی وجہ سے جو شہرت و عظمت دار العلوم کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے - اور گویا آپ ہی کے فیوض نے اِسکو بجا طور پر دار العلوم کا لقب دلوایا ہی - اسلئے منتظمین نے جب بڑے بڑے خطرناک فتنوں میں سے اسکو سلامت بچاکر نکالا اور شدید طوفانوں میں سے اُسے ساحلِ نجات پر لگایا تو مولانا اُن کے پشت پناہ تھے - اور جب اپنی حُسنِ سعی سے اُسکو مدارجِ ترقی پر پہنچایا تو حضرت اُن کے دستِ راست تھے +

حضرت کو دار العلوم سے اسقدر گہرا تعلق رہا ہے کہ شاید ہی کسیکو نصیب ہو - حضرت کے والد ماجد

---

[۱] حضرت نے ۴۴ سال درس دیا مگر ہمنے محض اندازہ کے لئے صرف ۴۰ سال کا اوسط نکالا - ابتدا میں فارغ التحصیل طلبہ بارہ چودہ پندرہ بیس سالانہ ہوتے تھے - اور آخر میں تیس اور پھر پچاس ساٹھ تک نوبت پہونچ گئی تھی کم درجہ اوسط سالانہ پچیس رکھا ہے - اور قیامت تک جو شاگرد ان شاگردوں سے پڑھتے رہیں گے اُن کی تعداد و انتہا تو کچھ معلوم ہی نہیں ۱۲ +

اسکے ابتدائی بانیوں اور اولین سرپرست ممبروں میں تھے۔ حضرت کبھی اُسکے سابقین بہترین طلبہ میں تھے کبھی معین کہلاتے تھے۔ کبھی مدرس سوم وچہارم نظر آتے تھے۔ کبھی مدرس دوم سے صدر مدرسی کی مسند پر ممتاز دکھلائی دیتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی ممبر مشورہ اور کبھی اعلیٰ سرپرست تسلیم کئے جاتے تھے +

ہر حادث کی انتہا ہی اور ہر شی کو فنا۔ افسوس ہی کہ اسکے بعد حضرت کے روحانی سرپرست ہونے کا نمبر آیا اور رخصت ہونے کا زمانہ قریب پہنچا۔ یعنی اسی طرح دار العلوم کی مسلسل خدمت کرتے ہوئے آپنے بخاری شریف اخیر تک پڑھاکر حسب معمول ماہ رجب ۱۳۳۳ھ میں ختم کرائی۔ چونکہ ارادہ سفر باوجود اخفا کے مشہور ہو چکا تھا۔ دعا میں معمول سے زیادہ آدمی شریک ہوئے کہ دیکھئے پھر کبھی حضرت کا حلقۂ درس دیکھنا نصیب ہوتا ہی یا نہیں۔ اور آیندہ اس برکت کے حصول کا موقع ملتا ہی یا نہیں +

اُسوقت حقیقی علم کسکو تھا مگر درحقیقت دعا کے بعد جب حضرت درسگاہ سے اُٹھے تو چوالیس[۴۴] برس کے بعد دار العلوم[سلہ] کی خدمتِ تعلیم و تعلم کو ختم کرکے اُٹھے۔ پھر کبھی نہ درسگاہ نے آپکی تلقین و تعلیم کی آواز سنی اور نہ کبھی درس دینے کے لئے وہاں آپکا قدم آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون +

عزمِ سفر وروانگی بہ قصدِ زیارتِ حرمین شریفین

انسان کا ایمان جسقدر کامل ہوتا ہی اُسی قدر شعائر اللہ اور آثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و تعلق ہوتا ہی جیسا کہ پہلے مفصل گذر چکا ہے۔ حضرت مولانا ۱۲۹۴ھ میں اپنے اُستاذ اور مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی ہمراہ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ مطہرہ سے مشرف ہوئے تھے۔ مگر بوجہ کمالِ ایمان ایک قوی تعلق قلبی ان مقامات سے لگا ہوا تھا جو بار بار محرک ہو جاتا تھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ قصد ہوا اور ۱۳۰۰ھ میں بھی (جبکہ آپکے مرشد زادے مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمن صاحب مدظلہما حج کے لئے تشریف لیگئے تھے) آپنے یہ قصد فرمایا تھا

سلہ دار العلوم کی خدمت کے بعد درگاہ بے نہایت کی عنایت سے حضرت کا قدم ترقی اور بلند ہوا اور چھ ماہ شہر مبارک مدینۃ الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بخاری شریف کا درس دیا۔ اسکے بعد خاص بلد امین اور حرم رب العالمین میں بھی فیض جاری ہوا۔ سبحان من لا انتہا لفضلہ ۱۲

لیکن مصالح مدرسہ کو پیشِ نظر رکھکر حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ نے اجازت نہ دی تو آپ نے قصد ملتوی فرما دیا ٭

ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۳ھ میں پھر مولانا کا قصدِ سفر آہستہ آہستہ مشہور ہوا۔ مگر چونکہ حضرت نے کوئی خاص اطلاع نہیں فرمائی تھی اسلئے مختلف لوگوں نے اپنے قیاس سے مختلف توجیہات شروع کیں۔ چونکہ جنگِ یورپ شروع ہو گئی تھی اور اپنی ہستی کو خطرہ میں دیکھکر ترک بھی جرمنی کے ہمراہ شریکِ جنگ ہو گئے تھے۔ اسلئے بہت لوگوں نے اندازہ لگایا کہ ترکوں کی امداد کے لئے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ غیر اسلامی سلطنت اور خلافِ شرع قوانین سے گھبرا کر قریب ترین اسلامی سلطنت کابل کیطرف قصد فرما رہے ہیں ٭

اور یہ قیاسات و خیالات کچھ آج نئے نہیں تھے۔ ۱۲۹۴ھ میں بھی جب علماء ہندوستان کا مشہور قافلہ جنگِ روم و روس کے زمانہ میں روانہ ہوا تو لوگوں نے خود بخود ایسی ہی توجیہات شروع کر دی تھیں۔ حضرت کے متعلق اس غلط فہمی میں تو ہر شخص مبتلا تھا کہ "حضرت ہجرت کر کے دائمی طور سے ہندوستان سے رخصت ہو رہے ہیں" اور یہی خیال زیادہ قلق اور صدمہ کا باعث تھا۔ کوئی اعلان و اطلاع حضرت کی طرف سے نہ تھی بلکہ دور دراز کے لوگوں کی تکلیفِ سفر وغیرہ کے خیال سے ایک درجہ اخفا کا تھا۔ پھر بھی حضرت کی مقبولیت اور احساسِ کلفتِ مفارقت نے دُور دُور خبر پہنچا دی اور ماہِ رمضان میں کسی قدر کم اور شوال میں ہر چہار طرف سے بہت زیادہ مہمانوں کی آمد رہی اور روانگی کے قریب تو بہت ہی کثرت ہو گئی ٭

حضرت کیلئے میر سامان وہی ذاتِ برحق تھی جو ہمیشہ متوکلین کی متکفل ہوا کرتی ہے اور ظاہری سامان کی درستی میں خدام مصروف تھے۔ حضرت نے اپنے اہل و عیال اور متعلقین و متوسلین کو عامۃً اور فرداً فرداً ضروری اور مناسب نصائح فرمائی۔ اور دارالعلوم کے متعلق ضروری اور خاص معاملات کو حضراتِ منتظمین کے ساتھ ملکر طے فرمایا اور مفید ہدایات فرمائی اور اپنے متعلق اسباق کا خود انتظام فرمایا ٭

اور چونکہ آپکی عدم موجودگی سے نظامِ تعلیم بلکہ دیگر حیثیات پر بھی قوی اثر پڑ جانے کا اندیشہ تھا اسلئے ۲۹ شوال کو خاص روانگی کے دن بعد ظہر اپنی قدیم درسگاہ نودرہ میں دارالعلوم کے تمام منتظمین، مدرسین، ملازمین، و طلبہ کو جمع فرمایا۔ اور مناسب تمہید کے بعد بہت تصریح کے ساتھ

فرمایا کہ " میرا ارادہ صرف زیارتِ حرمین شریفین کا ہے - یہ تبلا دینا تو مشکل ہے کہ کتنی مدت میں واپس ہوں گا - مگر انشاء اللہ ضرور اور حتی الوسع جلد واپس ہونگا " - اور مدرسہ کے قدیم بزرگوں اور مقدس بانیوں کا ذکر کرکے فرمایا کہ " مدرسہ کا کام خدا تعالیٰ کا کام ہے اُسکی امانت سمجھکر ہر شخص کو کوشش کے ساتھ اسکو انجام دینا چاہیئے " - اور ہر صغیر و کبیر کے مناسب نصائح اور وصایا فرما کر دعا پر اس جلسہ کو ختم کیا ۔

حضرت کی اس تقریر سے جیسے دار العلوم کے متعلقین کی ہمت قوی ہوگئی - اسی طرح حضرت کے وعدۂ تشریف آوری سے عام قلوب کی پریشانی اور مایوسی زائل ہوکر واپسی کی اُمید سے طمانیت و مسرت حاصل ہوگئی اور ہر شخص جو اپنی رائے و قیاس سے حضرت کے متعلق احکام تجویز کر رہا تھا اُن کی گنجایش نہ رہی - اور اس تقریر کے بعد دہلی کے اسٹیشن پر عام مجمع میں بھی لوگوں کے دریافت کرنے پر حضرت نے صاف فرمایا کہ " نہیں بھائی ہجرت کا قصد نہیں ہے - البتہ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو کسی قدر قیام کا خیال ہے - جسکی نسبت ابھی کچھ پوری تعیین نہیں ہوسکتی خدا جانے آیندہ کیا پیش آئے " ÷

تشریف لیجانے کے دن صدہا مہمان باہر کے موجود تھے اور تمام شہر میں روانگی کی خبر مشہور ہوچکی تھی - مغرب کے بعد ہی سے آپکے مکان پر لوگوں کا ازدحام ہوگیا - عشا کی نماز کے بعد حضرت مولانا مکان سے رخصت ہوئے اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہم کے مکان پر جاکر اپنی روحانی والدۂ محترمہ یعنی حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار اہلیہ محترمہ سے طالبِ دعا ہوکر آخری[1] رخصت حاصل کی اور اُن کی تاکید پر مکرر وعدۂ واپسی فرمایا - اور پھر دار العلوم میں تشریف لیجاکر وہاں سے عظیم الشان مجمع کی ہمراہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے - گاڑی میں دیر تھی اسٹیشن کی مسجد میں تشریف فرما ہوئے مصافحے اور رخصت شروع ہوئی - یہانتک کہ گیارہ بجے گاڑی آئی حضرت سوار ہوئے - اور اکثر متعلقین دار العلوم اور بعض اہلِ شہر اور حضرت کے عزیز و اقربا دہلی تک ہمراہ روانہ ہوئے - چار بجے گاڑی دہلی پہونچی اور صبح کی نماز باجماعت بہ عظمت و شان پلیٹ فارم پر ادا ہوئی - حضرت مولانا

---

[1] افسوس ہے کہ اِن بزرگ مخدومہ یعنی والدۂ ماجدہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی وفات حضرت مولانا کی تشریف آوری سے اڑھائی سال پہلے ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۶ھ میں ہوگئی - اور حضرت مولانا کو حالتِ اسیری میں اطلاع پہنچکر نہایت غم و الم اور صدمہ ہوا - ۱۲ ÷

بسواری موٹر ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر چند منٹ کے لئے تشریف لیگئے تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو صدہا مشتاق زیارت باشندگان دہلی اسٹیشن پر جمع ہو چکے تھے۔ ہر شخص بہ گریہ وزاری حضرت سے معانقہ و مصافحہ کرکے رخصت ہوتا تھا۔ اور حضرت باوجودیکہ رقت طاری تھی سب کو تسلی دیتے تھے۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد بھی لوگ بار بار دست بوسی کے لئے جد و جہد کرتے رہے آخر سات بجکر بیس منٹ پر گاڑی روانہ ہوئی۔ اور ہندوستان کے افضل المسلمین کو ارض عرب کی طرف لے چلی۔ حضرت گاڑی کے دروازہ پر کھڑے ہوئے اشاروں سے سلام و دعا فرماتے رہے گاڑی نظر سے پوشیدہ ہو جانے کے بعد سب لوگ اس مقدس سایہ کے سر سے جدا ہو جانے پر افسوس و حسرت کرتے ہوئے متفرق ہو گئے +

راستہ میں حضرت نے رتلام میں مولانا محمد عبد الحق صاحب کی فرمائش سے مختصر قیام فرمایا۔ (جو قدیم زمانہ میں عرصہ تک حضرت مولانا کے ہم سبق رہے ہیں اور دار العلوم دیوبند کے تیار کردہ بہترین علما میں ہیں۔ بالفعل دار العلوم کے ممبر ہیں اور ریاست میں معزز عہدہ پر مقرر ہیں) اور پھر سورت میں بعض خدام کی استدعا منظور فرماکر دو تین روز قیام فرمایا۔ پھر وہاں سے بمبئی ایسے مناسب وقت پہنچے کہ جہاز کی روانگی میں دو ہی روز کی دیر تھی +

بمبئی کے قیام میں دوسرے روز جمعہ واقع ہوا تو حضرت مولانا جامع مسجد میں نماز کے لئے تشریف لیگئے۔ کوکنی قوم کے خطیب صاحب جو شافعی المذہب اور نہایت دیندار بزرگ عالم ہیں بعد نماز مصافحہ کیلئے بڑھے اور لوگوں سے کہا کہ ہندوستان کے محدث مولانا محمود حسن صاحب یہی ہیں۔ پھر کیا تھا مصافحہ اور دست بوسی کے ہجوم سے حضرت کو نکلنا دشوار ہو گیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت کی شہرت صرف نظر بندی سے ہوئی ہے وہ اپنی غلطی کا یہاں سے اندازہ کر لیں +

حضرت کے طرز عمل کے متعلق اسوقت تک گورنمنٹ کو کوئی اشتباہ نہ تھا اور آپکا سفر ایک معمولی مذہبی سفر حج سمجھا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے حضرت کی روانگی اور بمبئی پہنچنے کے بعد روانگی جہاز تک کوئی غیر معمولی تفتیش و جستجو نہیں ہوئی اور نہ کسی قسم کے خاص سؤال وجواب کی نوبت آئی +

حضرت مولانا کی معیت کی سعادت حاصل کرنے اور زیارت حرمین سے مشرف ہونیکے خیال سے

مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب دام فضلہم اور مولانا محمد سہول صاحب ساکن بھاگل پور۔ اور مولانا حبیب الرحمن صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب وغیرہ۔ چند حضرات پہلے سے بمبئی پہونچ گئے تھے اور ٹکٹ خرید کر حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ اور مولوی عزیر گل صاحب اور مولوی وحید احمد صاحب (جنکا تذکرہ آپ حضرت کے رُفقاء اسیری میں ملاحظہ کرینگے) اور حاجی خان محمد صاحب جنکا مکہ معظمہ میں انتقال ہوگیا۔ اور حضرت کے خادم و مرید حاجی محبوب خان صاحب اور مولوی سید ہادی حسن صاحب خانجہانپوری دیوبندی سے تمام سفر حج میں ہمراہ تھے +

بمبئی میں پاسپورٹ (پروانۂ راہداری) حاصل کرنے کیوقت حضرت اور آپکے رفقاء سے کچھ زیادہ تحقیقات و سوالات نہیں کئے گئے۔ دیگر حجاج کی طرح معمولی اُمور دریافت کر کے پاسپورٹ دیدیا گیا۔ اور شنبہ کے روز مع اپنے تمام رفقاء کے حضرت جہاز پر سوار ہوگئے۔ ظہر کے بعد جہاز نے لنگر اُٹھایا اور حضرت **شیخ الہند** کو حرمین کی طرف لیچلا۔ اور ہندوستان نے بزبان حال کہا ؎

کردہ عزم سفر فضل خدا یار تو باد ہمت اہل نظر قافلہ سالار تو باد

جہاز میں بفضلہ تعالیٰ اکثر رفقاء اور حضرت تندرست رہے اور اپنے معمولات کے پابند پنجوقتہ نمازیں نہایت اہتمام اور پابندی سے باجماعت ادا ہوتی تھیں۔ نماز اکثر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا محمد سہول صاحب پڑھاتے تھے اور تمام خدام حضرت کے سایۂ شفقت میں بلطف و مسرت سفر کرتے ہوئے ساتویں ہی روز عدن پہونچ گئے۔ حضرت اور آپکے رفقاء نے بہت سے خطوط ہندوستان کو ارسال کئے۔ عدن سے روانہ ہوکر جب میقات اہل ہند یعنی یلملم کے مقابل ہونے کا وقت قریب آیا تو غسل کر کے احرام باندھا۔ حضرت مولانا اور بعض رفقاء نے اعلیٰ اتباع سنت اور عالی ہمتی سے قران کے احرام کی مشقت کا التزام کیا اور باقی حضرات نے سہولت و یُسر پر عمل کر کے تمتع کا احرام باندھا۔ عدن سے پانچویں بلکہ چوتھے ہی روز جدہ پہنچ گئے۔ وہاں پانچ روز قرنطینہ کیلئے ٹھیرنا پڑا اور چھٹے روز مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہونچکر باب العمرہ کے متصل ایک رباط میں مقیم ہوئے اور زیارت و طواف بیت اللہ سے تمنائے دلی پوری فرمائی۔ افسوس ہے کہ اسی قیام میں آپ کے مسکین خادم مولوی حاجی خان محمد صاحب قبض اور نفخ البطن میں مبتلا ہوئے اور شدید تکلیف کے بعد ہفتم ذی الحجہ کو انتقال فرمایا۔ اور جنت المعلےٰ کے خوش نصیب خفتگان لحد میں شامل ہوکر در جوار اعلےٰ

حاصل کئے +

ہشتم ذی الحجہ کو لاشریک لک لبیک کہتے ہوئے منا کی طرف چلے اور باطمینان قلب مناسکِ حج ادا کرنے شروع کئے۔ سب حضرات نے برعایتِ سنن و مستحباتِ حج سے فراغت حاصل کرکے شکرِ خدا ادا کیا +

بعد فراغتِ حج مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب اپنے بعض ترددات یا اختتامِ رخصت کی وجہ سے حضرت سے اجازت لیکر مکہ معظمہ ہی سے ہندوستان واپس آ گئے اور حضرت مولانا و دیگر رفقا ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں مکہ معظمہ سے جدہ ہو کر سلطانی قدیم رستہ کے سوا دوسرے راستہ سے جو بمقابل کچھ سہل سمجھا جاتا ہے راہی مدینہ منورہ ہوئے۔ اور اونٹوں کی سواری پر وہ مبارک منزلیں بصد شوق ذوق طے کرتے ہوئے بارہ روز کے بعد مدینہ طیبہ پہونچے +

مدینہ منورہ میں حضرت کے سب سے فائق جانباز خادم اور بہترین شاگرد مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدرس حرم شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے بڑے بھائی مولانا سید احمد صاحب مہاجر حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور مولانا موصوف کے بھتیجے مولوی وحید احمد صاحب حضرت کے رفقاء میں حاضرِ خدمت تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے تلامذہ اور معززاہلِ مدینہ کے عظیم الشان مجمع کے ساتھ شہر سے بہت دور باہر نکل کر اپنے مایۂ ناز محترم شیخ کا شایانِ شان استقبال کیا۔ اور شیخ کی آنکھیں اپنے اخص التلامذہ کو دیکھکر ٹھنڈی ہوئیں +

مولانا حسین احمد صاحب کا مکان جسکو اُن کے والد ماجد کی جدت پسند طبیعت نے اور مصارفِ کثیر برداشت کرکے شب و روز کے اہتمام سے عرصہ دراز میں نہایت آرام دہ صورت میں تیار کیا تھا خارج باب المجیدی واقع تھا۔ خاص اہتمام سے مہمانوں کیلئے کئی مردانہ مکان زنانہ مکان سے ملحق و متصل بنائے گئے تھے۔ یہ مکان گویا حضرت کا اپنا گھر تھا۔ اسکے سوا دوسری جگہ کیسے ٹھیر سکتے تھے سب نے وہیں قیام فرمایا۔ اور حضرت کو اس بیت المہاجرین میں اپنا مہمان بنانے کی ایک دیرینہ آرزو جو مولانا حسین احمد صاحب کے قلب میں تھی آج پوری ہوئی +

حضرت کو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دارالہجرۃ کی دارالاقامت اور روضۂ اطہر کی زیارت سے روحانی فوائد حاصل ہوئے ایسے ہی اس معزز خاندان کی مخلصانہ خدمت سے جسمانی راحت

وآرام نصیب ہوا +

مولانا محمد سہول صاحب۔ مولانا سید مرتضی حسن صاحب وغیرہم چند روز مدینہ منورہ حاضر رہکر ہندوستان واپس چلے آئے اور حضرت مقیم رہے +

خود حضرت کی خداداد عظمت وشہرت کچھ کم نہ تھی اور حضرت کے متعارف وشناسا بہت لوگ حرمین محترمین کے جوار میں موجود تھے۔ اُسپر مولانا حسین احمد صاحب جیسے مشہور شیخ کے اُستاد ہونیکی حیثیت مُطرّہ ہوگئی اور تمام مدینہ منورہ کے اہل علم وصلاح حضرت کی خدمت میں آکر فیوض وبرکات سے مستفیض ہونے لگے۔ خود مولانا حسین احمد اور اُن کے شاگردوں کے اصرار سے حضرت نے بخاری شریف کا درس دینا قبول فرمایا۔ اور مولانا موصوف کے مکان ہی پر بعد نماز ظہر تا عصر حلقۂ درس قرار پایا۔ مولانا حسین احمد کے فیض یافتہ لوگوں کے سوا مدینہ منورہ کے معزز ومعتبر شائقین علوم برغبت وشوق شریک ہوکر خوشہ چینی کرنے لگے +

ذاتِ اقدس صاحب الوحی والمعجزات کا قرب تھا سینۂ مصفےٰ درجاتِ عروج طے کرکے نور حاصل کررہا تھا اور حضرت پر فیوض نامتناہی کی بارش ہورہی تھی۔ جو درجہ بدرجہ حسب استعداد حاضرین وسامعین تک پہونچتی تھی۔ حضرت بلند آواز سے عربی میں تقریر کرتے اور ایسے اعلیٰ مضامین بیان فرماتے جو دیدنہ شنید۔ مولانا حسین احمد کے شاگرد اور دوسرے اہل علم جب مولانا موصوف کو حضرت کے سامنے ایک معمولی طالب علم کیطرح حلقہ میں مؤدب بیٹھے ہوئے دیکھتے تھے تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بیشک وَفَوقَ کُلِّ ذِی عِلمٍ عَلِیمٌ +

بہت سے اہل علم نے حصولِ شرف وعلوّ اسناد کے خیال سے حدیث شریف کی سند واجازت حاصل کی اور تقریبًا پانچ ماہ تک ایک عجیب پُرلطف علمی مجمع قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہی کہ حق تعالیٰ نے محض تکمیلِ درجات کیلئے حضرت کو یہاں پہونچایا تھا۔ اسلئے زیادہ عرصہ تک یہ روحانی فیوض کی مجلس برقرار نہ رہ سکی یعنی حضرت نے ارادۂ واپسی فرمایا +

حضرت مولانا مدینہ منورہ میں چھ ماہ سے کچھ کم مقیم رہے۔ اگرچہ ایسے کامل الایمان حضرات کو (جو حَتّٰی اَکُونَ اَحَبَّ اِلَیهِ مِن مَّالِهٖ وَوَلَدِهٖ کے مصداق ہیں) قربِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ ہونا کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتا۔ لیکن مکہ معظمہ میں رمضان المبارک گذارنے کی آرزو اور دوبارہ حج کرنیکے

قصد سے بایں خیال کہ شاید پھر راستے بند ہو جائیں ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ میں مکہ معظمہ کیطرف روانہ ہو گئے۔ کیونکہ شریف صاحب کی ترکوں سے مخالفت و عدم اطاعت کی خبریں روزانہ پہنچتی رہتی تھیں اور باہمی جنگ و جدال شروع ہو جانے کا احتمال غالب تھا اور ایک خاص وجہ اسقدر عجلت کی یہ بھی ہوئی کہ بدویوں کی ایک نہایت معتبر و معتمد شیخ اور رئیس القوافل معروف بہ شیخ دفیدع جو شاذونادر ہی کسی خوش نصیب قافلہ کے ہمراہ جاتے تھے مکہ معظمہ کیطرف سفر کرنیوالے تھے جنکی معیت بفضلہ تعالیٰ امن و سلامت کے مرادف تھی۔ اور جنکا رعب راستے کے خطروں سے حفظ و امان کی پوری ضمانت ✤

مولوی عزیر گل صاحب تو ابتدا سے انتہا تک پوری رفاقت کا قصد کر ہی رہے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب خود اور اُن کے بھتیجے مولوی وحید احمد صاحب۔ اور منشی محمد حسین صاحب گنگوہی، راحت رسانی کیلئے مکہ معظمہ تک ساتھ رہنے کے قصد سے بلکہ اگر حضرت پھر واپسی مدینہ منورہ کا قصد فرما دیں تو پھر لانے کے لئے ہمراہ ہوئے ✤

حضرت مولانا ایک مختصر قافلہ میں جسمیں شیخ دفیدع کی سواری کے اونٹ کے علاوہ صرف سات ہی اونٹ تھے۔ اپنے جان نثار خدام کی رفاقت اور شیخ دفیدع کی معیت سے براحت و حفاظت تمام سفر کرتے ہوئے یکم رجب ۱۳۳۴ھ کو مکہ معظمہ پہونچگئے اور محلہ شُبیکہ میں حاجی عبداللہ حلوانی ہندوستانی کے مکان میں مقیم ہوئے ✤

مکہ معظمہ میں چونکہ گرمی نہایت شدید تھی اور ایام حج میں تقریباً پانچ ماہ کی دیر تھی۔ اسلئے حضرت معہ رفقاء اس قصد سے بمقام طائف تشریف لیگئے کہ چند روز وہاں قیام کر کے رمضان المبارک سے پہلے حرم محترم میں واپس آ جائیں گے ✤

یہ حضرات ماہ رجب میں طائف پہونچے اور شہر سے متصل محلہ سُلامی کے ایک سرسبز و شاداب باغیچہ اور چمنستان میں جسکو تبیلہ کہتے تھے فروکش ہوئے۔ چند ہی روز گذارنے پائے تھے کہ مختلف افواہیں اور خبریں جو مشہور ہو رہی تھیں اُن کا ظہور ہو گیا۔ اور شریف صاحب نے شرافت کو بالائے طاق رکھکر پانچسو برس کے خادم حرمین شریفین ترکی سلطنت کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کیا اور ماہ شعبان ۱۳۳۴ھ جبکہ گرمی کی شدت نے مکہ معظمہ کے ترکی افسر اور حکام کو طائف کی ٹھنڈی ہوائیں خواب غفلت میں

محو کر رکھا تھا، حرم محترم سے آگے بڑھکر حملہ کر دیا +

یہاں ترکی فوج کے سوار و پیادے مسلّح اور غیر مسلح صرف آٹھ سو آدمی موجود تھے اور وہ بھی پہلے سے خبردار تھے نہ جنگ کے لئے مستعد و تیار۔ مقابلہ پر عربی فوج کے بدّو قطار در قطار اور اُنکی اعانت کو شریف صاحب کے معاونین کی باقاعدہ مصری فوج بیشمار۔ غرض مجموعی طور پر پندرہ ہزار مسلّح مقابل تھے ترک تاب مقاومت نہ لاکر محصور ہو گئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ ہجری میں اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے بت پرست کفّار کو طائف میں محصور کیا تھا۔ آج تیرہ سو چھتیس سال کے بعد اہلبیت ہی کے ایک سعادتمند فرزند (شریف صاحب کے بیٹے عبداللہ گورنر افواج نے) جمعیۃ اسلامیہ کو پراگندہ کرکے اعدائے دین کو خوش کرنے کیلئے فرزندانِ توحید اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہنے والے اپنے مسلمان بھائیوں پر نہایت شدید محاصرہ کیا اور ہر طرف سے اعانت کے دروازے اور رسد کے راستے مسدود کر دئے۔ آب و دانہ بند ہو گیا۔ ضعیف مسلمان اور عاجز فوج بیقرار ہو گئی +

ہمارے بزرگونکی جماعت پر بھی ہر قسم کی تکالیف آئیں اور شدّت و سختیاں اُٹھائیں اور اسی قید محاصرہ اور عسرت میں رمضان کا مبارک مہینا باعثِ فرحت ہوا ؎

تیس دن خوب رہا فاقہ کشی کا پردہ — آگئی عید جو روزے رمضاں کے آئے

اگرچہ انتہائی جوع و عطش کی تکالیف نے بے انتہا لذائذِ روحانی اور نورانیتِ معنوی کا اضافہ کیا لیکن حرم کعبہ میں رمضان المبارک کی بہار لوٹنے کی آرزو اور تازہ آبِ زمزم سے روزہ افطار کرنے کی تمنا اور خانۂ کعبہ کے سامنے تراویح پڑھنے کا ارمان سب دل کے دل میں رہگئے ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ روزے رکھے۔ نمازیں پڑھیں۔ شب بیداری کی۔ بہرحال ماہِ صیام قیدِ محاصرہ میں ختم ہو گیا۔ بقول مولانا حسرت ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت — گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

طائف اپنی سرسبزی و شادابی میں مشہور ہے مگر نہایت مختصر مقام ہے اور اسکی پیداوار صرف چند قسم کے فواکہات او سبزی اور بعض پھلوں میں منحصر ہے اور یہ چیزیں بھی آبادی سے باہر علحدہ قطعات میں پیدا ہوتی ہیں جو محاصرین کے قبضہ میں آگئے تھے۔ اہلِ شہر اور فوج کے پاس غلّہ کا ایک[۱] دانہ نہ رہا کھانے کے قابل کوئی چیز نہ رہی لوگ چیخ اُٹھے۔ ہر طرف سے راہِ فرار بند تھی۔ بہت سے آدمیوں نے

(۱) آفرین ہے ترکوں پر کہ فاقہ پر فاقہ کرکے چھ ماہ تک باغی فوج کا مقابلہ کیا اور جب تک ہاتھوں میں دم رہا دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے

فاقہ کی شدت سے عاجز آکر بھاگنا چاہا بہت کم کامیاب ہوئے اور اکثروں نے جانبین کی افواج کے
مقابلہ ومقاتلہ کی زد میں آکر جانِ شیریں ہاتھ سے دی +

حضرت اور آپکے ہمراہ رفقا نے بھی نہایت صبر سے کام لیا اور دو ماہ سے زائد بہت تکالیف برداشت
کیں لیکن آخر انسان تھے - طاقت ختم ہو گئی - سعی نکرنا اور بے دست و پا بنکر جان دینا بھی خلاف مرضی
مولا تھا - نکلنے کی کوشش شروع کی +

اکثر لوگ اس طائفہ صالحین سے واقف اور ان کے قدرشناس تھے - محصورین کو نے اجازت دیدی
اگرچہ خطرۂ جان سے مطلع کرکے ڈرایا - کیونکہ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے
بعد گولوں کے ٹکڑے ٹوٹکر چار طرف بکھر جاتے تھے - لیکن بحالتِ قیام بھی صورتِ موت نظر آرہی تھی
تن بہ تقدیر ۱۳ شوال کو نکل کھڑے ہوئے - ایک مخلص دوست نے اپنی سواری کا گدھا پیش کردیا اور یہ سب
خدام اپنے آقا کو سوار کرکے طائف سے نکلے - حافظِ حقیقی کی حفاظت میں گولیوں سے بچتے ہوئے عربی فوج
تک پہونچ گئے - عثمان آفندی ایک افسر مولانا حسین احمد کے قدردان تھے - توقیر و تعظیم[1] سے ٹھیرایا -
شریف صاحب کے فرزند بھی مولانا موصوف کی شرافت و عظمت سے واقف تھے سب جماعت کی نہایت
مدارات کی حضرت سے بہ غایت تعظیم پیش آئے اور بسلامت و عافیت مکہ معظمہ کیطرف روانہ کردیا اور یہ
اہلِ خیر اس شدید محاصرہ اور مہلکہ سے نجات پاکر خدا تعالےٰ کا شکر کرتے ہوئے غلافِ کعبہ
کے سایہ میں پہونچ گئے +

گرفتاری سے پہلے بعض واقعات اور سلسلۂ تفتیش و تحقیقات

یہاں ایک درمیانی واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ (جیسا ابھی مفصل معلوم ہوا ہے) جب حضرت مولانا
ماہ رجب میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آئے اُسوقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدرس اوّل

---

[1] شاید کسی خشک مزاج کو شبہ ہو کہ باغی لوگوں کی مدارات ان حضرات نے کیسے قبول کی دشمن سے بچکر نکلنے کے
لیئے ہر قسم کی تدبیر جائز ہے - یہ تو باغی تھے کافرِ محارب سے آشتی کرکے جان بچا لینے میں مضائقہ نہیں ۱۲ +

مدرسہ اسلامیہ سہارنپور نے بھی (جو حضرت شیخ الہند سے چند روز قبل ہندوستان سے تشریف لیگئے تھے۔ اور گذشتہ حج اور مدینہ منورہ کے قیام میں حضرت ممدوح کے ساتھ شریک تھے) مدینہ منورہ سے واپس آکر مکہ معظمہ میں قیام کیا۔ حضرت مولانا چند روز قیام کے ارادہ سے طائف تشریف لیگئے اور حصار کیوجہ سے رمضان المبارک میں باوجود صد حسرت و آرزو مکہ معظمہ واپس آنیسے مجبور رہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب چونکہ اس سے قبل متعدد حج ادا فرما چکے تھے اور اسوقت جنگ و جدال اور بدامنی کیوجہ سے مکہ معظمہ کی حالت نہایت مخدوش ہو رہی تھی آپ کے مخلص احباب مقیمان مکہ معظمہ نے اصرار و تقاضا کے ساتھ واپسی ہندوستان کا مشورہ دیا اور حضرت مولانا نے بھی ان امور کو طمانیت اوقات میں مخل سمجھا اور دوسرے حج سے پہلے ہی ماہ شوال مجبوراً واپسی ہندوستان کو گوارا کیا اور بانتظار جہاز ایک ماہ تک جدہ میں مقیم رہکر مع متعلقین و ہمراہیان ذی قعدہ میں بمبئی پہنچگئے۔

اہل ہندوستان کو مکہ معظمہ کے پورے حالات اور حضرت مولانا کی مشکلات کا علم نہ تھا اسقدر قریب زمانہ حج میں واپسی سے نہایت تعجب ہوا۔ تاہم معتقد و متوسل لوگ بمبئی اور دہلی استقبال کیلئے حاضر ہوئے اور یہ سنکر پریشان ہو گئے کہ مولانا صاحب گورنمنٹ کی جانب سے بمبئی میں روک لئے گئے اور دو تین روز میں معمولی اظہارات و بیانات لیکر سرکاری نگرانی میں نینی تال پہنچا دئے گئے جہاں بعزت و احترام ٹھہرانے کے ساتھ ہی نظر بندی کے باضابطہ احکام بھی جاری ہو گئے جو بلا قصور ایسی ذی وجاہت علماء حقانی کیلئے باعث صدمہ و کلفت اور عام اہل اسلام کے لئے نہایت دلخراش ہیں

ضلع مظفر نگر کے ایک معزز سید مولوی ہادی حسن صاحب جنکا نام آپنے حضرت کے ابتدائی ساتھیوں میں پڑھا ہی اتفاق سے واپسی ہندوستان کیوقت جہاز میں حضرت مولانا سہارنپوری کی ہمراہ ہو گئے تھے بمبئی سے مولانا کے ساتھ یہ بھی نینی تال روانہ کئے گئے ❊

ان حضرات کا قیام نینی تال میں طویل ہوا اور مولانا صاحب سے کئی مرتبہ اظہارات و بیانات لئے گئے جنمیں اکثر حصہ خود مولانا کے سفر کے حالات و واقعات کا ہوتا تھا (معلوم ہوا ہی کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کے اظہارات و بیانات کا مجموعہ مالٹا میں حضرت شیخ الہند کے پیش نظر کر دیا گیا تھا اور محکمہ تفتیش نے جبکا اعلیٰ کمال تزویر و افترا ہے ہندوستان میں جن لوگوں کے اظہار لئے گئے تھے ان میں سے بعض کے فرضی اور مصنوعی اقوال مؤید اثبات جرم پیش کر کے حضرت مولانا سے ناکردہ جرموں کا اقرار کرانا اور دوستوں سے بدظن کرنا چاہا تھا لیکن حضرت مولانا نے اس مجموعہ محرفہ پر کبھی اعتبار نفرمایا اور ہمیشہ "ولیکن قلم در کف دشمن است" کا مصداق سمجھا اور اپنی فراست صادقہ سے دوست و دشمن میں تمیز کر کے جب موقعہ ہوا یہی فرمایا کہ "مجھکو بہ نسبت تمہارے اپنے دوستوں پر زیادہ اعتماد

ہے) قیام کو جسقدر طول ہوتا جاتا تھا ہندوستان کے دیندار طبقے میں تشویش بڑھتی تھی۔ اہلِ اسلام عموماً اور مولانا صاحب مدظلہم کے خدام و مخلصین خصوصاً مضطرب تھے لیکن کسی آئینی یا غیر آئینی طریقہ سے ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اور رنج و غم سے بھرے ہوئے صبر کیساتھ بیٹھے تھے +

ہندوستان میں حضرت مولانا کا علم و فضل و تقدس مسلّم ہے اور اعلیٰ طبقہ کے علما میں آپکا بڑا درجہ سمجھا جاتا ہے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ ارشد ہونیکے علاوہ مولانا صاحب سے دار العلوم دیوبند کو اور بھی بہت سے قابلِ احترام تعلقات ہیں (جنکی تفصیل طویل ہے) لہذا دار العلوم کے اکثر خدام و متعلقین و طلبہ مولانا کی گرفتاری پر عام اہلِ اسلام سے زیادہ مضطرب ہو کر دعاؤں میں مشغول تھے +

مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم مدظلہم مولانا کی رہائی کیلئے چند معزز علما کو بصورتِ وفد لیکر تکلیفِ سفر برداشت کرتے ہوئے نینی تال پہنچکر لفٹنٹ گورنر صاحب کیخدمت میں باریاب ہوئے اور حضرت مولانا (جنکو یقین کیساتھ معلوم ہوچکا تھا کہ میری آزادی تعین ہوچکی ہے مگر گورنمنٹ اپنی عادت کے موافق فضول تاخیر کر رہی ہے) اس وفد کے پہنچنے کے دوسرے ہی روز بعزت و احترام بالکل آزادی کیساتھ نینی تال سے رخصت کر دیئے گئے۔ اور سب ارکینِ وفد مولانا کیساتھ ہی ساتھ واپس آئے۔ دیوبند میں اسٹیشن پر علما و طلبہ نے شاندار استقبال کیا اور عظیم الشان مجمع کے ساتھ دار العلوم میں تشریف لائے۔ دُعا فرمائی اور دوسری گاڑی سے سہارنپور تشریف لیگئے +

مولانا ممدوح کی بلاشرط رہائی پر اہلِ اسلام کو عموماً اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین علمائے دیوبند وغیرہ کو خصوصاً نہایت مسرت ہوئی +

حضرت مولانا کے بعد محکمہ تفتیش نے دوسرے حضرات کی طرف توجہ کی اور چونکہ معمولی اور اصلی واقعات سے اثباتِ جرم مشکل تھا اسلئے اپنی تدابیر سے کچھ ایسا تار و پود دیکھا یا کہ گورنمنٹ کو حضرت مولانا کے نظربند کرنے کا قیامت تک فراموش ہونے والا الزام اپنے سر لینا پڑا گو انجام کار یہ سب کارروائی بے بنیاد ثابت ہو کر ہباءً منثوراً ہوگئی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے حضرت مولانا کو آپکی بے قصوری نے خلعتِ آزادی پہنا دیا +

بہرحال تحقیقات کا سلسلہ نہایت اہتمام سے شروع ہوا نینی تال میں سید ہادی حسن صاحب سے تشدد کیساتھ بیان لیئے گئے اور عرصہ تک نظربند و پریشان رہکر مولانا سہارنپوری مدظلہم کی واپسی کے بعد کہیں شورش نجات پاکر تکلیف اُٹھاتے ہوئے واپس ہونے کے بعد بھی بعض شبہات پر اُن کے مکان کی تلاشی لیگئی۔ مولوی مطلوب الرحمن صاحب (جو حضرت کے ہمراہ جاکر صرف حج بیت اللہ کرکے واپس آگئے تھے) اپنی ملازمت لکھنؤ سے نینی تال طلب کئے گئے

اور اظہارات و سوالات کے بعد جلد ہی رخصت کر دیے گئے +

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے داماد مولوی محمد حنیف صاحب اور خادمِ خاص مولوی محمد جلیل صاحب علیحدہ علیحدہ الٰہ آباد وغیرہ بلائے گئے اور طرح طرح کے سوالات کے جواب اور اظہار لئے گئے اور سوالات کے جواب میں آزمائے گئے۔ دیوبند میں حضرت مولانا کی اہلیہ صاحبہ محترمہ اور برادر صاحبان اور دار العلوم دیوبند کے بعض متعلقین اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہم سے افسرانِ تحقیق نے خود آکر بہت سے سوال و جواب کئے۔ حکیم عبد الرزاق صاحب دہلوی مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب۔ مولانا محمد سہول صاحب اور بہت سے لوگوں کے اظہار مختلف مقامات پر ہوئے +

عجب تشویش کا زمانہ تھا۔ حضرت مولانا کے متعلقین و متوسلین خائف و ہراساں رہتے تھے کیونکہ محکمۂ تفتیش کا تشدد جوش پر تھا۔ اور ذرا ذرا سے تعلقات پر اظہارات و نظر بندی کی نوبت آتی تھی۔ مولوی حمد اللہ صاحب پانی پتی (جو ہندوستان میں حضرت کے ترجمۂ قرآن مجید کے کاتب تھے) گرفتار ہوئے بیانات لئے گئے تکلیفیں اٹھائیں۔ اور عرصۂ دراز تک نظر بند رہکر حضرت کی تشریف آوری سے کچھ پہلے رہا ہوئے۔ کئی جگہ خانہ تلاشیاں بھی ہوئیں۔ مگر کسی جگہ بھی کوئی ذرا سی بھی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی +

حضرت مولانا کے عزیز بھانجے مولوی مسعود احمد صاحب جنکا دوسرے حج کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے حج ادا کرنے کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب سے چالیس روز پیچھے ہندوستان پہونچے تو انکو بمبئی میں روک کر شباشب الٰہ آباد پہونچایا گیا۔ اور عرصۂ دراز تک زیر حراست رکھکر اور بار بار مفصل و مشرح بیانات لیکر ایذا رسانی اور تشدد کے بعد رہا کئے گئے +

ہندوستان میں ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ سے لیکر ایک سال بلکہ کچھ زائد تک یہ سلسلے جاری رہے (ان کی تفصیل سے نہ کچھ فائدہ ہے نہ دلچسپی اسلئے اختصار و اجمال پر اکتفا کیا گیا) اب انہیں ایام میں حرم محترم میں حضرت مولانا کو جو حالات پیش آئے اُن کو ملاحظہ کیجئے۔ اور ان تحقیقات کے نتائج میں گرفتاری اور نظر بندی کے قیامت تک فراموش نہ ہونے والے واقعات و تکالیف کی تفصیل سُنیئے +

حرم محترم سے گرفتاری اور نظر بندی اور قاہرہ کی قید تنہائی

مکہ معظمہ پہونچکر حضرت مولانا کو معلوم ہوا کہ مولانا سہارنپوری بانتظارِ جہاز جدّہ میں مقیم ہیں طبعی مروّت اور دینی محبت سے بعض خدام کو ہمراہ لیکر ملاقات کے لئے جدّہ تشریف لیگئے اور جب تک مولانا ممدوح اور اُن کے ہمراہی جہاز پر سوار ہو کر بطرفِ ہندوستان روانہ ہو گئے بکمالِ اخلاق تکلیف برداشت کر کے جدہ ہی میں مقیم رہے ÷

مکہ معظمہ واپس آکر خاموشی سے اپنی جماعت کے ہمراہ دینی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ مغرب کے بعد حرم شریف میں حضرت کے خدام و متعارف حضرات آکر خدمت میں بیٹھتے علمی بحثیں اور دینی باتیں ہوتی رہتیں۔ دن کو حضرت اپنے مکانِ اقامت میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے یہاں چونکہ بعض لوگ ہندی تھے اور اکثر حاضرین اردو سمجھنے والے تھے اسلئے اردو میں تقریر فرماتے تھے ÷ مکہ معظمہ میں بھی اگرچہ گرانی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی اور ضروریاتِ زندگی میسر نہ ہونیسے ساکنانِ حرمِ خداوندی نہایت تکالیف برداشت کر رہے تھے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا گو نہایت گراں قیمت دینی پڑتی تھی۔ گرانی کی تکالیف برداشت کر کے حرمِ کعبہ کے فیوض حاصل کرتے ہوئے ایامِ حج قریب آجانے پر ان حضرات نے ادائے حج کا تہیّا فرمایا۔ انہیں ایام میں حضرت کے داماد اور بھانجے قاضی مسعود احمد صاحب ہندوستان سے پہونچگئے جنکو حضرت کی اہلیہ صاحبہ محترمہ نے حضرت کے مصارف کی اعانت کے لئے کسی قدر روپیہ دیکر بھیجا تھا ÷

سب حضرات نے باقاعدہ احرام باندھکر مناسکِ حج ادا[1] فرمانے شروع کئے۔ اور بعافیت تمام ضروریات و مستحبات سے فراغت پائی۔ شریف صاحب اور ترکوں کی جنگ کی وجہ سے مدینہ منورہ کا راستہ نہایت خطرناک بلکہ ناقابلِ گذر ہو رہا تھا۔ قافلوں کی آمد و رفت کی کوئی اُمید تھی اسلئے مولوی مسعود احمد صاحب بعد ادائے حج و عمرہ اخیر ماہ ذی الحجہ ہندوستان واپس ہو گئے اور حضرت مولانا اور باقی رفقا مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے ÷

---

[1] اس سفر میں حضرت کا یہ دوسرا حج ہے ۱۳۳۳ھ میں پہلا حج ادا فرماکر مدینہ منورہ جاکر چھ ماہ قیام فرماکر رجب میں مکہ معظمہ پہونچے اور ۱۳۳۴ھ میں یہ دوسرا حج ادا کر کے مکہ معظمہ میں مقیم رہے اور صفر ۱۳۳۵ھ میں گرفتاری کا واقعہ پیش آیا۔ ۱۲ ÷

ہندوستان میں شریف کی بغاوت کی خبریں پہونچکر اُنکی طرف سے عام بدظنی پھیل رہی تھی اور اخبارات میں اسپر بڑی بحث ہورہی تھی۔ علمائے حقانی کے فتوے شریف صاحب کے فعل کو قابلِ ملامت قرار دیتے تھے۔ اور بعض لوگ گورنمنٹ برطانیہ کی ناراضی کے اندیشہ سے خاموشی، حق پوشی یا مصلحت اندیشی کو ترجیح دے رہے تھے۔ بزعمِ خود اِس شورش کو دبانے کے لئے اور حرم شریف اور اہلِ عرب کے چند خوف زدہ یا مصلحت اندیش علما کے فتوے سے اہلِ ہند کو مرعوب کرنے کے لئے (کسی کی تحریک سے) حیدرآباد دکن کے رہنے والے ایک شخص خان بہادر مبارک علی خاں مکہ معظمہ پہونچے۔ اور شریف صاحب اور اُن کے ماتحتوں کی اعانت حاصل کرکے ایک استفتا اور اُسکا جواب تیار کرا کر بعض مبالغہ آمیز واقعات کی بناپر ترکوں کو ملحد اور کافر ثابت کرکے شریف صاحب کی سرکشی اور خودسری اور عدم اطاعت کو حق بجانب ثابت کیا۔

مکہ معظمہ کے چند علمانے جب اپنی غلط فہمی یا شریف صاحب کے خوف سے اُسپر دستخط کردئے تو وہی استفتا حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مولانا کو الزامی جواب اُنکا گویا الہام ہوا کرتا تھا۔ بہت سادگی سے فرمایا کہ "اُسکے عنوان اور پیشانی پر جب تم خود یہ لکھتے ہو کہ "من علماء الحجاز وفضلاء مکۃ والمدرسین بالحرم الشریف" (یعنی علمائے حجاز اور فضلائے مکہ اور حرم شریف کے مدرسوں کا فتوی) تو مجھ غریب ہندی مسافر کے دستخط کیسے مناسب ہیں؟ اسکے علاوہ جن افعال واقوال سے ترکوں کو کافر ومرتد ٹھیرایا ہے اور اُنکا ارتداد وزندقہ ثابت کیا ہے ان کے صحیح اور واقعی ہونے کا مجھے علم نہیں۔ پھر میں اُسکی کیسے تصدیق کرسکتا ہوں"+

خان بہادر بھی بہت رنجیدہ ہوئے اور سید احمد صاحب دوکاندار مکہ اور قاری عبدالحق صاحب ہندوستانی جو اُن کو لیکر حضرت کی خدمت میں آئے تھے بہت ہی برافروختہ ہوئے۔ حضرت کے مسکت جواب اور صاف انکار سے خاموش ہوگئے۔ اور دلمیں غیظ وغضب چھپائے رہے۔

مکہ معظمہ میں جو چند غریب ہندوستانی دیندار علما مقیم ہیں وہ پہلے سے نہایت خوف زدہ اور متردد ہورہے تھے کہ دیکھئے کیا پیش آوے۔ فتوی ضرور ہمارے پاس آئے گا۔ اگر تصدیق کرتے

ہیں تو دین و دیانت کی خیر نہیں۔ اور اگر انکار کرتے ہیں تو حرم محترم کی اقامت و مجاورت ہاتھ سے جاتی ہے اور جان کا خطرہ ہے۔ حضرت مولانا کا وجود اُن کیلئے رحمت ہوگیا۔ ادھر تو انکار کیلئے ایک معقول عذر ہاتھ آگیا۔ دوسرے حضرت کے ثبات و استقلال سے اُن میں بھی قوت ایمانی کو جوش ہوا۔ اور انکار کی ہمت بندھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت کے انکار کے بعد یہ فتویٰ پیش کرنے والے کچھ ایسے ہمت شکستہ ہوگئے کہ اَور کسی عالم کے سامنے پیش ہی کیا بہت سے دیندار بزرگ عالم حضرت کی برکت سے خلجان سے بچ گئے۔

مبارک علیخاں اور اُنکے حواریوں نے شریف صاحب سے عرض کیا کہ جب تک اس شخص کے دستخط و تصدیق نہ ہو ہندوستان میں ہمارا فتوے بالکل کالعدم اور بے سُود ہے۔ اسنے تو گویا ہماری تمام محنت برباد کردی۔ شریف صاحب نہایت غضبناک ہوئے لیکن کوئی تدبیر اختیار میں نہ تھی گورنمنٹ برطانیہ کا رُعب قلب میں اس درجہ تھا کہ حضرت اور آپکے رُفقا کو برطانی رعایا ہونے کی وجہ سے کسی زجر و توبیخ اور ایذا رسانی کا قصد کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

خان بہادر صاحب تو اپنا استفتا واپس لیکر ہندوستان واپس آ گئے۔ اور غالبًا ناکافی اور بے سود سمجھا جانے کی وجہ سے ہندوستان میں اسکی اشاعت ملتوی رہی۔ مگر شریف صاحب کی نظر میں یہ طائفۂ اہل حق خار نظر آتا تھا اور اپنی ناکامیابی کی وجہ سے بیٹھے دانت پیس رہے تھے کہ سوء اتفاق سے اُنہیں ایام میں اِن حضرات کی طرف سے بدظنی پیدا کرنے والا ایک اَور واقعہ پیش آیا۔

مولانا حسین احمد صاحب مکہ معظمہ کے مشہور و معزز ہندوستانی تاجر حاجی عبد الجبار صاحب کی دوکان پر تشریف رکھتے تھے۔ واللہ اعلم اتفاقیہ یا اپنی خفیہ مصالح سے اُسیوقت سید احمد دو کاندار صاحب (جنکی دوکان پر جلد سازی کا کام ہوتا تھا اور خفیہ خبر رسانی کی وجہ سے شریف صاحب کے دربار تک رسائی ہوگئی تھی اور فتوے پر دستخط نکرنیکے جرم میں حضرت اور اُنکے رفقا سے کینہ رکھتے تھے) تاجر صاحب کی فرمایشی جلد تیار کرا کر دینے کے لئے آئے۔ تاجر صاحب نے جلد کو پسند کیا لیکن انگریزی طرز کی جلد ہونے سے کچھ خوش نہ ہوئے۔ سید احمد دوکاندار نے کہا کہ چونکہ دونوں طرز مروج ہیں اسلئے اتفاقیہ ایسی تیار ہوگئی۔ مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ دیکھئے کسقدر

انگریزیت پھیلتی جاتی ہے۔ پہلے تو یہ حالت نہ تھی"۔ سید احمد صاحب تو پہلے ہی سے جوشِ
عداوت سے بے قابو ہو رہے تھے۔ دیوانہ را ہُوئے بس است۔ اب کہاں تاب تھی رنجشِ دلی
کیلئے ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور اس واقعہ کو خوب رنگین کر کے شریف صاحب تک پہنچایا کہ ہندی
عالم کے رُفقا میں سے مولوی حسین احمد لوگوں میں عربی حکومت کی طرف سے خیالاتِ فاسدہ
اور نفرت کی اشاعت کرتے ہیں اور بد امنی پھیلانے کے لئے اس قسم کے الفاظ کہتے ہیں کہ اب تو
خانۂ خدا بھی انگریزیت کے اثر سے محفوظ نہیں رہا۔ مکہ معظمہ میں ہر طرف انگریزی ہی انگریزی
پھیل گئی"+

خان بہادر کے استعفا کا مشہور اور حسرت رساں واقعہ دیکھکر اور طالب دنیا مفتری لوگوں کی
تراشی ہوئی تہمتیں سُن سُن کر شریف صاحب ان حضرات سے بد دل ہو ہی رہے تھے اس واقعہ
نے رنجش اور کینہ میں اور اضافہ کر دیا۔ انتقام کی تدبیریں بے صبری کے ساتھ سوچ رہی تھے کہ
غیب سے ایک سامان پیدا ہو گیا یعنی سرکار برطانیہ نے حضرت مولانا کو اپنا مجرم سمجھکر مع رفقا طلب
کر لیا۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ اب کیا تھا شریف صاحب کو ایذا دہی اور اخراج کا ایک
موقع ملگیا اور خدا تعالیٰ راضی ہوں یا ناراض اپنے پشت پناہوں کو خوشنود کرنے کا زریں موقع
ہاتھ آیا+

اسکی صورت یہ ہوئی کہ شریف صاحب جدہ میں سرکار انگریزی کے یورپین افسر سے ملنے
گئے جو معاملاتِ جنگ کا منتظم تھا۔ اُسکی وساطت سے جدہ ہی میں حضرت مولانا کے متعلق
سرکار برطانیہ کی طلبی معلوم ہوئی۔ شریف صاحب نے مکہ معظمہ واپس آنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔
جدہ ہی سے بذریعہ ٹیلیفون مکہ معظمہ میں اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ "ہندی عالم اور اُن کے رفقا
جدہ بھیجکر افسرانِ برطانیہ کی حفاظت میں دیدئے جائیں"+

شریف صاحب کی عدالت کے افسروں نے یہ حکم شیخ المطوفین کی وساطت سے حضرت کے
پاس پہنچایا کہ "چونکہ گورنمنٹ برطانیہ نے آپکو ہم سے طلب کیا ہے۔ لہذا آپ مع رُفقا کے چلنے
کے لئے تیار ہو جائیں"۔ صلحا کی یہ جماعت جسکو اپنی یکسوئی اور شغل فی العبادت اور زہد عن الدنیا
اور اظہارِ حق کے سوا اپنا کوئی قصور ہی معلوم نہ تھا۔ اس حکم کو سُنکر حیران رہگئی اور حضرت کے

مخلصین و خدام ہی نہیں بلکہ مکہ معظمہ کے تمام مسلمان سوائے چند کینہ پسند لوگوں کے اس خبر سے بیچین ہوگئے۔ مکہ معظمہ کے چند سربرآوردہ حضرات اور ہندوستان کے معزز تاجر جو مکہ معظمہ میں مدتوں سے تجارت کرتے ہیں بصورت وفد شریف صاحب کی دار الحکومت میں شیخ الاسلام کے پاس گئے اور حکم کی منسوخی اور حضرت مولانا کے قصور کی تشریح کا مطالبہ کیا۔ افسرانِ محکمہ اور جنابِ شیخ الاسلام نے جواب دیا کہ حضرت شریف صاحب (انگریزی قنصل کی ملاقات کے لئے!!) جدہ تشریف لیگئے ہیں اُنکی غیبت میں اس حکم میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوسکتا نہ تاخیر کیجا سکتی ہے۔

ارکانِ وفد کی درخواست تھی کہ شریف صاحب کی واپسی تک اس حکم کی تعمیل اور حضرت کی روانگی ملتوی رکھی جائے تاکہ ہم لوگ اسکے متعلق شریف صاحب سے عرض معروض کرسکیں۔ لیکن محکمہ اپنی مجبوری اور عذر پیش کرتا تھا۔ بہت گفت و شنید کے بعد اور وفد کے اصرار پر افسرانِ حکومت نے اُس روز حضرت کی روانگی ملتوی کردی۔

حضرت مولانا کی نسبت جو حاسدوں نے بعض اتہامات حکام تک پہنچائے تھے اُن کے متعلق شیخ الاسلام نے ارکانِ وفد سے کچھ دریافت کرنا چاہا تو ان لوگوں نے کہا کہ حضرت کے ایک نہایت مخصوص خادم اور لائق شاگرد ہماری ہمراہ ہیں۔ وہ ہر بات کا جواب تحقیق سے دے سکتے ہیں۔ اجازت ملنے پر مولانا حسین احمد صاحب جو نیچے کے مکان میں ٹھیر گئے تھے بلائے گئے۔ اور مؤدب مصافحہ کے بعد شیخ الاسلام کے ہر ایک سوال و الزام کا سچا اور صحیح جواب ایسے طرز سے دیا کہ شیخ الاسلام کو تسلیم کرنا پڑا۔ فتوے پر دستخط نکرنے کا وہی عذر کیا جو پہلے مذکور ہوچکا ہے۔ اور حکومت کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے الزام پر اپنے محترم اُستاد کی یکسوئی اور دن رات کے علمی و دینی مشاغل کا ذکر کیا اور بعد مغرب حرم شریف میں مجمع کرنے کے متعلق کہا کہ حضرت کے صرف چند خدام ہوتے ہیں اور کوئی نہیں۔

الغرض اسی طرح اس مفصل ملاقات میں اپنی قوتِ استدلال اور فصیح بیان سے اس جماعت کا بے قصور ہونا اُنپر واضح کردیا۔ اور اُنہوں نے وعدہ فرمالیا کہ شریف صاحب کی واپسی پر اس بیہودہ معاملہ کو رفت و گذشت کرادینگے۔

مولانا حسین احمد صاحب مطمئن ہوگئے اور اس سے پیشتر شریف صاحب کی ناراضی کے اندیشہ سے

اور بالفعل گرفتاری کی خبر پر جو سامان بہ عجلت تمام اپنے شیخ کے رُفقا کو لیکر کسی طرف خفیہ نکل جانیکا کر رکھا تھا اُسکو باطمینانِ خاطر روانہ ہونیکے خیال سے ملتوی کر دیا۔

دِن کو یہ واقعات ہوئے اور رات کو کسی وقت شریف صاحب بھی مکہ معظمہ واپس آ گئے اور شیخ الاسلام نے صبح کو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر حسبِ وعدہ مناسب سفارش کے ساتھ اس معاملہ کو پیش کیا۔ اور دیگر افسرانِ حکومت نے بھی عرض حال کیا تو شریف صاحب نے شیخ الاسلام کی ایک نہ سنی اور نہایت برافروختہ ہو کر اپنے ماتحتوں کو اس تاخیر اور کوتاہی پر نہایت سرزنش کی کہ ابتک کیوں روانہ نہیں کیا۔ فوراً روانہ کرو +

مولانا حسین احمد کے علم و فضل سے شریف صاحب واقف تھے اور کسی قدر تعارفِ ذاتی بھی حاصل تھا۔ بعض خطوط بھی ہمراہ تھے کہ بوقتِ ضرورت شاید نافع ہوں۔ مولانا موصوف خود تشریف لیگئے۔ غم و غصہ سے سینہ بھرا ہوا تھا۔ محترم اور بے قصور شیخ کی ہمدردی سینہ میں موجزن تھی۔ شریف صاحب سے باادب مگر بفصاحت و قوتِ استدلال تیزی سے گفتگو کر کے حضرت کی براءت اور شریف صاحب کے اس فعل کی نامعقولیت ثابت کی۔ شریف صاحب پہلے ہی سے ان کے اثر و وجاہت سے متردد رہتے تھے۔ اور دشمنوں کی افترا پردازیوں سے کان بھرے ہوئے تھے جلد ساز کا بیان بھی فراموش نہ ہوا تھا اس ملاقات سے اور زیادہ خائف ہو گئے اور چشم دید جرأت و ہمت اور خداداد فصاحت سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور مولانا حسین احمد صاحب سے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ "میں آپکو سمجھونگا" +

مولانا حسین احمد صاحب کے علاوہ وفد بھی جسکی سعی سے حضرت کی روانگی ایک روز مؤخر ہو گئی تھی شریف صاحب کی خدمت میں پہنچا (جسکے ارکان کو حضرت کی عظمت و بے قصوری اور اپنی شخصیت و وقعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کامیابی کی پوری توقع تھی) اور بڑی مسرت و مستعدی سے شریف صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا۔ اور عرض کیا کہ "حضرت مولانا ہندی ایک گوشہ نشین تارک الدنیا خدا پرست متبحر عالم ہیں۔ دنیاوی امور فتنہ و فساد اور معاملاتِ سیاسی میں کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ ان کو بلا قصور گرفتار کر کے اعدائے اسلام کے کیوں سپرد کیا جاتا ہے۔ اگر بالفرض و التقدیر وہ مجرم ہی ہیں تو آپ اپنی عدالت میں اُن سے باضابطہ مواخذہ فرمائیں کر

جس سزا کے وہ مستحق ہوں اُسپر جاری کیجئے"۔ اگر یہ مقدس ہندی عالم حرم محترم سے گرفتار کرکے غیر مسلم حکومت کے سپرد کر دئے گئے تو حرم شریف کی توہین کا الزام آپکے لئے قیامت تک باعث ملامت رہیگا۔ اور تمام ہندیان مقیم مکہ معظمہ کی بھی خاص توہین ہوگی۔ اور عام مسلمانوں پر اسکا جسقدر بُرا اثر پڑیگا وہ مخفی نہیں"۔

وفد نے اور بھی معقول دلائل بیان کئے لیکن وہاں سے ہر مرتبہ یہی جواب ملتا تھا کہ حضرت مولانا انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں۔ اور وہ اُن کو بحیثیت مجرم طلب کرتی ہے۔ چونکہ ہماری دوستی گورنمنٹ برطانیہ سے نئی نئی ہے۔ اسلئے ہم کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہتے جو اُسکی خلاف رضا اور ہمارے تعلقات میں مخل ہو"۔ اصرار کے بعد بھی جب ارکان وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو انتہائی رنج والم اور مایوسی کے ساتھ واپس ہوئے اور شریف صاحب نے اپنے حاکموں کو تعمیل حکم کی تاکید کی ؛

مولوی صاحب کو جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو ارادہ کیا کہ جس طرح ممکن ہو اپنے اُستاد معظم کو پنجۂ ظلم سے بچاکر کسی ایک خادم کے ہمراہ خفیہ کسی طرف نکالدوں۔ ہمپر جو کچھ گذریگی برداشت کرینگے۔ جان جائے تو جائے مگر شیخ پر آنچ نہ آئے۔ زندہ رہی تو کبھی جاکر ملجائیں گے۔ نہیں تو جان نثاروں میں نام رہیگا۔ کامل اخفا اور پوری احتیاط کے ساتھ ایک معتمد شتربان سے معاملہ طے کیا۔ اور بایں خیال کہ روانہ ہونے تک شریف صاحب کے تشدد آمیز احکامات سے محفوظ رہیں، بعجلت تمام حضرت مولانا کو ایک نہایت محفوظ مکان میں آرام کے ساتھ چشم حساد سے مخفی کر دیا۔ کہ محل وموقع دیکھکر کسی وقت کسی لباس میں روانہ کر دئے جائیں ؛

مولوی صاحب یہاں اس فکر میں تھے کہ اُدھر شریف صاحب نے اُنکو اپنے لئے خطرناک سمجھکر گرفتاری کا حکم دیا اور چونکہ مدینہ منورہ کے قیام کی وجہ سے مولویصاحب شریف کے دشمنوں یعنی ترکوں کی رعایا متصور ہوتے تھے اسلئے اُنکی ایذا دہی میں کچھ تامل نہ ہوا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور مولوی صاحب اُسی روز مکہ معظمہ کے زندان میں پہنچا دئے گئے۔ ماتحت افسر آخر مسلمان تھے۔ حرم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مدرس اور معزز عالم دین کو ذلیل درجہ کے زندان میں رکھتے ہوئے شرم آئی۔ اور اول درجہ کے معزز طبقہ کے زندان میں (جہاں نماز اور نشست کیلئے تخت بچھے ہوئے تھے

اور محافظوں کی اجازت سے ملاقات بھی ہو سکتی تھی اور عزیزوں دوستوں کا بھیجا ہوا کھانا بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔) مولوی صاحب کو مقید کر دیا۔

مولوی صاحب کو اپنی ناگہانی گرفتاری بلا کا کچھ رنج نہ تھا اُن کو اپنے مقدس اُستاد کی بیکسی کا صدمہ اور اپنی شائستہ تدبیروں کے درہم برہم ہو جانیکا قلق تھا۔ جسم یہاں مقید تھا اور دل وجان اُستاد کی خدمت میں۔ لاچار ومجبور و بیقرار تھے۔ مگر کیا کرتے۔ قضاء اللہ غالب۔ رضا بالقضا زندان میں مقید رہے۔

حضرت مولانا اپنی گرفتاری کا قطعی حکم سُن چکے تھے۔ مجرموں کی طرح مخفی رہنے کی شدید کلفت برداشت فرما رہے تھے۔ اِس مصیبت کی حالت میں اپنے جان نثار رفیق کی گرفتاری اور قید کی خبر سُنی ایسے عزیز کی جدائی اور تکلیف سے جسقدر صدمہ ہو وہ کم تھا۔ چہرہ پر رنج برستا تھا غم چھپایا نہ چھپتا تھا۔ مگر جس طرح اولوالعزم اور راسخ القدم بندگان خدا صبر کیا کرتے ہیں آپ نے بھی کیا اور سمجھے کہ امتحان در امتحان ہے۔

شریف صاحب کے ماتحتوں نے حضرت مولانا کی روانگی کے متعلق اُنکے حکم کی تعمیل کرنی چاہی تو حضرت کا کہیں پتہ نشان ہی نہ پایا (کیونکہ وہ بکمال احتیاط مخفی ہو چکے تھے) البتہ مولوی عزیر گل صاحب و مولوی نصرت حسین صاحب موجود تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی پولیس نے انسے تفتیش کی تو ان لوگوں نے اور مطوف صاحب نے بھی جنکی حمایت میں حضرت مولانا مکہ معظمہ میں قیام پذیر ہوئے تھے بالکل لاعلمی ظاہر کی بہت تلاش اور جستجو کے بعد ناکامیاب ہو کر مجبوراً شریف صاحب سے اطلاع کی۔ وہاں سے نادر شاہی حکم صادر ہوا کہ " اگر عشا کے وقت تک یہ لوگ پتہ نشان نہ بتلائیں تو مطوف صاحب کو برہنہ کر کے کوڑے لگائے جائیں اور عہدہ مطوفی سے معزول کر دیا جائے۔ اور دیگر رفقا جو موجود ہیں اُنکو گولی مار دیجائے "۔ یہ احکام سُنکر مکہ معظمہ میں ایک تہلکہ پڑ گیا اور رُفقا اور مطوف صاحب ان احکام کے خوف سے سراسیمہ و پریشان تھے ہی پولس کے تشدد اور گرفت نے اور پریشان کر دیا (اور حقیقت میں ان کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ حضرت کہاں ہیں۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ مخفی ہیں) شدہ شدہ شریف صاحب کے سخت احکام اور رفیقوں کی پریشانی کی خبر حضرت کو پہونچی سُنکر بے چین ہو گئے۔ وہ مخزن رحمت و شفقت ایک معزز آل رسول مطوف کی ذلت و رسوائی

اور اپنے مخلص و جانباز رُفقا کی پریشانی اور ہلاکت کیسے گوارا کر سکتے تھے - احرام[1] باندھا اور سر بکف بیتاب ہو کر نکل آئے اور گرفتاری پر رضامند ہو گئے ؎ مروّت ہو تو ایسی ہو فتوّت اسکو کہتی ہیں

عالم ہو یا جاہل - بوڑھا ہو یا جوان - اپنی جان بہت عزیز ہوتی ہے - اور اپنی سلامتی ہر شخص چاہتا ہے - ممکن تھا کہ اپنی حفاظتِ نفس کیلیئے جائز طور پر حضرت کوئی تاویل فرما لیتے کہ معلوف صاحب سزا پا کر کبھی نہ کبھی بحال ہو ہی جائیں گے - اور رفقا کی ہلاکت اول تو یقینی نہیں ممکن ہی کہ شریف صاحب کی صرف تہدید ہو اور وہ لوگ بچ جائیں - اور اگر نہ ہی بچے تو مظلوم مقتول ہو کر درجۂ شہادت حاصل کرینگے - حضرت نہایت آرام سے محفوظ جگہ مخلصوں میں پوشیدہ تھے - شاید مدتوں چھپے رہتے اور کسی کو خبر نہ ہوتی - اور کبھی کسیوقت بہ تبدیلِ ہیئت و لباس کسی طرف نکل جاتے یا وطن پہونچ جاتے - یا اور کوئی صورت خلاصی کی خیال میں آجاتی لیکن نہیں، حضرت نے اپنے شایانِ شان کمال ایثار علی النفس اور استقلال کا ثبوت دیا اور اپنے خدام و مخلصین کو بچایا اور اپنے ضعیف جسم اور بیش بہا جان کو خطرہ میں ڈالکر یُؤثِرُونَ عَلٰٓی اَنفُسِهِم وَلَو کَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ کے مصداق ٹھیرے ؛

مخفی جگہ سے نکل کر حضرت مولانا اور وحید احمد صاحب اپنی جاء اقامت پر رفقا کے پاس تشریف لے آئے - مغرب کے بعد جہاں محکمۂ پولیس اور مختلف لوگ حضرت کی تفتیش میں جمع تھے - حضرت کے ظاہر ہو جانے پر شریف صاحب کے ملازموں نے حکم کی تعمیل کی - حضرت سے دریافت کر کے جسقدر اونٹوں کی ضرورت تھی مکان ہی پر لے آئے اور جب حضرت نے نمازِ عشا سے فراغت پائی تو بہ عزّت و احترام سوار کر کے حضرت مولانا اور آپکے تین رفیق مولوی عزیر گل صاحب - مولوی وحید احمد صاحب - مولوی نصرت حسین صاحب نظر بندوں کی حیثیت سے حکومت عرب کی نگرانی و محافظت سے چار عربی سپاہی یعنی بدّوؤں کی حراست میں بجانب جدّہ روانہ کئے گئے - مولانا حسین احمد صاحب کے زندان میں اسوقت کون جا کر کہتا کہ راحت و روح رواں اسوقت مقید ہو کر بیت الحرام سے جا رہے ہیں - اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ؛

---

[1] تہمد اور چادر پہنکر ایک مصلحت سے احرام کی صورت بنائی - نیز شریف صاحب پر حجت قائم کرنیکے لئے اسلئے کہ مقام حرم اور حالتِ احرام میں کسی کو گرفتار کرنا اور ایذا دینا شرعًا نہایت مذموم اور گناہ کبیرہ ہے ۱۲ ؛

صبح کی نماز کے بعد حضرت کے نیازمند اور مولانا حسین احمد صاحب کے ایک دوست نے زندان میں پہنچکر مولویصاحب سے اطلاع کی کہ شریف صاحب کے حکم کی تعمیل ہوگئی اور حضرت مولانا عشا کے وقت بجانب جدّہ حراست میں روانہ کردیے گئے۔ یہ سُنکر مولویصاحب کی جان میں جان نہ رہی۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑگئے۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ حیران رہگئے کہ کیا کریں۔ دل چاہتا تھا کہ پَر لگاکر اُڑ جائیں۔ مگر مجبور تھے۔ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ بس یہی سوجھی کہ جس طرح ہو اُستاد کے قدموں میں جاپڑوں۔ جان جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے ٭

شریف صاحب کی خدمت میں عرضداشت پہنچائی کہ مدینہ منورہ سے جدائی اور آستانۂ نبوی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) سے مفارقت صرف مخدوم اُستاد کی خدمت گذاری کے لئے گوارا کی تھی اور مکہ معظمہ میں محض اسی لئے مقیم تھا۔ حکومت نے جو معاملہ اُن کے ساتھ کیا ہی میرے ساتھ بھی کرے اور جسقدر جلد ممکن ہو جدّہ پہنچادے۔ سرکار برطانیہ کیطرف سے بالتصریح طلبی نہیں لیکن جب حضرت کے سب رُفقا کو بھیجا گیا ہے تو مجھے کیوں چھوڑا جاتا ہے میں بھی تو اُنہیں کا خادم ہوں۔ اور ایک مخفی تدبیر یہ کی کہ بعض ذرائع سے شریف صاحب کی خدمت میں خیرخواہانہ یہ ذکر کرایا کہ حضور اصل مادۂ فساد تو حسین احمد ہے۔ اسکو مکہ معظمہ میں آزاد یا مقید رکھنا ہر دو طرح خطرناک ہے۔ آزاد رہا تو حکومت سے نفرت اور فساد کا تخم جو اسنے بویا ہے بارور ہوجائیگا۔ مقید رہا تو اہل اسلام میں شورش اور بے چینی بڑھیگی۔ موقع بہت اچھا ہے چونکہ اسوقت اپنی غلطی سے یہ خود درخواست کرتا ہے اسکو دفع کرنے میں اور شیخ ہندی کے ساتھ جدّہ بھیجدینے میں حکومت پر کچھ الزام نہ ہوگا ٭

اسکے علاوہ گنبدِ اخضر کے متبرک سایہ میں مدتوں درس دینے کی وجہ سے مدینہ منورہ سے گذر کر مکہ معظمہ تک بھی مولانا حسین احمد صاحب کے علم و فضل کی شہرت ہوچکی تھی اور صدہا مخلص اور بعض تلامذہ یہاں موجود تھے۔ مولویصاحب کا زندانِ مکہ معظمہ میں بلا قصور مقید رہکر تکلیف اُٹھانا اُن کے قلوب کو مضطر کئے ہوئے تھا اور شریف صاحب کی مجلس چونکہ نیک دل حضرات سے خالی نہ تھی ان مخلصین و تلامذہ نے اُنہیں کے ذریعہ سے مولانا حسین احمد صاحب کا بلا تقصیر مقید ہونا اور اُن کے علم و فضل کا حال شریف صاحب کے گوشگذار کرکے رہائی کی تحریک کی ٭

ان سب حالات پر نظر کرکے شریف صاحب کو مکہ معظمہ میں انکا وجود اپنے لئے ہر طرح خطرناک نظر

آنے لگا اور کسی قدر غور و تامل کے بعد جدہ پہنچا دئے جانیکی درخواست منظور کرلی۔ مگر ساتھ ہی خیر خواہی کے طرز میں یہ بھی سمجھا دیا کہ تم ترکی رعایا ہو۔ مدینہ منورہ[1] جانیکی اجازت ہوسکتی ہے خواہ مخواہ عالم ہندی کے ساتھ جاکر کیوں اپنے آپ کو مجرم اور مقید بناتے ہو۔ محبت میں انسان حقیقی ناصح کی بھی نہیں سُنتا۔ یہ تو محض سیاسی تدبیر اور منافقانہ خیر خواہی تھی۔ مولویصاحب اسکی کب پروا کرتے تھے ان کے دل کو تو کچھ اَور ہی لگی ہوئی تھی اپنی بات پر مُصِر رہے اور حکومت عربی نے حضرت کی روانگی سے اگلے روز ان کو بھی جدہ روانہ کردیا +

حضرت مولانا اونٹوں کی سواری پر دو روز میں جدہ پہونچے تھے۔ مولوی صاحب اسباب پیچھے روانہ کرنے کے لئے دوستوں کی سپردگی میں چھوڑ کر عرب کے سپید خچر کی تیز سواری پر دو روز کا راستہ بارہ گھنٹے میں طے کرکے جدہ پہنچے اور ان سب حضرات کے پہنچنے سے چند گھنٹے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر اور اپنے رُفقا میں شامل ہوگئے۔ حضرت ان کو دفعۃً دیکھکر متعجب ہوئے اور حالت معلوم کرنیکے بعد اگرچہ انکی اس مروّت اور حُسنِ وفا سے قلبی مسرت لازمی تھی لیکن اس مروت کے ظاہری نتائج اور آئندہ خطرات پر نظر فرماکر متاسف و غمگین ہوگئے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ مورد آلام و تکالیف ہوں گے +

مولانا حسین احمد صاحب کی شریفانہ جان نثاری اور حُبِّ شیخ کے متعلق اس مختصر تحریر میں اپنی طرف سے ایک حرف بھی کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن آپ اُسوقت کے حالات کو پیشِ نظر رکھکر خود اندازہ فرمائیے کہ اس زمانہ میں ایسی جانبازی کی نظیر مل سکتی ہے یا نہیں۔ مدینہ منورہ میں شیخ الحدیث ہونے کی عزت شرفاء بلدہ طیبہ میں رسوخ و وجاہت، ضعیف والد اور بیکس زن و فرزند، اپنی نوجوانی کی حفاظت اور آئندہ ہر قسم کی اُمیدِ آرام و راحت، یہ سب ایک طرف ہیں۔ اور حُسنِ وفا اور محبتِ شیخ دوسری طرف جسمیں جان کا خطرہ ہے۔ اور طرح طرح کے مصائب کا اندیشہ۔ مگر یہ شخص اسطرف نظر اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتا اور خطرات کی طرف بے تامل عاشقانہ بڑھا چلا جاتا ہے +

گذشتہ زمانہ کے فنافی الشیخ اور سرمست لوگوں کی حکایتیں جو آپنے سُنی ہونگی (کہ عالم شوق میں شیخ کے نابدان میں سر گھسائے ہوئے شیخ کی آواز سُنکر محو ہو رہے ہیں۔ برسات کا پانی صحن میں بھر جاتا ہے اور شیخ بدرو صاف کرنے کے لئے زور سے بانس مارتے ہیں تو سر سے خون کے فوارے

[1] شریف کا مطلب اس صورت میں بھی حاصل تھا کہ مکہ معظمہ سے دفع ہو جائیں گے" +

جاری ہو جاتے ہیں مگر سر نہیں ہٹتا) اس شخص نے آنکھوں سے دکھلادی کہ ہاں حالتِ ہوش و حواس میں اس طرح جان فدا کیا کرتے ہیں۔

بہرحال پہلے اصحابِ اربعہ تھے اب پنجتن ہو گئے اور جدّہ میں تین روز عربی سپاہیوں کی حراست میں رہے اور پھر دوسرے مکان بہاؤ الدین انگریزی خفیہ انسپکٹر کی نگرانی میں منتقل ہو گئے (جو بظاہر محافظِ حجاج کے عہدہ پر ممتاز تھے) اور تقریباً بیس روز یہاں مقیم رہے۔

مدینہ منورہ میں حضرت مولانا کی گرفتاری اور مولانا حسین احمد کی معیت نہایت قلق و حسرت کے ساتھ سُنی گئی۔ اور مولوی صاحب کے شاگرد اپنے باکمال استاذ کے فیوض سے مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور روضۂ مطہرہ کے پُرنور حضور میں جو قال اللہ وقال الرسول کا ایک شاندار حلقۂ درس جما رہتا تھا درہم برہم ہو گیا۔ لیکن چونکہ اُسوقت وہاں ترکوں کی سلطنت قائم تھی اور شریف صاحب کی مخالفت سے ایک پریشانی کا عالم تھا اور قحط کی عام مصیبت تھی اسلئے وہاں کے بااخلاص لوگ ان حضرات کی رہائی کی کوئی تدبیر کرنے سے معذور و مجبور رہے۔

مناسب ہے کہ حضرت کے رفیقانِ اسیری سے (جنکا نام آپ بار بار سُن چکے ہیں یا آئندہ سنیں گے) اس موقع پر ذرا تفصیلی تعارف حاصل کر لیں جنمیں سے ہر ہر شخص اپنے درجہ پر حضرت کا پورا جان نثار اور مخلص خادم ثابت ہوا ہے۔ اور حضرت تو یکتائے زمانہ تھے ہی ان خادموں میں سے بھی ہر ایک نے مزلۃ الاقدام اور محلِ امتحان مواقع میں کمالِ ایمانی اور استقامت کا موجبِ تحسین ولائقِ اقتدا ثبوت دیا اور حضرت کو بھی مختلف حیثیات سے ہر شخص پر پورا اعتماد اور ہر ایک کے حال پر ایسی خاص شفقت و عنایت تھی جسکو یہ لوگ کبھی آخری دم تک بھی نہ بھولیں گے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب۔ آپکا قدیم وطن موضع آلہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد نجیب الطرفین حسینی سید ہیں۔ والد ماجد آپ کے مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہٗ کے عمدہ خلفا میں سے تھے۔ آپ کے دو بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب و مولانا سید احمد صاحب آپ سے پہلے دار العلوم دیوبند میں پہنچ چکے تھے۔ اُنہیں کی موجودگی میں آپ بھی آئے اور دار العلوم میں نہایت کامل طریقہ سے تحصیل علوم کی اور حضرت مولانا شیخ الہند کے علمی فیوض سے متمتع ہوئے۔ تینوں بھائی کو حضرت مولانا سے خاص عقیدت تھی۔ مگر مولوی حسین احمد صاحب اس تعلق میں اپنے دونوں بھائیوں سے

چند قدم آگے تھے +

موجودہ حضرات میں سب کے علم و فضل و تقدس کے قائل تھے لیکن اپنا ملجا و ماوا صرف حضرت مولانا کو ہی سمجھتے تھے۔ بیعت ہونے کے متعلق بھی کبھی کسی دوسری جانب خیال دلمیں نہیں گذرتا تھا سمجھتے تھے کہ جب کبھی موقع ہوگا حضرت ہی سے بیعت ہو جائیں گے۔ حضرت مولانا سے جب کبھی عرض کیا تو حسب عادت مختلف طریقوں سے عذر و انکار فرمایا اور بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ سے شرف بیعت حاصل کر چکے اور مولانا حسین احمد صاحب کا اپنے والد ماجد کی ہمراہ ہندوستان ترک کر کے مدینہ منورہ جانیکا قصد مصمم ہوگیا تو خود حضرت مولانا نے مولوی صدیق احمد صاحب سے تاکید کی کہ گنگوہ میں انکو بھی داخل سلسلہ کرا دیا جائے +

مولانا حسین احمد صاحب واقف تھے کہ حضرت مولانا بہت ہی کم بیعت فرماتے ہیں۔ اور انکے لئے باوجود کمال شفقت کے بیعت سے انکار فرما چکے ہیں اور خود ہی گنگوہ کی طرف راہ نمائی فرما رہے ہیں اور پھر گنگوہی قطب عالم قدس سرہٗ کا دربار بھی مرجع الکل سمجھا جاتا تھا اسلئے مولوی صاحب بھی ۱۰ شعبان ۱۳۱۶ھ میں بغرض بیعت گنگوہ حاضر ہوئے۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی درخواست پر اس گوہر گرانمایہ کو شرف قبول بخش کر بیعت سے معزز فرمایا۔ اور چونکہ والد کا قصد انہیں ایام میں ہجرت کرنے کا تھا اسلئے گنگوہ میں کچھ قیام نہیں کر سکے۔ بلکہ حضرت نے اشغال و وظائف بھی حضرت حاجی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے مکہ معظمہ میں دریافت کر لینے کی ہدایت دی اسی قصد کو دل میں لئے ہوئے رخصت ہو کر والد صاحب کی خدمت میں وطن پہنچے +

صاحبزادوں کے آجانے کے بعد مقدس والد اس عارضی وطن ہندوستان کو (جسمیں پندرہ پشتیں گذارنے کی وجہ سے بہت سے اعزہ و احباب موجود تھے) چھوڑ کر شوق قرب روضۂ اطہر بکمال خلوص اپنے سب اہل و عیال اور پانچ صاحبزادوں اور یکسالہ پوتے (مولوی) وحید احمد کو ہمراہ لیکر اہلبیت سرور عالم کے اصلی وطن مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ ہندوستان سے مکہ معظمہ پہنچے اور تمام متعلقین کے ساتھ حج ادا کیا۔ یہاں سے فارغ ہونیکے بعد روانہ ہو کر مدینہ منورہ میں اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مدینہ منورہ میں پہنچ گئے اور چند روز امتحان و تکالیف میں مبتلا رہنے کے بعد باطمینان مقیم ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنے اہل و عیال اور مہمانوں کے لئے آرام دہ مکان بھی تعمیر کر لیا +

• مولانا حسین احمد صاحب نے حسب ہدایت حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ مکہ معظمہ میں حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر چند روز استفادۂ کمالات وفیوضِ روحانی کیا اور ذکر و اشغال میں معروف رہے۔ پھر وہاں سے بہ اجازت رخصت ہوئے۔ اور مدینہ منورہ پہنچکر حرم شریف میں سلسلۂ درس جاری فرمایا۔ اور نہایت مشغولیت کے ساتھ اشاعتِ علم شروع کی اور مستعد طلبہ اور اہلِ علم زانوئے شاگردی اُنکی خدمت میں تہ کرنے لگے۔ مگر اس شغل میں اصلاح باطن کا خیال اور بزرگانِ ہندوستان کا تعلق قلب میں لگا ہوا تھا۔ خطوط میں گنگوہ بعض حالات وواردات کی اطلاع دی تو ۱۳۱۸ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے تحریر فرمایا کہ چند روز کے لئے میرے پاس ہو جاؤ تو مناسب ہے (کیونکہ مکہ معظمہ میں حضرت شیخ الشیوخ حاجی صاحب قدس سرہٗ کی وفات ۱۳۱۷ھ میں ہو چکی تھی) مسندِ درس پر متمکن تھے اور روز افزوں ترقی پیشِ نظر تھی۔ مگر اصلاح باطن کو اسقدر اہم اور ضروری سمجھا۔ اور ان ایام میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت نے وہ غلبہ کیا کہ سب تعلقات چھوڑ کر ہندوستان کا ارادہ کر دیا ؛

بزرگ والد ماجد اپنا اندوختہ مصارفِ ہجرت میں صرف کر چکے تھے اور جو کچھ رہگیا تھا وہ بڑے صاحبزادے (مولانا صدیق احمد صاحب) لیکر بشوق زیارتِ بزرگان جانبِ ہندوستان اُنسے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب کے شاگردوں اور معتقدوں کی کچھ کمی نہ تھی لیکن کسکو خبر تھی کہ گھر میں سوائے سرمایۂ توکل کچھ ہے ہی نہیں۔ اور یہاں حرفِ سوال تو کجا اشارہ کنایہ بھی خلافِ غیرت تھا۔ بہر حال والد صاحب سے اجازت ودعا کے طالب ہو کر اور گھر میں جو کچھ قلیل رقم موجود تھی لیکر متوکلاً علی اللہ روانہ ہوئے ؛

مکہ معظمہ پہونچکر حج ادا کیا اور وہاں سے جدہ پہونچے مگر بڑے بھائی صاحب سے کہیں ملاقات نہوئی بلکہ معلوم ہوا کہ وہ جہاز کے انتظار کی کلفت اور زادِ راہ کی قلت سے پریشان ہو کر واپسی کے قصد سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولوی صاحب نے ایک آگبوٹ کا ٹکٹ خرید لیا اور سوار بھی ہو گئے۔ جہاز کی روانگی کا نہایت تکلیف سے انتظار کر ہی رہے تھے کہ بدقسمتی سے اُسکی روانگی بالکل ملتوی ہو گئی ؛

مولوی صاحب فرصت پاکر بھائی صاحب کی ملاقات کے لئے مکہ معظمہ گئے اور اُن کو ہندوستان

کے سفر پر آمادہ کر کے جدہ واپس لے گئے۔ مگر بھائی صاحب کے زادراہ کا اکثر حصہ ختم ہو چکا تھا اور اب اتنا بھی روپیہ دونوں کے پاس نہ تھا کہ صرف دُخانی جہاز کا ہندوستان تک ٹکٹ ہی خرید لیں۔ حیران تھے کہ کیا کریں +

شوق سب کچھ کراتا ہے اور محبت سب مصائب آسان کر دیتی ہے۔ بادبانی جہاز کا ٹکٹ مسقط تک دس دس روپیہ میں لیکر سوار ہو گئے۔ بہت دقتوں کے بعد ڈیڑھ ماہ میں جہاز مسقط پہنچا اور وہاں سے دو دو روپیہ دیکر آگبوٹ میں کراچی پہونچے۔ یہاں تک کہ ریل کا ٹکٹ خریدنے کے بعد ایک پیسہ بھی پاس نہ رہا۔ مدینہ منورہ کا تبرک کھجوریں فروخت کرنے کو دل نے گوارا نہ کیا۔ ہاں مسقط کا حلوا جو بزرگوں کو ہدیہ دینے کے لئے خریدا تھا فروخت کر کے انتہائی ضرورت میں کچھ کھانا خرید کر کھایا اور خدا خدا کر کے سہارنپور پہونچے۔ بڑے بھائی براہ راست گنگوہ چلے گئے اور مولانا حسین احمد دیوبند میں حضرت کی قدمبوسی کر کے یہاں سے گنگوہ پہونچے +

قطب عالم نے محبت و شوق سے دونوں بھائیوں کو نئے جوڑے پہنائے جو پہلے سے تیار رکھے تھے خاص توجہ سے ارشاد و تلقین کر کے باقاعدہ معمولات اور ذکر اللہ میں لگا دیا اور بہت قلیل عرصہ کی ریاضت کے بعد ایک روز بعد عصر مجمع عام میں بلا کر بکمال شفقت و عنایت دونوں بھائیوں کے سر پر اپنے دست مبارک سے دستار خلافت باندھکر انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ یہ وہ درجہ تھا کہ حضرت کے خدام میں کبھی کسی کو اسکا خیال بھی نہیں آتا تھا اور برسوں کی محنت کے بعد کبھی اتفاقیہ کسی خوش نصیب کو مرحمت ہو جاتا تھا +

چند ہی ماہ میں بے انتہا دینی فیوض اور روحانی برکات حاصل کر کے سنہ ۱۳۱۹ھ کے اخیر میں پھر ہندوستان سے واپسی کا قصد کیا۔ گنگوہ سے رخصت ہو کر دیوبند آئے اور یہاں حضرت کی شفقت و عنایات سے مالا مال ہو کر روانہ ہوئے اور بلدۂ طیبہ مدینہ منورہ میں پہنچکر حالت انتظار میں ضعیف والد کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اور بدستور سابق مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیم) میں جوار روضۂ مطہرہ میں درس جاری فرمایا۔ اور چند ہی روز میں خلوص نیت اور علم و کمال کی وجہ اور بزرگوں کی دعاء کی برکت سے خدا تعالیٰ نے وہ ترقی عطا فرمائی کہ رشک اقران و اماثل بن گئے سنہ ۱۳۲۵ھ میں مدینہ منورہ کا درس ملتوی کر کے حضرت استاذ کی زیارت اور تحصیل فیوضات علمیہ

کے شوق اور بعض ضروریات کی وجہ سے پھر ہندوستان تشریف لائے اور مسلسل تین برس حضرت کی خدمت میں ظاہری باطنی فیوض حاصل کئے۔ دار العلوم دیوبند میں باقاعدہ مدرس ہوکر درس دیتے رہے اور حضرت قدس سرہٗ کے حلقۂ درس میں دوسری مرتبہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری شریف پڑھی انکی شرکت اور حسن سوال کی وجہ سے حضرت مولانا سبق میں وہ مضامین عالیہ بیان فرماتے تھے جنکو عام طور سے ہمیشہ درس میں ذکر فرمانے کی عادت نہ تھی۔ اسی طویل قیام میں والد ماجد سے اجازت طلب کر کے اپنے ماوا و ملجا اور مربی و شفیق استاد (رحمۃ اللہ علیہ) کے مشورے اور ارشاد سے ضلع مراد آباد میں اہل علم و صلاح کے ایک شریف خاندان میں مولوی صاحب نے بطرز مسنون شادی بھی کرلی اور اہلیہ صاحبہ کو دیوبند میں حضرت مولانا ہی کے مکان میں لاکر رکھا +

باکمال شیخ کی خدمت سے جدا ہونے کو ہرگز دل گوارا نہیں کرتا تھا۔ مگر بوڑھے والد ماجد کی تاکید اور تلامذۂ مدینہ منورہ کی پُراصرار استدعا سے مجبور ہوکر شوال سنہ ۱۳۲۹ھ میں مدینہ منورہ پہنچے اور اہلیہ صاحبہ کو وہاں پہنچاکر مکہ معظمہ آکر حج ادا کیا اور سنہ ۱۳۳۰ھ میں مدینہ منورہ جاکر اور بدستور سابق بلکہ اور زیادہ ترقی اور شوکت کے ساتھ حرم محترم میں حلقۂ درس جاری فرمایا اور متفرق شدہ تلامذہ بہت جلد جمع ہوگئے خدا تعالیٰ نے علم و فضل کی وہ شہرت عطا فرمائی کہ دیگر اساتذۂ حرم شریف کے حلقے مختصر رہ گئے +

چونکہ اہلیۂ محترمہ کے والدین سے یہ وعدہ ٹھیر چکا تھا کہ مولوی صاحب خود اپنے اہتمام سے دو سال میں ایک مرتبہ ہندوستان لاکر لڑکی کو اسکے خاندان سے ملا دیا کرینگے لہذا بتعمیل ارشاد فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اَحَقَّ الشُّرُوطِ اَنْ یُوْفٰی مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِہٖ الفُرُوْج[1] - مولوی صاحب سنہ ۱۳۳۱ھ میں اپنے بڑے بھائی مولوی صدیق احمد صاحب مرحوم کے نوعمر صاحبزادے مولوی وحید احمد کو ہمراہ لیکر (تیسری مرتبہ) ہندوستان تشریف لاکر حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صرف آٹھ نو ماہ فیض صحبت اٹھاکر سنہ ۱۳۳۲ھ میں (حضرت مولانا کے سفر حج سے ایک سال پہلے) اپنی اہلیہ صاحبہ کو لیکر رخصت ہوئے۔ بھتیجے کو دار العلوم میں تکمیل علوم کرنیکے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں چھوڑ گئے اور خود مکہ معظمہ ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے +

مدینہ منورہ میں شغل تعلیم میں مصروف تھے کہ حضرت کے سفر حج کی اطلاع پہنچی اور ایام حج کے بعد

[1] وفا کرنے کی قابل سب سے زیادہ وہ شرطیں ہیں جنکے ذریعہ سے تمکو عورتوں سے حق صحبت حاصل ہوا ہے ۱۲ +

حضرت کے مدینہ منورہ تشریف لانیکا نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کرنے لگے اور (جیساکہ قریب ہی معلوم ہو چکا ہے) حضرت مولانا نے چھ ماہ مدینہ منورہ میں قیام فرماکر جب واپسی کا قصد فرمایا تو حضرت کی خدمت کے لئے ہمراہ مکہ معظمہ تک گئے اور حضرت کی معیت کو حقیقی سعادت دارین سمجھکر مکہ معظمہ کے زندان سے نکلکر جدہ میں شریک نظر بندی ہو گئے۔ چار سال تک تمام تکالیف و محن و مصائب و آلام میں شریک حال رہکر بدل و جان خدمت کرتے رہے اور تراویح میں حضرت کو قرآن مجید سنانے کے لئے اسی نظر بندی کی حالت میں کلام مجید حفظ کر لیا +

اسی اسیری کے زمانہ میں انکو دوسرے مصائب و حوادث کا سامنا ہوا۔ والد ماجد اور دونوں بھائی ترکی حکومت کی طرف سے مخبری کے بے بنیاد شبہات پر جوار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا کرکے اڈریا نوپل بھیجدیئے گئے۔ مستورات بے کس و تنہا رہگئیں۔ والد ماجد نے بحسرت تمام وہیں وفات پائی۔ مدینہ منورہ سے مصیبت زدہ اہلیہ صاحبہ (مذکورہ سابق) اور صغیر سن لخت جگر اور دختر اور سوتیلی ماں و دیگر چند اقارب کی وفات کے جگر خراش صدمات کی خبر اسیری مالٹا میں پہنچی۔ اور سوتیلی والدہ صاحبہ اور عزیز بھتیجی اور دیگر اقارب کی متواتر اموات کی اطلاعیں ملیں۔ انہوں نے بعزم و ثبات و صبر سکون سب صدمات برداشت کئے اور حضرت کی رفاقت و ظل عاطفت کو اپنے لئے کافی تعزیت و تسلی سمجھتے رہے +

حضرت نے ہر چند سمجھایا کہ گورنمنٹ انگریزی نے مجکو مجرم سمجھا ہی تم تو بے قصور ہو رہائی کی تحریک و کوشش کرو۔ مگر انہوں نے اور دیگر رفقا نے یہی جواب دیا کہ حضرت جان جائے مگر ایسی حالت میں آپکی خدمت سے جدا نہ ہوں گے ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے اوپر یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

رہائی کے بعد حضرت کے ہمراہ آکر سفر و حضر صحت و مرض میں حاضر خدمت رہے۔ وفات کے وقت حاضر نہ ہونے کی حسرت (انکی ترقی درجات کے لئے) مقدر تھی۔ وفات سے تین روز پہلے مولانا ابو الکلام صاحب کی درخواست پر کلکتہ میں اُن کے اسلامیہ کالج کی دینیات کا صدر مدرس تجویز کرکے حضرت مولانا نے بحالت مرض ہی دہلی سے انکو روانہ کردیا۔ وفات کا تار پہنچنے پر حیران و پریشان بعجلت تمام آئے اور دفن سے ایک ساعت بعد جس حسرت و افسوس کے ساتھ دیوبند پہونچے وہ قابل تحریر نہیں (نہایت

افسوس ہے کہ ان اوراق کے مرتب ہونیکے بعد ۱۵ محرم ۱۳۴۰ھ کو حضرت شیخ الہند کے مکان سے شب کو تین بجے گورکھا اور گورا فوج لاکر گورنمنٹ نے گرفتار کرلیا اور کراچی کے مشہور مقدمہ میں اپنا کمال ثبات و استقلال دکھلاکر صبر کیساتھ باشقت قید کی تکالیف برداشت کررہی ہیں) مولانا موصوف اپنے علم و فضل اور بجان نثاری و خدمت شیخ اور حضرت رح کے بعد قومی خدمات اور کراچی کے یادگار زمانہ تاریخی مقدمہ میں اعلان کلمۃ الحق اور تحمل مصائب و صدمات کے لحاظ سے خود ایک مبسوط و مستقل سوانح عمری کے مستحق ہیں۔ یہ چند اوراق چونکہ حضرت مولانا کا ایک نہایت مختصر تذکرہ ہیں اسلئے چند سطروں میں انکے بھی خاص خاص اور نہایت مجمل حالات تحریر ہوئے۔ فی الحقیقت ان کے سوانح عمری حضرت مولانا کے سوانح کے ساتھ بعینہ اس طرح متضمن و مربوط ہیں جیسے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبرک سوانح میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مبارک حالات فسلمھم اللہ تعالیٰ و اعانھم و نصرھم ۔

مولانا حاجی عزیز گل صاحب کاکاخیل۔ ساکن زیارت کاکاخیل علاقہ پشاور ۱۳۲۷ھ

میں وطن سے بغرض تحصیل علوم دین ہندوستان آئے اور پانی پت میں مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد خوش قسمتی نے دار العلوم دیوبند کی طرف ہدایت کی۔ یہاں پہونچکر مدرسہ میں جب باقاعدہ ابتدائی امتحان سے داخلہ خود حضرت مولانا نے لیا تو مخصوص توجہ اور شفقت کے اثر نے مولوی صاحب کے قلب میں حضرت شیخ سے ایک باطنی تعلق پیدا کرکے بندۂ بے درم بنا دیا اور اس امتحان کی کامیابی آیندہ امتحانات کیلئے نیک شگون اور فال حسن سمجھی گئی۔ دو سال میں مختلف اساتذہ دار العلوم سے تحصیل علوم کرکے مشکوٰۃ شریف تک پہونچے باطنی عظمت و عقیدت کا تو یہ حال تھا کہ جب تک حضرت مولانا کہیں دور تک بھی نظر کے سامنے رہتے غایت ادب سے بیٹھنا حرام سمجھتے۔ مگر حاضری خدمت اور کسی عرض و معروض کی نوبت نہ آئی تھی ✦

۱۳۲۹ھ میں ولایتی مشہور بزرگ اڈہ ملا صاحب کے دو خلفا دیوبند تشریف لائے تو حسن اتفاق سے مولوی صاحب کو حضرت کی مخصوص ملاقات کیلئے واسطہ بنایا۔ حضرت نے ملاقات منظور فرماکر اُن بزرگ مہمانوں کے ہمراہ براہ شفقت اُن کو بھی مدعو فرمایا۔ واقع میں انکی عقیدت اور ظاہر میں یہ دعوت انکے لئے باعث ہزار سعادت ہوگئی۔ آمدرفت کی جرأت ہوئی رفتہ رفتہ بمقتضائے اِذَا خَالَطَهُ أَحَبَّهُ ترقیٔ عقیدت سے باضابطہ حلقۂ خدام میں داخل ہوگئے۔ اور فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے تین مرتبہ حضرت سے بخاری شریف پڑھی۔ اور چار مرتبہ ترمذی شریف ✦

دار العلوم دیوبند میں ۱۳۳۲ھ تک تکمیل علوم کرکے فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں جب

حضرت نے قصد سفر فرمایا تو ان کے دیندار و بزرگ والد ماجد نے باوجود اپنی ضرورتوں کے ان کیلئے فلاحِ دارین سمجھکر ان کو معیت و خدمت کی اجازت دیدی اور سفر حرمین شریفین اور اسیری میں پورے شریک حال و خادم رہنے کے ساتھ تحصیل فیوض باطنی اور ذکر و شغل سے بھی غافل نہ رہے (اور حضرت کی صحبت فیض خود ہزاروں شغلوں سے بڑھکر ایک شغل تھا ہی) آخر دم تک خدمت میں حاضر رہے ان کو حضرت کے مزاج میں بہت دخل تھا اور بمقتضائے کرہمائے تو مارا کرد گستاخ بعض مواقع پر حضرت کے سامنے ایسی جرأت سے کلام کرتے تھے کہ حاضرین حیران رہجاتے تھے۔ مگر حضرت ان کے اس طرز سے مانوس تھے کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے اور مثل اولاد کے انپر شفقت رکھتے تھے۔ لیکن مناسب مواقع پر سختی سے تنبیہ و عتاب فرماتے تھے۔ لیکن بہر حالت میں سر تسلیم خم کئے ہوئے خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ایسے دیانتدار و جان نثار خادم بہت کم بزرگوں کو میسر آتے ہیں +

بوقت تحریر دیوبند میں مقیم ہیں۔ اور بعد الوفات حضرت کی بہترین خدمت سمجھکر تحریک خلافت اور اصلاح مسلمین میں خالصاً للہ مساعی جمیلہ دکھلا رہے ہیں۔ بڑے جوشیلے مسلمان اور قوی الایمان جوان ہیں۔ زاد اللہ تعالیٰ برکاتہم۔

مولوی حاجی وحید احمد صاحب مدنی۔ مولانا حسین احمد صاحب کے برادر معظم مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ اپنے خاندان کی ہجرت سے ایک سال قبل ہندوستان میں تولد ہوئے۔ اور ابتدائی کتابیں اپنے فاضل و محترم چچا مولانا حسین احمد صاحب سے پڑھیں ۱۳۳۱ھ میں جب مولانا حسین احمد صاحب ہندوستان تشریف لائے تو یہ بھی بغرض تحصیل علم ہمراہ آکر دار العلوم میں تحصیل علم کے لئے مقیم ہوئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت اور بزرگانہ شفقت سے بہرہ ور ہونے لگے۔ ناز پروردہ بچوں کی طرح حضرت انکی ہر بات مانتے اور انکے آرام و راحت کا نہایت درجہ خیال رکھتے۔ انکو بھی حضرت سے ایک خاص معتقدانہ اور مخلصانہ اُنس تھا کہ حضرت کی زیارت کے بدون صبر نہ آتا تھا۔ حضرت نے ارادہ حرمین شریفین فرمایا تو حضرت کی مفارقت کو شاق سمجھکر نیز حضرت کی راحت رسانی کے خیال سے اور اپنے وطن (مدینہ طیبہ) پہنچکر حضرت کا میزبان خادم بننے کے شوق میں معیت اختیار کی۔ اور اپنے مکان پر حق میزبانی و خدمت ادا کر کے بوقت واپسی چچا صاحب کی ہمراہ یہ بھی مکہ معظمہ تک حضرت کو پہنچانے آئے اور شریف صاحب کے حکم سے حضرت کی ہمراہ اسیر ہو کر جدہ بھیجے گئے۔

اور آخری دم تک ہمراہ رہکر رفاقت و خدمت کی سعادت حاصل کی اور نظر بندی کے زمانہ میں حضرت سے تحصیلِ علم بھی کرتے رہے۔ اور اشاعتِ دین بھی (جسکا حال آپ مالٹا کے ذکر میں ملاحظہ کرینگے) ترکی زبان اور کسی قدر انگریزی پہلے سے جانتے تھے۔ مالٹا میں رہکر مولوی نصرت حسین صاحب سے سیکھ کر اچھی مہارت حاصل کرلی۔ اور اُنکی وفات کے بعد اِنکی زباندانی سے حضرت کو سفر و اسیری یورپ میں بہت راحت پہنچی ❊

اس نوعمری میں مرشدِ کامل کی ایسی سچی محبت اور ثباتِ فی الدین انہیں کا حصہ ہے۔ بڑے بڑے خطرناک مواقع پر انکا قدم نہیں پھسلا اور بلا کسی خوف و رعب کے نہایت جرأت سے ہمیشہ کلمۃ الحق زبان سے نکلا۔ پانچ سال کی تکالیف و محن میں ان کو حضرت مولانا سے وہی نسبت ہے جو امتحانِ ذبح میں یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ کہنے والے قوی الایمان لڑکے کو بوڑھے باپ ابراہیم علیہ السلام سے تھی ❊ رہائی کے بعد ہمراہ ہندوستان آئے اور دنیا سے رخصت ہونے تک ہر وقت ہمراہ رہے۔ آجکل بادلِ مغموم دارالعلوم میں تحصیلِ علوم کرتے ہیں۔ زاد اللہ علمہم و ادام فضلہم ❊

مولوی حاجی چودہری حکیم نصرت حسین صاحب شہیدِ مالٹا۔ فتح پور ہسوہ (متصل کانپور) کے رہنے والے ایک معزز زمیندار کی حیثیت رکھنے والے دیندار مولوی تھے ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں کتابیں ختم کی تھیں اور اپنے وطن میں رہتے تھے ۱۳۳۴ھ میں حضرت مولانا کی روانگی سے ایک سال بعد اپنے خاندان کے چند اشخاص کی ہمراہ حج کو گئے تھے اور حضرت نے جو مدینہ منورہ سے واپس آکر ۱۳۳۴ھ میں دوسرا حج ادا فرمایا ہے اُسمیں یہ بھی شریک تھے۔ شریف صاحب ترکوں سے مخالف ہو چکے تھے اور مدینہ منورہ پر ترک قابض تھے۔ رستہ میں جنگ و جدل کا بازار گرم تھا۔ ان کے خاندان کے سب لوگ جب زیارتِ مدینہ سے مایوس ہوئے تو ہندوستان واپسی کا ارادہ کیا۔ اِن کے مقدر میں حضرت کی معیت کا شرف لکھا تھا۔ اور انکا جسدِ عنصری مالٹا کے سنسان گورِ غریبان کو لبیک کہہ رہا تھا۔ سب کو رخصت کر دیا اور آپ اس اُمید پر مکہ معظمہ ٹھیر گئے کہ شاید حاضری حرمِ مدینہ کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اپنے رفیقوں کو رخصت کرنے کے بعد یہ اپنے کرایہ کے مکان میں تنہا رہ گئے۔ حضرت مولانا بھی حج کے بعد مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ حضرت کو اپنے مخلصوں اور ارادتمندوں سے جو خاص مروّت و شفقت تھی اُسکے تقاضے سے حضرت نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ اُس مکان کو چھوڑ کر آپ بھی ہمارے پاس آ جائیں۔

چودہری صاحب کے لئے اس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی تھی بہت غنیمت سمجھا اور اپنا مکان چھوڑ کر حضرت کے رفقا میں شریک ہو گئے۔ ابھی تین ہی روز گذرے تھے کہ حضرت کی گرفتاری کا حکم پہنچا اور جس روز حکم کی تعمیل ہوئی یہ بھی ہمراہیوں میں محسوب ہو کر لا یشقی جلیسھم کے مصداق ہوئے اور حضرت کی ہمراہ حراست میں جدہ روانہ کر دیئے گئے +

مولوی صاحب نہایت ذکی ہوشیار دیندار۔ انگریزی داں قوی الایمان و راسخ القدم تھے مالٹا میں جان دیدی لیکن حضرت کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ حکام انگریزی نے بھی متعدد مرتبہ ان سے کہا کہ آپ پر کچھ جرم نہیں آپ ہندوستان جا سکتے ہیں۔ مگر ان کا یہی جواب تھا کہ سب رفیقوں کو رہا کیا جائے تو میں بھی جاؤں گا۔ بیماری میں کہا گیا اور خود حضرت مولانا نے بھی فرمایا کہ حکیم صاحب اگر آپ رضامند ہوں تو جانے کا انتظام کرا دیا جائے۔ مگر یہ وفادار مخلص کسیطرح اور کسی حال میں دوسروں کو اسیری میں چھوڑ کر وطن جانے پر راضی ہی نہ ہوئے۔ اور ہر موقع پر بلا خوف و خطر زبان سے کلمۃ الحق کہتے رہے دو سال کی نظر بندی کے بعد مالٹا کی شدتِ برودت سے متاثر ہو کر نزلہ و زکام میں مبتلا ہوئے۔ اور عرصہ تک مریض رہکر حضرت کے قدموں میں جاں بجہاں آفریں کو سپرد کر کے شہادتِ غربت حاصل کی اور مالٹا کے مقبرہ میں مدفون ہوئے (جسکا کچھ حال آئندہ مذکور ہوگا) زوجہ اور والدہ ضعیفہ اور صدیق حسن اور شبیر حسن دو بچے دہ سالہ و ہفت سالہ چھوڑے ہیں۔ خدا تعالیٰ انکی عمر میں برکت عطا فرماوے۔ اور چودہری صاحب کو حضرت کی معیت اور جنت و مغفرت نصیب فرماوے +

حضرت مولانا کی گرفتاری کی خبر ہندوستان میں مجمل طور سے مشہور ہو گئی تھی۔ کچھ تفصیل معلوم نہ تھی کہ کیا قصور ہے اور کس جگہ مقیم ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ نظر بند رہنے کے لئے ہندوستان آ رہے ہیں۔ کسی نے سُنا کہ رنگون بھیجدیئے گئے۔ کیونکہ جدہ سے یہ حضرات کوئی خط نہیں روانہ کر سکے جس سے کچھ حال معلوم ہوتا +

جدہ میں تقریباً پچیس ۲۵ دن گذارنیکے بعد عربی حکومت کے بدو سپاہیوں کی حراست میں بہاؤالدین انسپکٹر کی نگرانی میں جہاز میں سوار کئے گئے۔ اور انسپکٹر صاحب بھی سوار ہو کر ان مجرمانِ بےقصور کو

سویز کی طرف لیچلے - اس زمانہ میں برطانیہ اور جرمن کی آتش حرب نہایت مشتعل تھی اور جرمن کے جہازات اور آبدوز کشتیاں دشمن کے جہازات کو غرق کرنے کے لئے سمندر میں گشت لگاتی رہتی تھیں بنظر بند و نیکے جہاز کے کپتان نے ایک روز دشمن کا جہاز دیکھکر خطرہ محسوس کیا اور اپنے جہاز کو اُسکی زد پر دیکھکر ملاحت کا گمان کرکے مسافروں کو مطلع کیا اور چوبیس گھنٹے تک پانی میں تیرانے والی تختیاں سب کو تقسیم کرکے گلے میں ڈلوادیں اور کہدیا کہ میری دوسری اطلاع پر سب اسباب چھوڑکر دریا میں کود پڑنا سب لوگ زندگی سے مایوس اور مضطرب و پریشان ہوئے - حضرت مولانا اپنے استقلال سے بالکل اطمینانی حالت میں تھے اور آپکے اثر سے رُفقا بھی - سب اسباب چھوڑا لیکن کلام مجید کا عزیز از جان ناتمام ترجمہ محفوظ باندھکر مولوی عزیر گل صاحب کے گلے میں حمایل کیا اور حرمین شریفین کے بعض نہایت مخصوص و بیشقدر تبرکات اور قابلِ احترام چیزیں اپنے اور دیگر رفقاء کے گلے میں لٹکائیں باین اُمید کہ شاید کسی کو کسی طرح نجات ہو جائے اور یہ چیزیں ضائع ہونے سے بچ جائیں ✤

تھوڑی دیر کے بعد کپتان نے اطلاع دی کہ اب خطرہ رفع ہوگیا - دشمن جہاز نے دوربین سے دیکھا اور غیر مسلح اور غیر جنگی معمولی مسافروں کا جہاز معلوم کرکے چھوڑ گیا - سب کو اطمینان ہوا اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا - بندر پورٹ توفیق میں اُتر کر چوبیس گھنٹے قیام کیا اور وہاں سے قاہرہ کی طرف ریل میں روانہ ہوئے - قاہرہ کے متصل ایک چھوٹے قصبہ میں جسکو الجیزہ کہتے تھے اسیروں کے مکان میں ٹھیرائے گئے - ایک رات خیریت سے گذری مگر صبح آئی تو گویا صبح قیامت آئی ✤

صبح کو خاص محافظ آئے اور پنجتن کی روح رواں یعنی حضرت مولانا کو اپنی حراست میں لے کر چلے گئے - چاروں خادم لاچار و مجبور دیکھتے رہگئے - نہیں جانتے تھے کہ ہمارے آقا کو کہاں لئے جاتے ہیں اور کیا معاملہ کرینگے - لیکن بے دست و پا اسیر تھے کیا کر سکتے تھے - نہ کوئی خبر دینے والا نہ حال بتلانے والا عجیب ضیق کی حالت تھی - تمام دن اسی تشویش میں گذر گیا بعض محافظ انکی مضطربانہ حالت کو دیکھکر تسلی بھی دیتے تھے کہ حضرت کی جان پر کچھ خطرہ نہیں مطمئن رہو - مگر ایسی باتوں سے کہاں تسکین ہوتی تھی ✤

حضرت مولانا کو وہ محافظ افسروں کے سامنے آفس میں لیگئے اور بعزت بٹھلا کر نام نسب وطن وغیرہ دریافت کرنیکے بعد اظہار لینے شروع کئے - چھ گھنٹے اظہار لینے کے بعد اُسی مکان کے احاطہ میں لاکر

حضرت کو ایک تنہا کوٹھڑی میں مقید کر کے باہر سے قفل لگا دیا۔ حضرت کو اپنے رفیقوں کی طرف سے خطرہ ہو رہا تھا کہ جب میرا یہ حال ہے تو خدا جانے اُنپر کیا گذر رہی ہوگی۔ مگر وہ چاروں رفیق ابھی تک بحالِ خود یکجا تھے لیکن حضرت کی جدائی سے پریشان حال۔ اس محبس تنہائی میں ایک چارپائی اور نماز کی مختصر جگہ تھی اور ایک بالٹی تمام ضروریات کے لئے رکھی تھی اور برتن میں کسی قدر پانی۔ محافظ اور باورچی جنمیں بعض مسلمان بھی تھے کھانا لائے لیکن حضرت نے بالکل انکار کیا ✦

حضرت مولانا اسی حالت میں محبوس رہے اگلے روز مولوی حسین احمد صاحب کی باری آئی۔ اسی طرح محافظ حراست میں آفس بیلگئے اور سوال و جواب کئے اظہار لئے اور اُسکے بعد اُن کو بھی اسی قسم کی قید تنہائی میں محبوس کر کے سب رفقا سے علیحدہ کر دیا۔ اب کچھ قرائن سے اور کسی قدر بعض نرم دل محافظوں کی خبر سے ان سب رفیقوں کو معلوم ہوا اور مولانا حسین احمد صاحب کو خود اپنے حال پر قیاس کر کے یقین ہوا کہ حضرت بھی اسی قسم کے زندان میں مقید ہیں اب تو روزانہ یہی معمول ہو گیا کہ اِن رفیقوں میں سے ایک کو اظہار کے لئے لیجاتے اور واپسی پر قید تنہائی میں مقید کر دیتے۔ تیسرے روز مولوی وحید احمد صاحب کا نمبر آیا۔ چوتھے روز مولوی عزیر گل صاحب کا۔ اور غالباً ایک روز تعطیل کا چھوڑ کر چھٹے روز مولوی حکیم نصرت حسین صاحب کی باری آئی اور رفتہ رفتہ چھ روز میں سب حضرات بالکل علیحدہ علیحدہ ایک ہی قسم کے محبسوں میں بقید تنہائی مقید ہو گئے جہاں ادائے فرائض میں بھی دقت ہوتی تھی ✦

یہ وقت اِن خاصانِ خدا تعالیٰ کے سخت امتحان اور تکلیف کا تھا چھ روز تک ایک کو دوسرے کی صورت دیکھنا اور آواز سننا نصیب نہیں ہوا۔ جزع فزع گریہ و فریاد کا نام نہ تھا۔ لیکن قلوب بے چین اور مضطرب تھے۔ کھانے کیوقت ہر شخص کے محبس میں کھانا پہنچایا جاتا تھا۔ خدام نے کبھی کبھی بہ مقتضائے بشریت جوع و ضعف سے لاچار ہو کر بادلِ ناخواستہ ایک دو لقمہ وقت پر کھا لیا لیکن آفریں ہے اُس مظہرِ شفقت کو کہ بارہ وقت گذر گئے مگر خادموں کی جدائی میں ایک دانہ نہ کھایا۔ یہ کوئی مقاطعۂ جوعی نہ تھا جو شرعاً ناجائز سمجھا جاتا ہے بلکہ شدتِ کلفت اور فراقِ احباب و مخلصین میں طعام کی طرف رغبت نہ ہونا حضرت کا اقتضاء طبعی تھا۔ نیز یہ خیال کہ خدا جانے رفیقوں کو کھانا ملا یا نہیں اور وہ کس مصیبت میں ہونگے۔ مقتضاء مروت و حسن رفاقت

بھی تھا) اُسی احاطہ میں بعض دیگر اسیر بھی تھے۔ جو اس طرح مقفل کوٹھڑیوں میں مقید نہ تھے
اُنھوں نے کسی ترکیب سے مولانا کے مجلس تک پہنچکر نیز مسلمان ملازم اور محافظوں نے ہر چند ادب سے
بقسم عرض کیا کہ اس کھانے میں کوئی چیز ناجائز نہیں ہے اور آپکے ہمراہی بخیریت ہیں کھانا پہنچا دیا
جاتا ہے مگر حضرت کسی کی نہ سنتے تھے۔ مونس حقیقی سے دل لگائے ہوئے باطمینان خاطر بیٹھے رہتے تھے
اور اُس ظلمت کدہ کو ذکر اللہ سے منور رکھتے تھے۔ دیگر حضرات بھی اپنے اپنے زندان میں حسب استعداد
ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے +

چھ روز تک حضرت نے ایک لقمہ نہیں کھایا البتہ رفیقوں کو جسوقت سے آپکے اسطرح قید تنہائی
میں مقید ہونے کا پتہ ملگیا تھا پان کے ٹکڑے بناکر کسی محافظ یا بالٹی بردار کے ذریعہ سے حضرت کے
پاس پہنچا دیتے تھے۔ اور جب سب رفیق محبوس ہوگئے تو مولانا حسین احمد صاحب اپنے زندان ہی میں سے
بہ تدبیر شایستہ یہ خدمت ادا کرتے رہتے تھے +

جب افسروں نے حضرت کی یہ حالت دیکھی تو چھ روز کے بعد بہ مجبوری دن کو دس گیارہ بجے
کے وقت ان بچھڑے ہوئے رفیقوں کو کھانے کے وقت جمع کر دیا اور سات دن کے بعد وہ خادم
جنکے بدن میں خون خشک ہو رہے تھے کہ دیکھئے مخدوم کا کیا حال ہوگا اپنے آقا کی زیارت کرکے
مسرور ہوئے اور حضرت اُن کو دیکھکر مطمئن۔ پھر سب نے جمع ہوکر کھانا کھاکر حق تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا
پھر تو روزانہ یہی معمول ہوگیا کہ دن کو ایک گھنٹہ کے لئے اِن سب کو جمع ہوکر کھانا کھانے اور صاف
ہوا میں دم لینے یا دھوپ میں بیٹھنے کے واسطے محبسوں سے باہر نکال لایا جاتا اور پھر ہر ایک کو اُس کے
محبس میں پہنچا دیا جاتا۔

یہ ایام تھے محنت و تکلیف کے اور اظہار ثبات و استقلال کے۔ حضرت مولانا کے اظہار ہوئے
جنکے دل میں ہیبت حق جاگزین ہو وہ کسی دوسرے کیا مرعوب ہوسکتا ہے۔ بڑے بڑے افسروں کے
مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جواب ایسی لاپروائی اور بے تکلفی سے دیئے کہ گویا کسی بہت ادنیٰ شخص
کو نہایت معمولی بات کا جواب دے رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت کے بعد رفیقوں کے اظہار
ہوئے اور اسی طرح سات روز تک اظہاروں کا سلسلہ جاری رہا۔ خیالات، تعلقات، حالات،
وواقعات کے متعلق سوالات ہوتے تھے۔ حضرت مولانا کی تاثیر صحبت تھی کہ ہر شخص سلف صالحین کا

نمونہ بنا ہوا تھا۔ پائے ثبات کو ذرا لغزش نہ ہوتی تھی۔ نہ جان کا خوف تھا نہ قید تنہائی کا خیال جو بات منہ سے نکلتی تھی حق اور جو جواب دیتے تھے سچا۔ افسروں نے ایسے شیر آنکھوں سے دیکھے تھے نہ کانوں سے سنے۔ ان نفوس متبرکہ نے یورپ کو دکھلا دیا کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں ؞

مولوی حکیم نصرت حسین صاحب کے اظہار لینے کے بعد اُن کو بھی حضرت مولانا کے محبس میں شریک کردیا تاکہ اُن کی خدمت سے حضرت کو راحت پہنچے۔ حضرت خود فرماتے تھے کہ "مولوی نصرت حسین صاحب نے کبھی خلاف حق اور پچ کر بات نہیں کی لیکن انگریزی جانتے تھے ہوشیار شخص تھے ایسے طرز سے گفتگو کرتے تھے کہ افسر ذرا خوش ہو جاتے تھے اور متوقع رہتے تھے کہ ہمارے مفید مدعا کوئی بات انکے منہ سے نکلے گی" ؞

فرماتے تھے کہ اُن کے اظہاروں کے بعد اُن سے میری شکایت کی کہ "تمہارے شیخ نے ہماری بات کا سیدھے مُنہ جواب نہیں دیا" مولوی صاحب نے کہا کہ اُن کی عادت ہی ایسی بے پروائی کی ہے اور کچھ زبان نہ سمجھنے سے آپکو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اسکے بعد مجھ پر احسان کیا اور میرے ضعف کو دیکھکر مولوی صاحب کو میرے کمرے میں شریک کر دیا کہ شیخ کو انکی رفاقت سے راحت ملیگی۔ مگر میں سمجھ گیا کہ مطلب سعدی دیگر است (حضرت کو افسروں کی ہمدردی کا یقین نہیں آیا۔ وہ خیال فرماتے تھے کہ کہ مولوی صاحب کو میرے پاس اسلئے رکھا کہ شاید وہ اپنے خیالات سے مجھے متاثر کرکے میرے خیالات کی سختی کو کچھ کم کر دیں[۱]۔ کیونکہ افسران تفتیش کو مولوی صاحب اپنے الفاظ سے خوش کر دیتے تھے) ؞

لطیفہ:۔ انہیں اظہارات کے سلسلہ میں ایک روز حضرت سے ایک افسر کی طرف سے ایک انگریز ترجمان نے (جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اور اُردو دانی میں مشہور تھا) کہا کہ "افسر آپکے فائدہ ہونیکا مقام پوچھتا ہے"۔ حضرت کچھ نہ سمجھے۔ پھر اُسنے یہی کہا حضرت حیران تھے کہ کیا کہتا ہے سوال سمجھنے کا عذر کیا۔ مترجم بھی عدم قدرت کی وجہ سے لاچار ہوا مگر بار بار عبارت کو بدل کر آخر یہ کہا کہ افسر کہتا ہے کہ "یعنی آپ کہاں فائدا ہوا"۔ مولانا نے بے اختیار تبسم فرماکر کہا کہ "میں بریلی میں پیدا ہوا"۔

اظہارات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی حالت بدستور رہی اور یہ طائفہ صالحہ اپنی قید تنہائی کو مشاغل حسنہ میں گذارتا رہا۔ علاوہ معمولی عبادات کے کسی نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کر دیا۔

---

[۱] افسروں کی غلط فہمی تھی نہ مولوی صاحب ایسا ارادہ کر سکتے تھے نہ حضرت کسی کے خیالات سے متاثر ہو سکتے تھے ۱۲ ؞

کسی نے حصن حصین اور حزب البحر کے اوراد شروع کر دئے۔ کسی نے آیت کریمہ وظیفۂ یونس علیہ السلام اور تسبیح و تہلیل کا شغل کیا۔ ان تکالیف و عبادات سے ان حضرات کی روحانی نورانیت اور ترقی درجات میں دمبدم ایسا اضافہ ہوتا رہتا تھا کہ ہ توں کی ریاضت میں بھی بہ مشکل نصیب ہوتا ہے۔ سچ ہے

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد ✤

ہندوستان میں اب تک حضرت کا حال مشتبہ چلا آتا تھا کوئی یقینی بات معلوم نہ ہوتی تھی الجیزہ (متعلقات قاہرہ) سے انہیں ایام شدائد کا لکھا ہوا سب سے پہلا خط ہندوستان میں مولانا حسین احمد صاحب کا آیا۔ اور پھر حضرت کا۔ ان خطوط میں خاص تکالیف کا اشارہ بھی نہ تھا اسلئے تحقیق حال ہو جانے سے تمام متعلقین و متوسلین کو گونہ خوشی بھی ہوئی اور آپکی اسیری کے یقین اور دوری کے احساس سے انتہائی صدمہ بھی ہوا۔ تاہم حضرت کے تسلّی آمیز فقروں سے بہت کچھ ڈھارس بندھتی تھی اسکے بعد حضرت کے رفیقوں کے خطوط بھی ہندوستان آتے رہے اور معمولی خیریت معلوم ہوتی رہی ✤

اس تکلیف میں ایک ماہ گذارنیکے بعد اس جماعت مقدسہ کو قاہرہ سے مالٹا منتقل کیا گیا (جو بقول حضرت مولانا گویا نظر بندوں کا ہائی کورٹ ہے کہ بڑے سنگین مجرم اور سیاسی نظر بند وہاں رکھے جاتے ہیں) اور قید تنہائی سے آزاد ہو کر وہاں بہت کچھ راحت و آرام ملا۔ اور مولوی وحید احمد صاحب کیلئے تو اپنی ہوشیاری اور نو عمری کی تیزی کی وجہ سے ہر محکمہ ہر آفس ہر دوکان میں دخل تھا۔ ہر محافظ اُن کا مطیع تھا۔ اور حضرت کی برکت سے ہر افسر اُن کا لحاظ اور رعایت کرتا تھا بقول شخصے۔ ان کی تو وہاں سلطنت تھی۔ اسیری نہ تھی[1] ✤

—— ✤ ——

[1] یہ بھی ایک دل بہلانے کی بات ہے۔ ورنہ قید قید ہی ہے۔ جو مصائب زمانۂ اسیری میں ان حضرات پر واقع ہوئے وہ دل ہلا دینے والے ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب کے حالات میں کسی قدر مذکور ہوئے۔ ۱۲ ✤

مالٹا کے حالات اور زمانۂ اسیری کے واقعات

اہلِ ہندوستان کے لئے مالٹا ایک ایسا غیر مانوس مقام اور گمنام شہر تھا کہ ہزارہا اہلِ ہند نے کبھی اُسکا نام بھی نہ سُنا تھا۔ خدا تعالیٰ کے نامحدود عجائبات قدرت میں سے یہ بھی ہی کہ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو چند روز کے لئے دنیا میں بھیجدیا تھا ایسے ہی ترقی درجات کے لئے حضرت مولانا کو نظر بند کرا کر وہاں پہنچایا۔ اور اسیرِ مالٹا کے فرطِ اعتقاد کی وجہ سے ہر شخص کی زبان پر مالٹا کا نام آنے لگا +

مالٹا ایک مختصر جزیرہ اور جہازوں کا بندرگاہ ہے۔ عرصہ دراز تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا ہے اور دوسری غیر اسلامی سلطنتوں کے تصرف میں رہنے کے بعد گورنمنٹ انگریزی کے مقبوضات میں شمار ہوتا ہے۔ تمام جزیرہ مالٹا کے نام سے مشہور ہے جسمیں بہت سے شہر اور قصبے اور دیہات ہیں۔ سب سے بڑا شہر اور جزیرہ کا دار الحکومت مقام والیٹہ ہے۔ خاص شہر مالٹا سمندر سے نہایت قریب اور جہازوں کا بندرگاہ اور نہایت خوبصورت مقام ہے۔ شہر کے اطراف میں سبزہ زار اور آبِ رواں کے چشمے اور عمدہ تفرج گاہیں موجود ہیں۔ شہر نہایت آباد ہے اور بہت سے قابلِ دید عمدہ مکانات پر مشتمل ہی۔ اور عام طور سے نہایت صفائی اور رونق نظر آتی ہے۔ ایک طرف سمندر لہریں مار رہا ہے اور بندرگاہ پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے اور اموالِ تجارت اُتارنے اور بار کرنے کے لئے گودی بنی ہوئی ہے۔

یہاں ایک نہایت مستحکم اور وسیع قلعہ ہی جسکا بڑا حصّہ مسمی ورڈالہ ترکوں کا بنایا ہوا ہے اور دیگر حصے گورنمنٹ انگریزی کے تیار کئے ہوئے ہیں۔ یا دوسری سلطنتوں کے تصرفات ہیں۔ اپنے جزو اعظم و قدیم کے نام سے یہ تمام قلعہ وارڈالا مشہور ہے سلطنتِ انگریزی نے اِس مقام کو معززدرجہ کے اسیرانِ جنگ اور سیاسی نظربندوں کے لئے نہایت مناسب خیال کیا ہے۔ کیونکہ اسیر اگر کسی طرح قلعہ سے نکل بھی جائے تو سمندر اُسکے لئے سدِّ راہ موجود ہے +

اِس قلعہ کو گورنمنٹ نے اسیروں کے لئے مختلف حصّوں پر تقسیم کرکے ہر ایک حصّہ کو مستقل محفوظ کمپ بنا دیا ہے۔ اور ہر حصّہ کا علیحدہ نام ہے۔ کوئی حصّہ سینٹ کلیمنٹ کے نام سے مشہور ہے

کوئی بلغار کیمپ ہے کسی کو ترک کیمپ کہتے ہیں کسی کو گریک کیمپ - ہر ایک کیمپ میں گوروں کا نہایت سخت وسنگین پہرہ رہتا تھا - صرف دس بجے سے بارہ بجے تک ایک کیمپ سے دوسرے میں جاکر نظر بند لوگ باہم ملاقات کر سکتے تھے - البتہ ایک کیمپ کے اسیر باہم ایک دوسرے سے بلا تکلف بلا کسی قید اور پابندی کے مل سکتے تھے - پھر قلعہ کے دروازہ پر سخت گارد متعین تھا کہ بلا خاص احکامات اور بدون افسروں کی اجازت کے کوئی اسیر کسی ضرورت سے قلعہ سے باہر شہر میں یا اور کسی جگہ نہیں جا سکتا تھا - قلعہ میں اسیروں کے لئے ہر قسم کی ضروریات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر مہیا کیگئی ہیں اور ہر ایک کیمپ میں کافی مکانات بنے ہوئے ہیں +

حضرت مولانا جیسی بے لوث مقدس ہستی کو اسیر کرنے کی شکایت بجائے خود رہی لیکن گورنمنٹ کی یہ جوہر شناسی قابل داد ہے کہ اُسنے حضرت کا اعزاز ہر موقع پر ملحوظ رکھا اور نظر بندی کیلئے بھی اپنے خیال میں بہترین (محفوظ ترین!) جگہ تجویز کی - اگر وہ ایسا نکرتی تو حضرت کی شان میں کچھ نقصان نہیں آسکتا تھا - لیکن گورنمنٹ کی مردم شناسی کے خلاف ہوتا اور جیسے بہت سے امور میں گورنمنٹ کے ترکِ واجبات پر ہم بجز خاموشی کے کچھ نہیں کر سکتے یہاں بھی یہی کرنا پڑتا +

یہ پنجتن جہاز سے اُتر کر قلعہ میں پہنچائے گئے اور ردکیٹ کیمپ کے ایک مکان میں ٹھیرائے گئے جو کافی تھا مگر زیادہ آرام دہ نہ تھا - اِن حضرات کی عظمت اور امتحانِ فی سبیل اللہ نے انکے پہنچنے سے پہلے ہی قلعہ مالٹا میں انکی شہرت کردی تھی - اور صدہا اسیرانِ حرب (جنمیں معزز ترکی افسر اور شامی اور عربی لوگ اور جرمنی افسر بھی تھے) اِن خیار عباد اللہ کے نادیدہ مشتاق ہو رہے تھے - سب نے حسب موقع زیارت کی اور ان کے طہارت وتقدس کو دیکھکر حیران رہگئے +

ان حضرات کے پاس جو کچھ سرمایہ اور سفرخرچ زیارتِ حرمین شریفین کے بعد باقی رہگیا تھا وہ بوقتِ اسیری محافظ افسروں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا - اور سرکاری وظیفہ کے علاوہ بوقت ضرورت اُس میں سے قلیل قلیل دیدیا جاتا تھا - سلطنتِ عثمانیہ کے معزز افسر میجر حسن عزت بے اور تحصیلدار انوری بے اسی قلعہ میں اسیر تھے اور اسلامی تعلق وہمدردی کے علاوہ اِن حضرات کی سیرتِ حسنہ خصوصاً حضرت مولانا کے تقدس کو دیکھکر پہلی ہی ملاقات میں مخلص بنچکے تھے - وہ اس

قاعدہ سے واقف تھے سمجھتے تھے کہ ابتدا میں حضرت کو اپنے مصارف میں تنگی پیش آئیگی اُنہوں نے کہلا بھیجا کہ جسقدر روپیہ کی ضرورت ہو آپ مجھسے منگالیں۔ انسان کا اخلاص چھپا نہیں رہتا۔ خصوصًا ایسے اہل بصیرت حضرات پر۔ حضرت نے تکلف نہیں کیا اور ایک مرتبہ چھ اور ایک دفعہ گیارہ پونڈ طلب فرمائے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ادائے قرض کی ضرورت ظاہر کر کے محافظین کے پاس سے اپنے سرمایہ میں سے روپیہ وصول کیا اور اُن صاحبوں کے پاس سے جسقدر رقم لیا تھا پہنچا دیا +

حضرت مولانا زمانہ نظربندی میں اکثر توجہ الی اللہ میں خاموش رہتے یا تسبیح و ذکر اللہ میں مشغول۔ مولوی وحید احمد صاحب کو مشکوٰۃ شریف کا کسی قدر سبق پڑھاتے اور قرآن مجید کا ترجمہ تحریر فرماتے تھے۔ اور باجماعت نماز کے لئے ایک کمرہ بطور مسجد مخصوص کر لیا تھا جسمیں یہ حضرات بھی نماز پڑھتے اور دوسرے اسیر بھی اپنی قیامگاہ سے آکر جماعت میں شریک ہو جاتے کیونکہ ہر کیمپ کے احاطہ کے اندر اسیروں کو کسی جگہ آمدورفت کی ممانعت نہ تھی +

کھانے کے واسطے نان پاؤ کے مشابہ تندور کی پکی ہوئی روٹی ملتی تھی اور ترکاری وغیرہ دیگر مصارف کے لئے سات شلنگ (۷؍) روزانہ سب رُفقا کے لئے ملتے تھے اور چونکہ اپنے محفوظ سرمایہ میں سے بھی بقدر ضرورت لے سکتے تھے اسلئے مصارف میں دقت پیش نہیں آئی۔ نومبر ۱۹۱۷ء (ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ) میں حضرت کی رہائی کی درخواست لیکر دار العلوم دیوبند کے وفد کے پیش ہونے کے بعد لفٹننٹ گورنر صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری برلن صاحب حضرت کی خدمت میں پہنچے۔ اگرچہ اُن کے سامنے بھی حضرت کی زبان سے کوئی نرمی اور توریہ تقیہ کا لفظ نہیں نکلا اور وہ حضرت کی استقامت فی الدین کو خوب سمجھ گئے تھے۔ تاہم اونکی سفارش پر حضرت کے لئے پہلے سے بہتر مکان تبدیل کر دیا گیا۔ اور وظیفہ مجموعی سب رُفقا کا روزانہ نو شلنگ ہو گیا۔ اس مکان میں ہر قسم کی راحت تھی اور صحن اسقدر تھا کہ دن کو دھوپ میں آرام سے بیٹھتے تھے۔ اور مختصر کیاریاں بناکر مولوی وحید احمد صاحب نے اپنی دلچسپی کے لئے خوشبو دار چیزیں مرچیں۔ کشنیز۔ پودینہ اور ٹماٹر وغیرہ بعض ترکاریاں لگائی تھیں +

مالٹا میں گائے بکری دُنبہ نہیں ہے اسلئے گوشت نایاب ہے لیکن اہل یورپ چونکہ گوشت کو

انسان کی زندگی کے لئے نہایت ضروری چیز خیال کرتے ہیں۔ اسلئے دُور دُور سے گوشت مہیا کر کے طبی قاعدہ سے برف وغیرہ میں دبا کر مدتوں رکھا جاتا ہے۔ اور اسیرانِ جنگ اور دیگر معزز اسیروں کو بمقدار قلیل روزانہ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ گوشت چونکہ باقاعدہ ذبیحہ نہ ہوتا تھا بلکہ منخنقہ (گلا گھونٹا ہوا) یا جھٹکا ہوتا تھا۔ اسلئے حضرت مولانا نے اسکے کھانے سے احتراز فرمایا اور با وجود رغبت لحم کے مدتوں گوشت کا نام بھی نہ جانا۔ ترکی اور شامی اسیر جنمیں بعض بہت اچھے عالم بھی تھے برابر اس گوشت کا استعمال کرتے تھے۔ بعض ان میں سے یہ کہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ حلال ہے خواہ کسی طرح ذبح کریں اور بعض عالم تاویل کرتے تھے کہ گوشت کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ اور اسکے سوا دوسرا یہاں میسر نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم مضطر ہیں اور یہ لحم ہمارے لئے حلال ہے۔ مگر حضرت شیخ الہند اور اُن کے رُفقا نے دِکھلا دیا کہ ضعیف اور قوی لڑکا اور نوجوان ہر شخص بلا گوشت زندہ رہ سکتا ہے۔ اور رضائے مولیٰ کے لئے لذّات کو اسطرح چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ حضرت کے اس ورع و اتقا کا تمام مسلمانوں پر اثر پڑا اور رفتہ رفتہ سب علما اور اکثر عوام نے وہ لحم مقتولِ نصاریٰ کھانا چھوڑ دیا۔ اور سب حضرات نے بلا گوشت گذارہ کیا۔ چنانچہ مولانا حسین احمد صاحب نے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ "قد شابهنا الجوگیة بترك اللحم والسمن" (یعنی گوشت اور گھی چھوڑ دینے میں ہم ہندوستان کے جوگیوں سے مشابہ ہو گئے ہیں)

اسکے بعد مولوی وحید احمد صاحب نے زندہ خرگوش خریدنا چاہا۔ مگر محافظین نے (جو تمام فرمائشیں اِن حضرات کی شہر کے بازار میں سے خرید کر لا دیا کرتے تھے) کہا کہ ہم ذبح کر کے لا دیں گے اُنہوں نے فرمایا کہ پھر ہمکو کیا حاصل ہوا تمھارے ذبیحہ کے لحم کا بہت ذخیرہ قلعہ میں موجود ہے ہم تو اپنا ذبیحہ کھانا چاہتے ہیں۔ لیکن محافظ وہاں کے قواعد سے مجبور تھے کہ کوئی زندہ جانور قلعہ میں اسیروں کے پاس جانے کی اجازت ہی نہ تھی۔ لیکن چونکہ اس جماعت کی سلامت روی اور مذہبی پختگی کو وہ لوگ خوب تجربہ کر چکے تھے کسیقدر انکار کے بعد افسروں کی رضامندی سے زندہ خرگوش لا کر دینے پر رضامند ہو گئے۔ اور حسب موقع بار بار خرید کر لا دیتے۔ اور یہ حضرات اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے کھاتے تھے اس طرح تین سال کے عرصہ میں صدہا خرگوش کام آئے اور ومن یتق اللہ[1]

---

[1] جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسکے لئے کوئی رستہ نکال ہی دیتے ہیں اور اُسکو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتے ہیں کہ اُسکے وہم دگمان میں بھی نہیں ہوتا ہے +

یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب کا وعدہ نہایت خوبی سے پورا ہوا۔ خدا تعالیٰ نے گوشت بھی نصیب فرمایا اور پابندیٔ مذہب بھی برقرار رہی۔ پھر ہندوستان سے بھی بعض صاحبوں نے کسیقدر خشک گوشت روانہ فرمایا +

حضرت مولانا کے بعض خدام ہندوستان سے دال چاول چار وغیرہ بھیجتے رہی۔ چنانچہ حضرت ایک خط میں باوجود نظر بندی کی کلفت کے اپنی طبعی لطافت سے فرماتے ہیں۔

"پرسوں دو پارسل پہنچے جنمیں ماش کی دال تھی۔ مولوی وحید احمد نے کھچڑی پکائی بہت اچھی رہی سب نے شوق سے کھائی دال بہت اچھی ہی خوب گل جاتی ہی ہمکو خیال تھا کہ دیکھئے گلے گی یا نہیں اللہ کی قدرت دیکھئے کہ ہندیوں کی دال اور مالٹا میں گل جائے۔"

گھی کی جگہ روغن زیتون استعمال کیا جاتا تھا جو حضرت مولانا کو ہندوستان کے گھی کی بہ نسبت بہت ہی مرغوب تھا۔ گوشت میں ڈالا جاتا۔ کبھی پلاؤ پکتا تو وہ اسی سے داغ کیا جاتا سالن کی کام آتا۔ بدن پر ملنے اور کان ناک میں لگانے کے لئے ہر وقت موجود رہتا +

بہت سے دوسرے ممالک کے اسیر بوجہ حسن عقیدت آجاتے تھے اور برتن دھونا اور کوئلہ جلانا اس قسم کے کام بہت شوق و رغبت سے کرتے تھے۔ البتہ میر مطبخ کی حیثیت سے چمچہ ہاتھ میں لیکر کبھی مولانا حسین احمد صاحب نگرانی کرتے تھے کبھی دوسرے رفیق۔ حضرت اپنے سب رفیقوں کے ساتھ مسنون طریق سے دستر خوان پر کھانا تناول فرماتے اور کام کرنے والے لوگ جو موقع اور وقت پر موجود ہوتے برادرانہ طور سے شریک طعام کر لیے جاتے تھے اور حسب اتفاق کبھی کسی شناسا و متعارف شخص کی دعوت بھی کر دی جاتی تھی اور مولوی وحید احمد صاحب اپنے ہندوستانی کھانوں کی صنعت دکھلا دیتے تھے۔ اور حضرت شیخ الہند کا دستر خوان جیسے وطن میں کشادہ رہتا تھا غربت و نظر بندی میں بھی خدا تعالیٰ نے وسیع ہی رکھا اور اکثر اوقات میں کوئی صورت تنگی کی پیش نہ آنے دی +

تقریباً چھ ماہ قیام کے بعد مالٹا میں عید الضحیٰ کا زمانہ آیا۔ قربانی مسافر ہی پر واجب نہیں ہے پھر جو شخص اسیری کے مصائب میں گرفتار ہو اُس پر کیسے واجب ہو سکتی ہی۔ مگر حضرت چونکہ ہندوستان میں کئی کئی قربانیاں کیا کرتے تھے۔ لہذا آپ نے شعائر اللہ کی اقامت کرنے کے لئے اس مستحب کو بھی

چھوڑنا گوارا نہ فرمایا۔ محافظوں سے اطلاع کی گئی اور افسروں سے اجازت لیگئی کہ یہ سنّتِ ابراہیمی ہمارا مذہبی حکم ہے کوشش کر کے اُضحیہ (قربانی) مہیا کیجائے اور ذبح کی اجازت دیجائے۔ سچی بات دل میں اُتر جاتی ہے اور للہیت کا اثر پڑتا ہے محافظ اور افسر سب مان گئے اور نہایت سعی و جستجو سے ایک دُنبہ سات گنی کو خرید کر لایا گیا۔ قیمت حضرت نے بطیبِ قلب ادا فرمائی اور اُس دارالکفر میں جہاں زوالِ سلطنتِ اسلامیہ کے بعد کبھی اس سنتِ ابراہیمی کے ادا ہونے کی نوبت نہ آئی ہوگی دسویں ذی الحجہ کو بلند آواز سے تکبیر کہکر قربانی کر کے واضح کر دیا کہ علوِ ہمت ہو تو زندان میں مستحبات بھی ادا ہو سکتے ہیں ؛

دارالحرب ہونیکے علاوہ چونکہ قلعہ میں آمدرفت کا اذن عام نہ تھا (بلکہ سخت حراست وحفاظت تھی) اور ادائے جمعہ وعیدین کے لئے اذنِ عام شرط ہے لہذا حضرت مولانا عیدین اور جمعہ ادا نہیں فرماتے تھے۔ اور بعض ممالک کے اسیر صرف عیدین پڑھتے تھے اور بعض لوگ عیدین اور جمعہ دونوں ادا کرتے تھے۔ حکم شرعی سے متنبہ ہو کر بعض علمائے آپکا اتباع کر لیا اور بعض بدستور پڑھتے رہے ؛

یورپ کی سردی ہندوستان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مالٹا میں بعض موسموں میں بہت سخت سردی پڑتی تھی۔ ابتدائی قیام میں حضرت مولانا کو انہیں سرد ایام میں سرد پانی سے وضو کرنیکی تکلیف برداشت کرنی پڑی لیکن کبھی معمولات میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ اُسکے بعد حق تعالیٰ نے سامانِ راحت پیدا فرما دیئے اور گرم پانی ہر وقت میسر ہونے لگا ؛

ظاہری اسباب کے موافق چونکہ ایسے شیخ کامل کا مالٹا کے قلعہ میں پہنچنا بعید از قیاس تھا اسلئے حق تعالیٰ نے بصورتِ نظر بندی آپکو وہاں پہنچا کر دور دراز کے خوش نصیب لوگوں کے لئے ذریعۂ ہدایت اور سببِ وصول الی اللہ بنایا۔ اور ایسی جگہ مقیم کرایا کہ دوسرے اسیر آزادی سے ساتھ آپ سے ملکر استفادہ کر سکیں۔ قلعہ میں طرابلس و مصر و روم و شام کے جنگی اسیر اور سیاسی نظر بند تھے۔ اس مقدس جماعت نمونۂ اصحاب کو استعجاب کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ مذہب کا کسقدر احترام کرنے والے اور احکام خداوندی کو عسر و یسر میں یکساں بجالانے والے لوگ ہیں۔ یہ حضرات پابندی کے ساتھ اُسی ایک کمرے میں جسکو بطور مسجد مخصوص کر لیا تھا

پنجوقتہ باقاعدہ باجماعت نماز ادا فرماتے۔ بہت سے دیندار مسلمان اسیر جماعت میں شریک ہوجاتے اور جرمنی عیسائی وغیرہ جنکو اس قسم کی عبادت دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا حیرت سے کہتے تھے کہ "یہ لوگ اپنے خدا سے باتیں کر رہے ہیں"۔

مسلم و غیر مسلم ہر شخص اعتقاد کی نظر سے دیکھتا تھا اور تمام اہلِ قلعہ میں حضرت بجا طور پر ایک قطبِ زمانہ شمار ہوتے تھے بڑے بڑے ترکی افسر اور شامی لوگ بفرطِ عقیدت خدمت میں حاضر ہوکر انفاسِ متبرکہ سے فیض حاصل کرتے اور بہت سے لوگ سلسلۂ بیعت میں باصرار داخل ہوتے اور راہِ مستقیم پاتے۔ اور بہت سے معزز لوگ اور مشہور سپہ سالار انور بے کے بوڑھے والد ماجد ایسے مخلص و معتقد ہوگئے تھے کہ گویا پرانے رفیق و خادم ہیں۔

اسیروں میں جو لوگ اہلِ علم تھے اور اپنے مقام پر مرجع و معتمد سمجھے جاتے تھے اُن میں سے بعض حضرات حضرت مولانا کے رفیقوں سے مفصل تحقیق و گفتگو کر کے مسائل و عقائد و علوم میں اپنے شبہات دور کرتے اور کبھی کبھی حضرت مولانا سے باادب گفتگو کر کے تشفی حاصل کرتے۔ اور حضرت ہی کی تحقیق پر عامل و معتقد ہوتے۔ ذبیحہ نصاریٰ اور مالٹا کے گوشت کے متعلق حضرت کا قول و عمل دیکھکر صدہا لوگوں نے وہاں کے گوشت سے احتراز کیا۔ اور مسئلہ حق پر عامل ہوئے۔ فوٹو کے متعلق اُن میں سے بعض علما کا خیال تھا کہ چونکہ تصویر کشی اسمیں نہیں ہے اسلئے جائز ہے لیکن حضرت کا ارشاد اور مولانا حسین احمد صاحب کی تقریر سنکر اکثر لوگ عدمِ جواز کے قائل ہوگئے۔ اُن میں جو لوگ حضرت سے درخواست کرتے تھے کہ آپ اپنا فوٹو اُتارنے کی اجازت دیں وہ حضرت کا عذرِ شرعی سُنکر خاموش ہوگئے۔

حسنِ اتفاق دیکھئے اُسی قلعہ میں ایک نہایت بزرگ عالم سلانیک کے مفتی اعظم مولانا فخر الدین آفندی بھی اسیر تھے اور حضرت سے باادب و عقیدت ملتے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اُن سے کسی قدر ترکی زبان سیکھی اور اس سے بڑھکر عجیب اتفاق دیکھئے کہ خاص قسطنطنیہ کے مفتی صاحب نہایت بوڑھے عالم بھی وہیں اسیر ہوئے جو ترکی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے۔ حضرت کی خدمت میں آمدورفت شروع کی اور یہ معلوم کر کے اُن کو بہت ہی مسرت ہوئی کہ شیخ الہند بھی ترجمہ کرنیکی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ استفادہ کرتے۔ حضرت کے مضامین و تحقیقات سے محظوظ ہوتے معتقدانہ حاضر رہتے۔ حضرت کے پاس ایک مطبوعہ قرآن مجید چار ترجموں کا تھا جنہیں دو ترجمے

فارسی کے تھے اُسکے مطالعہ کا شوق ظاہر کیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ " اول تو ہم نے اُن کے شوق کا اندازہ کرنا چاہا اُن کی نذر نہیں کیا۔ ہر روز لیجاتے اور چند گھنٹے مطالعہ کرکے واپس دیجاتے جب معلوم ہوا کہ واقعی قدرداں اور شائق ہیں اور اسکے اہل۔ اور یہ بھی خیال کیا کہ ان کو ترجمہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ ہمارا ترجمہ تو ختم ہو ہی گیا ہے۔ اگر ضرورت ہی پڑی تو ہندوستان پہنچکر ایسا ہی اَور خرید لیں گے۔ وہ کلام مجید مفتی صاحب ہی کو دیدیا نہایت مسرور ہوئے ؛

مولوی وحید احمد صاحب مدنی مغرب کے بعد چراغ جلاکر مشکوٰۃ شریف لیکر صحن میں بیٹھتے اور کمپ کے مسلمان اسیر انکے گرد جمع ہو جاتے۔ مولویصاحب اُن کو احکامِ شرعیہ اور دابِ مذہبی کی حدیث سناکر تعلیم کرتے اور ہر شخص کو اُسکی زبان (عربی فارسی ترکی) میں سمجھاکر ذہن نشین کرادیتے ؛

بہرحال قلعہ مالٹا کے ذریعہ سے حضرت کے ظاہری باطنی فیوض اُن دُور دست ممالک تک پہنچ گئے جہاں اور کوئی صورت ہی خیال میں آتی تھی اور ممالک بعیدہ کے اسقدر لوگ حلقۂ ارادت و اخلاص میں داخل ہوئے کہ شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوئے ہوں ؛

دو ترکی افسر قلعۂ مالٹا میں نظربند تھے۔ ایک طرابلس الغرب کے باشندے تھے حاجی علی اور دوسرے خاص ترکی۔ آنکا نام ڈاکٹر سعدی تھا۔ باہم کسی امر میں نزاع ہوا اور حاجی علی نے ڈاکٹر سعدی کو چاقو سے زخمی کردیا۔ اُسی زخم سے ڈاکٹر کی وفات ہوگئی اور قاتل پر مقدمہ قائم ہوکر سخت حراست ہوگئی (یہانتک حضرت کے پہنچنے سے پہلا واقعہ ہے) واقعہ کی تفتیش ہوتی رہی اور جرم ثابت ہوگیا۔ سزائے موت سنائی گئی۔ یہ شخص چونکہ شیخ الہند کی تشریف آوری کی شہرت اور فضائل و کمالات سُن چکے تھے۔ افسروں سے باقاعدہ درخواست کرکے حضرت کو بلاکر نیاز حاصل کیا اور نہایت عقیدتمند ہو گئے۔ اور پھر مکرر ملاقات کی استدعا کی۔ چونکہ وہ دنیا سے رخصت ہونے والے تھے حضرت کو رحم آیا اور پھر تکلیف فرمائی۔ اُنہوں نے توبہ وغیرہ کی اور حضرت کو وصیت کی کہ بوقت قتل آپ میرے قریب ہیں اور آپ ہی نماز جنازہ پڑھائیں اور میرے لئے دعاء مغفرت فرمادیں۔ اور آپکی جماعت میرے غسل و کفن میں شریک ہو۔ چنانچہ قتل کے روز حضرت مولانا اور مولانا حسین احمد صاحب پھر تشریف لیگئے۔ ترک نے حضرت کا ہاتھ پکڑکر سولی کے بہت

قریب کھڑا کرلیا تاکہ آخری دم میں تقویت رہے - مولانا حسین احمد ذرا فاصلہ سے کھڑے تھے ٹرک نے استقلال سے جان دی اور حضرت نے اُنکی وصیتیں پوری کیں ✣

اسیری اور نظر بندی ایک مصیبتِ عظیم ہے اور اُسکے ساتھ اعزہ اور مخلصین و خدام سے جُدائی اور اشاعتِ حدیث کی خدمت سے معذور و مجبور ہو جانا انسان کے لئے انتہائی کلفت ہے - اسپر حضرت کے امتحان کے لئے ایک اور اضافہ ہوا - خادم و مخلص رفیق مولوی نصرت حسین صاحب مرض نزلہ و بخار میں مبتلا رہنے لگے - (مولانا حسین احمد صاحب نے افسران بالا تک درخواستین پہنچائیں کہ مالٹائی برودت سے ہم لوگوں کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے - چنانچہ ایک رفیق برابر مریض رہتے ہیں ہمکو یا تو آزاد کیا جائے یا کسی مناسب مقام پر تبدیل کردیا جائے لیکن معاملہ ہمیشہ زیرِ غور کی کھٹائی میں پڑتا رہا اور کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا) اور کچھ عرصہ کے بعد ماہ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ میں مرض مذکور کو اشتداد ہو گیا - اور اسی مرض کی حالت میں ایک مرتبہ مرض نمونیا میں مبتلا ہو گئے باوجود علاج و تدابیر کے جانبر نہ ہو سکے اور یہ راسخ العقیدت والمودت عالمِ غربت و اسیری میں رفقا نظر بندی کو چھوڑ کر اعلیٰ علیین میں رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور موتِ غربت اور شہادتِ فی سبیل اللہ کے درجات سے ممتاز ہوئے ✣

حالتِ مرض میں مرحوم کو شفا خانہ میں منتقل کر دیا گیا تھا - جہاں بہت خوبی سے علاج ہوتا تھا اور رفیق حضرات بار بار جاکر خدمت کرتے تھے - وفات کے بعد رفقا غسل و کفن کے فکر میں تھے مگر وہمی ڈاکٹروں کو ہر ایک مرض متعدی نظر آتا ہے اُن کے کہنے سے محافظوں نے بلا اطلاع ہی تمام سامانِ نعش کو جلانے کا تیار کر لیا اور پھر حضرت کو اطلاع دی - فرمایا کہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے ہم غسل و کفن دیکر نماز پڑھکر دفن کرینگے - ڈاکٹر و محافظ تعدیہ کا خطرہ پیش کرتے تھے - اسی ردّ و بدل میں بعض محافظوں نے کہا کہ جب ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے تو نعش کو اُٹھا کر لے چلو - حضرت نے نہایت شدت و قوت سے فرمایا کہ "اگر تم میں طاقت ہے تو اُٹھا لو ہم ان کو ہرگز نہیں جلا سکتے - ہم ضرور نماز پڑھکر دفن کرینگے" ✣

اِس ضعیف الجثہ اسیر کی جرأت دیکھکر سب محافظ ششدر و دم بخود رہگئے اور شاید سمجھ گئے کہ

؎ ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

اور نرم ہو کر یہ کہا کہ آپ ان کو دفن کر سکتے ہیں غسل وکفن ونماز موقوف رکھیں مگر حضرت کو اپنے عزم پر پختہ دیکھکر اور باوجود اصرار کے نہ ماننے پر کہا کہ غسل میں چونکہ پانی وغیرہ پھیلنے سے سخت اندیشہ تعدیہ اور وبا پھیلنے کا ہے آپ صرف کفن دیکر اور مخصوص رفیق نماز پڑھکر دفن کر دیں۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی اور حضرت بمجبوری تقریباً اسی پر رضامند تھے کہ چند جوشیلے شامی اور تُرکی اسیر خبر سنکر دوڑے آئے اور مارنے مرنے پر تیار ہو گئے کہ ہم غسل بھی دینگے اور تمام قلعہ کے اسیر جمع ہو کر نماز پڑھینگے۔ قصہ مختصر یہ ہی کہ ایک ہنگامہ عظیم اور فساد برپا ہو جانے کے اندیشہ سے مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ غسل کی جگہ تیمم کرا دینے پر حضرت بھی رضامند ہیں اب نزاع فضول ہے افسر اور محافظوں کو بھی اسی میں خیر نظر آئی اور بوجہ معذوری غسل بقاعدہ شرعیہ تیمم کرا کر کفن دیکر جنازہ قبرستان چلنے کے لئے تیار ہوا۔

اسیر کی نعش کے ہمراہ قانوناً صرف پندرہ آدمی جا سکتے تھے۔ لیکن اصرار اور جرأت کر کے اور محافظوں سے طوعاً وکرہاً اجازت حاصل کر کے پچپن ۵۵ دیندار اسیر ہمراہ ہو گئے اور مقبرہ میں پہنچکر غمزدہ رفیقوں اور ہمدرد اسیروں کی جماعت نے شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا کی امامت سے نماز ادا کی۔ اور ہندوستان سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر سلطان عبدالعزیز خاں رحمہ اللہ کے بنائے ہوئے قبرستان میں راضی برضائے الٰہی ہو کر سپرد خاک کیا۔ بظاہر ڈیڑھ بالشت اونچی قبرِ خام بنا کر چھوڑ دی اور حقیقت میں توحید پر جان فدا کرنے والے اہلِ ہند کی دینداری اور ثباتِ فی الدین کا کبھی نہ مٹنے والا ہزاروں گز بلند نشان مرکزِ تثلیث میں قائم کر دیا +

باپ کو بیٹے کے اور بھائی کو بھائی کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوتا جسقدر حضرت کو اس مردِ مخلص کی وفاتِ غربت سے ہوا۔ ہندوستان کے ایک خط میں نہایت درد انگیز لہجہ میں فرماتے ہیں:

"رفیق جانثار مولوی سید نصرت حسین کے دلخراش واقعہ کی خبر تمکو مل گئی ہوگی"۔ لیکن خاصانِ خدا اور اہل اللہ جس اسلوب سے دنیاوی مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور لَنَبْلُوَنَّکُمْ بِنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ کے امتحان میں پورے اُترتے ہیں حضرت مولانا اور آپ کے رفقائے بھی وہی طریقہ اختیار کیا +

عین اُس زمانہ میں جبکہ اِن اسیروں کی رہائی کی افواہیں سُنکر اُن کی ضعیف والدہ بیٹے کی آزادی کے لئے چشم براہ تھیں اور حسرت زدہ زوجہ دو چھوٹے بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے شوہر کی آمد کی منتظر تھی تیرِ جگر دوز کی طرح اس خبر نے دل کے ٹکڑے اوڑا دئے کہ اس اسیرِ بلا کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو

ایسے پر بہار عالم میں ایسی تم گئی کہ پھر آنے کا نام بھی نہ لیگی - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٭

اس واقعۂ فاجعہ کی درد انگیز تاریخ جو حضرت مولانا نے اُنہیں ایام رنج ومحن میں تحریر فرمائی تھی خود حضرت کے قلم کی لکھی ہوئی اسوقت نظر کے سامنے ہے حرف بحرف نقل کیجاتی ہے -

تاریخ واقعۂ جانکاہ جناب مولوی حکیم سید نصرت حسین مرحوم ومغفور

هو الغفور الرحیم

تخلص ۱-

فغاں کہ مولوی نصرت حسین حامئ دیں — کہ بود جامع فضل وکمال ولطف وکرم

بہ اسہالِ ملطہ در عین عنفوانِ شباب — قدم ز قید فرنگ وحیات زد بعدم

بہ غیر قتل وسلاح درجۂ شہادت یافت — ز فضلِ رحمتِ ربِّ غفور جلَّ وعمَّ

ز مخلصاں کہ پئے شاں گذاشتی ہمہ را — چہ شد کہ چشم بہ بستی ورخ نہفتی ہم

چرا کنارہ گرفتی دریں دیار بغیض — گذاشتی رفقارا اسیر حسرت وغم

بہ شوقِ خلد مگر آنچناں شدی مضطر — کہ ہر دو قید بہ یکبارگی زدی برہم

جدا شدیم چو از یار واز دیار کنوں — کجا روم چہ کنم حالِ دل کرا گویم

بدوستاں مگر آموختی طریق خلاص — جز اک رنگ یاخبر نامع مغتنم

بچشم اشک فشان وبخاطر غمگیں — بحالِ حزن وتاسف چو سر فرو کردم

سروش گفت چہ نالی مگر نمی بینی — رہائی یافتہ از ہر دو قید در یکدم

۱۳۳۷ھ

سال ۱۳۲۵ ھ

دیگر

نو بادۂ گلشن سیادت — از پا بسر اوفتادہ صد حیف

آں نصرت حسین راحتِ دل — رُو سوئے عدم نہادہ صد حیف

سرمایۂ لطف وشادمانی — صد داغ بدل نہادہ صد حیف

خاک رفقائے بیکس وکو — صد حیف بباد دادہ صد حیف

از قید فرنگ آمدہ تنگ — پا سوئے عدم نہادہ صد حیف

زیں بزم گریز ناگزیر است	در دہر کسیکہ زادہ صد حیف
زیں زمزمہ پُرصدا ست گوشم	شمشاد دنیا فتادہ صد حیف ۱۳ ۵ ۳۷

سلطان عبد العزیز خاں رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے زمانہ سلطنت میں یورپ کی سیاحت فرمائی ہے تو مالٹا میں بھی گذر ہوا۔ دیکھا کہ وہ شہر جسمیں کبھی پانچوقت ہر طرف سے خدائے واحد کی توحید کی صدائیں گونجتی تھیں آج خدا کے نام سے ایسا محروم ہوگیا کہ کوئی اسلامی نشان تک نظر نہیں آتا۔ ہر طرف نصاریٰ کے قبرستان ہیں کوئی مسلمان اتفاقیہ وہاں وفات پائے تو مٹی برباد ہو۔ شہر سے باہر ایک نہایت دلکش اور سبزہ زار جگہ پر مقابرِ مسلمین کے نام سے پختہ احاطہ بنوایا۔ اور غسلِ میت کے لئے وہاں ایک نہایت صاف و شستہ جگہ بنوائی اور اُسی قبرستان میں ایک طرف ایک مسجد بنواکر ایک امام و محافظ تنخواہ دار مقرر کرکے خزانہ سلطنت سے اُسکی تنخواہ مقرر فرمائی۔ اس قبرستان میں وارد و صادر سیاح و تاجر مسلمانوں کی چند قبریں پہلے سے موجود تھیں مگر یہ نہیں معلوم ہوسکتا تھا کہ کون ہیں کس طرح یہاں آئے ✣

مولوی نصرت حسین صاحب کے مدفون ہونیکے بعد حضرت کا خیال ہوا کہ ایک پتھر پر اُن کا نام مُع نشانات لکھکر قبر کے قریب گاڑ دیا جائے (جسمیں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہی) نظر بند ترکی افسر اشرف بے جو حضرت کے خاص معتقد و نیازمند ہوگئے تھے اس خیال پر مطلع ہوگئے۔ اپنے پاس سے زرِ کثیر خرچ کرکے دُور دراز سے نہایت عمدہ پتھر منگاکر اور سب اہلِ قبور کے نام و نشان حتی الوسع تحقیق کرکے نہایت اہتمام سے پتھروں پر کندہ کراکر علیحدہ علیحدہ سب کی قبروں پر لگا دئے۔ اور سب سے بہتر عمدہ پتھر پر عربی عبارت میں بطرز نستعلیق مولوی نصرت حسین صاحب کا نام و نشان اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے رُفقا میں اسیر ہوکر مالٹا پہنچنا اور تاریخِ وفات کندہ کراکر خوبصورتی سے قبر کے سرہانے نصب کردیا۔ بالکل مکمل ہوجانیکے بعد حضرت سے استدعا کی کہ ملاحظہ فرماویں۔ حضرت تشریف لیگئے اور ملاحظہ فرماکر خوشنودی ظاہر فرمائی جس سے اشرف بے کی تمام سعی اور مصارف کا ثمرہ بخوبی ملگیا ✣

جان نثار رفیق کے تعلق نے پھر ایک مرتبہ کشش کی حضرت نے پھر زیارتِ قبور اور فاتحہ خوانی کا قصد فرمایا بقول شخصے ؎

قبر پر فاتحہ پڑھنے کو نہ آئینگے وہ کیا ۔۔۔ جان دینے کا کچھ انعام ملیگا کہ نہیں ۔

قلعہ سے نکلنے کی اجازت لیگئی اور بعد نماز ظہر وقت مقرر ہوا۔ اپنی سادہ طبیعت اور ثواب طلبی نیت

کے مقتضا سے حضرت کا خیال تھا کہ پیادہ تشریف لیجاکر زیارتِ قبور کا ثواب حاصل فرمائیں گے اور مغرب کے وقت تک واپس آجائیں گے۔ مگر مولوی وحید احمد صاحب (جنکی نوعمری کی شائستگی آمیز اور مؤدب شوخیوں پر حضرت براہ شفقت مواخذہ نہیں فرماتے تھے) محافظوں سے موٹر کی سواری کے انتظام کی فرمایش کر آئے (جو ان لوگوں کے اشاروں پر تعمیل کرتے تھے) حضرت نے ظہر کی نماز ادا فرماکر چلنے کا قصد کیا تو موٹر موجود تھا۔ حضرت تبسم فرماکر سوار ہوگئے اور آپکی معیت میں ہر شخص نے سوار ہونے کو سعادت سمجھکر جگہ لینے کا ارادہ کیا۔

حضرت مولانا کے علاوہ چار شخص سوار ہوگئے تھے۔ مولوی عزیر گل صاحب۔ رئیس ادارہ محمد حلمی بے آفندی۔ لفٹنٹ عبدالرحمن آفندی۔ انگریزی افسر محافظ۔ مولوی وحید احمد صاحب کی جگہ نکل سکتی تھی مگر انہوں نے اشرف بے کو مشتاقِ معیت دیکھکر سعادتمندی سے اپنی جگہ دیدی اور باوجود اشتیاقِ سیر کے خود رہجانا گوارا کیا۔ اور شاید دوستانہ بے تکلفی کے طرز پر اسکا معاوضہ شیرینی بھی اشرف سے وصول کی۔

مقابر میں پہنچکر حضرت نے فاتحہ پڑھی کچھ دیر قیام فرماکر اور نمازِ عصر وہیں ادا کرکے واپس ہوئے سوار ہوکر چلنے کے بعد ایک عرصہ گذر گیا مگر قلعہ تک نہ پہنچے۔ اول تو حضرت کو تعجب ہوا پھر خیال فرمایا کہ شاید کسی دوسرے بعید راستہ سے واپس ہوئے ہیں۔ پھر بھی دیر ہوئی تو حضرت کی پیشانی پر ناگواری کے شکن پڑے اور (موٹربان کی نسبت) فرمایا کہ یہ ہمکو کہاں لئے پھرتا ہے سب ہمراہی ادب سے خاموش رہے۔ اور فرمایا کہ حضرت اب پہنچے۔ پھر بھی دیر ہوئی اور مغرب کا وقت ہوگیا۔ تو حضرت ناگواری برداشت نفرماسکے اور غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ کہاں لیجائیگا اس سے کہو کہ قیامگاہ پر چلے سب رفیق دم بخود ہوگئے اور چند منٹ کے بعد قلعہ میں پہنچگئے اور نماز مغرب بہ نسبت معمول کے کسیقدر تاخیر سے ادا ہوئی۔

دیوبند میں عصر کے بعد خود ہی اس واقعہ کی نسبت فرماتے تھے کہ "چلتے چلتے شہر کے گلی کوچے آجاتے تھے اور خیال ہوتا تھا کہ اب پہنچ جائیں گے مگر پھر جنگل اور پہاڑ اور سبزہ زار اور چشمے نظر آنے لگتے تھے پھر آبادی میں سے گذرنے لگتے تھے مگر تھوڑی دیر کے بعد ویسے ہی جنگل اور سیرگاہیں پیش نظر ہوجاتی تھیں بعد کو معلوم ہوا کہ اشرف بے نے موٹرمین کو سمجھادیا تھا کہ واپسی میں تمام مالٹا کی سیر کرادینا (تاکہ حضرت ایک مرتبہ ضروری سیرگاہیں دیکھ لیں۔ کیونکہ قلعہ سے نکلنے کی اجازت ملنا اور پھر سیر کے لئے ایسا موقع میسر آنا دشوار تھا۔ نیز محض سیر کیلئے نکلنا حضرت کی طبیعت و مزاج سے بھی بعید تھا) فرماتے تھے کہ رفتار کا حسنا

کرنے سے معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں سینتالیس میل مسافت قطع کی ہے۔ اتنی تاخیر اور مسافت میں موٹر کا کرایہ بھی بڑھکر ساڑھے چار گنی ہو گیا ہے ہمنے ہر چند دینا چاہا لیکن اشرف بے نے منظور نہ کیا خود ہی ادا کر دیا" +

مولوی عزیر گل صاحب تو اس سیر سے بہت ہی محظوظ ہوئے مگر حضرت کو ایسے امور کی طرف کچھ توجہ نہ تھی وہ اپنے اور ہی خیال میں لگے ہوئے تھے تاہم اس دور دراز کے گشت اور تاخیر کی مصلحت معلوم ہو جانے کے بعد ناگواری بالکل زائل ہو گئی اور اس سیر سے ہمراہیوں کو فرحت حاصل ہو جانے کی وجہ سے حضرت کو بھی بشاشت ہوئی +

حضرت کو اپنے رفیقوں کی راحت کا اپنی برابر بلکہ زائد خیال رہتا تھا۔ ایک دفعہ مکان سے پارسل پہنچے تو ان میں صرف چھالیا اور پان تھے۔ پارسلوں کی رسید کے ساتھ ہی رنج سے یہ تحریر فرمایا کہ

" دو پارسل پہنچے ایک میں پان اور چھالیا اور دوسرے میں صرف چھالیا تھی۔ تمنے جوتوں کے جوڑے "
" بھیجے تو سب کے واسطے۔ وہاں قربانی کی تو سب کیطرف سے۔ پھر یہ پارسل ایسا کیوں بھیجا جس سے ایک کے سوا "
" کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اتنی دور سے پارسل آوے اور ایک کے سوا کسی کو اس سے نفع نہ ہو تعجب کی "
" بات ہے۔ تھوڑا سا آدرک یا زیرہ یا گٹے یا بتاشے ہی رکھدیے ہوتے تاکہ سب کی ناک میں خوشبو "
" ہی پہنچ جاتی یا رال ہی میٹھی ہو جاتی" "

مسلمان اسیران مالٹا تو اس خدا پرست جماعت کے معتقد تھے ہی لیکن غیر مسلم اسیر اور محافظ بھی انکی حسن سیرت طاعت و عبادت طرز و ہیئت کو دیکھکر متاثر ہو رہے تھے اور انکی صلح جوئی امن پسندی اور صلاحیت کو دیکھکر محافظ بھی مطمئن ہو گئے تھے اور اخیر زمانہ میں حراست و حفاظت میں تخفیف ہو گئی تھی۔ جرمنی اسیر طرح طرح کی شرارتیں کرتے تھے۔ کبھی ذخیرے میں آگ لگا دیتے تھے کبھی قفل توڑ کر گدام میں سے کپڑے نکال لیتے تھے (کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوانین جنگ اور قومیت و مذہب کی یکرنگی ہمیر تشدد سے مانع ہوگی۔ اور اسیری سے بڑھکر ہمارے لئے کوئی سزا ہی نہیں ہے) بعض جرمنی فرار ہو گئے لیکن سمندر حائل تھا کشتی میں بیٹھکر کچھ دور نکل بھی گئے تھے۔ مگر پھر گرفتار ہو گئے۔ بعض نے اعلان کر دیا کہ ہم فلاں تاریخ کو فرار ہوں گے۔ اور سرنگ لگا کر عین اسی تاریخ کو راہ فرار اختیار کی دو تین روز کے بعد یہ بھی واپس لائے گئے کیونکہ دریا کی وجہ سے شہر سے نکل جانا ممکن نہ تھا۔ قلعہ سے

اگرچہ مختلف تدابیر سے نکل جاتے تھے +

ہمارے مخدوم صبر وثبات کے ساتھ خدا پر توکل کئے ہوئے اپنے علمی مشاغل وعبادت وطاعت میں مصروف تھے کبھی اس قسم کے ارادے تو درکنار خیال تک نہیں گذرتا تھا۔ البتہ اسی کے ساتھ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا مضمون بھی نظر انداز نہیں فرمایا تھا۔ ایک روز کسی جگہ آفس میں اظہار دینے کے لئے دو نوجوان انگریز حضرت کو اپنی حراست میں لیچلے حضرت کو عمرۃ القضا کا واقعہ پیش نظر تھا اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مشتمل اظہار جلادت وقوت دل پر نقش تھا بالکل وہی لفظ گوروں کی زبان سے کہلا کر چھوڑا۔ جو صحابہؓ کی نسبت مشرکین نے کہا تھا۔ یعنی حضرت اُن کیساتھ نہایت تیزی اور چستی سے چلتے رہے جس سے ضعف کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اِن محافظوں نے واپس ہوکر حضرت کے ہمراہیوں سے کہا کہ "تمہارے شیخ ہیں تو بوڑھے لیکن قوت اِن میں بہت ہے۔ چلنے میں ہم سے آگے آگے رہتے تھے"۔ حضرت سے رفیقوں نے ذکر کیا۔ تو ہنسکر فرمایا کہ "یہ اُنہیں کی برکت تھی" (یعنی اُنہیں کے سبب سے عمداً تیز چلتا تھا۔ اگر بجائے اُن کے مسلمان محافظ ہوتے تو اسکی ضرورت نہ تھی +

وطن میں حضرت نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع فرمایا تھا لیکن تین سال میں بکوشش والتزام صرف دس پارے بہ مشکل تمام کسی قدر غیر مکمل تیار ہوئے تھے۔ دار العلوم میں شغل تعلیم اور زائرین واضیاف کے ساتھ حضرت کی وسعتِ اخلاق کی وجہ سے فرصت ہی نہ ہوتی تھی اور اس طرح دس سال میں بھی پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ مالٹا کی یکسوئی اور گوشہ نشینی میں خدا تعالیٰ کے فضل سے دو ہی سال میں کامل ہوگیا۔ اور حضرت مولانا نے کمالِ مسرت سے یہ مژدہ ہندوستان کو ۱۹؍ شوال ۳۶ھ کے خط میں تحریر فرمایا کہ "رمضان المبارک کے دورہ کے بعد ترجمہ قرآن شریف کا الحمد للہ کہ پورا ہوگیا۔ مولانا عبد الرحیم صاحب کی خدمت میں اطلاع کر دینا"۔ (مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کو تعلیم قرآن مجید کا دلی شغف اور خاص اہتمام تھا اور اس ترجمہ کے نہایت مشتاق وآرزومند تھے۔ افسوس ہے کہ حضرت ممدوح کی حیات میں یہ ترجمہ ہندوستان نہیں پہونچ سکا۔ باقی حال اسکا حضرت مولانا کی تصانیف کے تحت میں آویگا +

علم حدیث میں درجۂ کمال حاصل ہونے کی وجہ سے صحیح بخاری کے علوم سے حضرت کو خصوصی مناسبت تامہ تھی۔ ترجمۃ القرآن کے ضمن میں مضامین کلام مجید میں غور کرنے کا یہ ثمرہ اور برکت ہوئی کہ تراجم بخاری کے علوم (جو ایک نہایت ہی دقیق ولطیف مشکل علم سمجھا جاتا ہے) حضرت پر منکشف ہوگئے۔ بقول مولانا روم رحمۃ اللہ

ف بینی اندر خود علوم انبیا ۔۔ بے معید و بے کتاب و اوستا

اور خود بخود بلا اختیار ایک داعیۂ غیبی تراجم بخاری کی تحریر پر محرک ہوا۔ اور حضرت نے ابتدائی کتاب کے تراجم کے متعلق نہایت بیش بہا وہبی مضامین کو نقوش و الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ جنکو دیکھکر اہل علم وجد میں آتے ہیں۔ جسقدر لکھا گیا اس سے زیادہ مقدر ہی نہ تھا۔ حضرت ہندوستان تشریف لے آئے یہاں آکر اچھی طرح قیام بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ مگر آئندہ تحریر فرمانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ سفر آخرت درپیش آگیا۔ آہ کیسے کیسے مضامین عالیہ اُس گنجینۂ علوم کے ساتھ دفن ہو گئے۔ افسوس زمانۂ تحریر میں حضرت پر تجرد و تفرید کا وہ غلبہ ہوا اور تعلق مع اللہ کو اتنی ترقی ہوئی کہ تمام تعلقات ناگوار اور فضول محسوس ہونے لگے۔ اور بار ہا یہ خطرہ[1] گذرتا تھا کہ اگر یہ رفقا بھی ہمراہ نہ ہوتے تو اَور زیادہ یکسوئی و بے تعلقی نصیب ہوتی ٭

مالٹا میں بعض جرمنی عیسائی پادری بھی مقید تھے۔ اُن کے پاس قرآن مجید کے بعض پارے جرمنی زبان میں ترجمہ شدہ موجود تھے جنکو وہ لوگ کبھی کبھی بہت غور سے مطالعہ کرتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ مالٹا میں ادائے فرائض مذہبی سے کسی کو ممانعت نہ تھی یہانتک کہ جرمنی پادری اسیر افسروں اور محافظوں سے درخواست کر کے شہر کے ہسپتال میں جاتے اور حسب عادت مریضوں کو اپنا وعظ و نصیحت سناتے۔ کیونکہ وہ لوگ اسی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اور ادائے فرائض سے کسی اسیر کو روکنا خلافِ قانون تھا ٭

ترکی اور شامی مسلمانوں نے کبھی حضرت کے فوٹو لینے کا ذکر کیا تو آپ نے اسکو بھی مثل تصویر کشی کے حرام فرما کر اجازت نہ دی لیکن ایک مرتبہ حضرت کو معلوم ہوا کہ جب آپ اپنے رفیقوں کے ہمراہ کسی کھلی جگہ میں بیٹھے تھے جرمنی لوگ ان سب حضرات کا فوٹو اُتار کر لیگئے تاکہ اپنے ملک کے اخبارات میں اسکو شائع کر کے سلطنت برطانیہ سے نفرت و حقارت پیدا کریں کہ ایسے ایسے ضعیف اور مقدس اور بے لوث حضرات کو گرفتار کر کے وطن سے دُور ڈالدیا ہے۔ واقعہ چونکہ گذر چکا تھا اب حضرت اُسکی نسبت کیا فرماتے ٭

اہل مالٹا اگرچہ بدبختی سے مذہب حق کو چھوڑ بیٹھے ہیں لیکن زبان بدستور عربی ہی جسکو حالت اسلام

---

[1] یہ مضمون حضرت نے کسیقدر اخفا کیساتھ ذرا دیا کر مالٹا سے واپس آنے کے وقت دیو بند میں مظفر نگر کے قریب بیان فرمایا تھا ۱۲

یں آبار و اجداد بولا کرتے تھے اور اسی زبان کی برکت ہی کہ جابجا انشاء اللہ تعالیٰ۔ ماشاء اللہ اور وَاللہ۔ بلی وَاللہ کے خوبصورت جملے ان کے کلام کو مزین کر دیتے ہیں۔ اور رحمدلی اور فزع من الموت کا اسقدر اثر ہے کہ جنازہ کو دیکھکر بچے اور عورتیں تک گھروں سے باہر نکل کر تھوڑی دور مشائعت کرکے یا قبرستان پہنچا کر واپس آتے ہیں۔

مالٹا میں انگور و انار وغیرہ بھی عمدہ ہوتے ہیں مگر تین چیزیں یہاں کی خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ کثرتِ اولاد۔ بکریاں۔ پتھر۔

اولاد کی یہ کثرت ہے کہ ایک ایک شخص کے آٹھ آٹھ اور دس دس بچے ہونا معمولی بات ہی جس محلہ میں آپ نکل جائیں۔ بچوں کا ایک متحرک لشکر نظر آئیگا +

بکریاں نہایت قلیل اور بہت کم ہوتی ہیں۔ مگر تھن اسقدر بڑے ہوتے ہیں کہ بھینس کو شرماتے ہیں +

پتھر کی کانیں ہر طرف موجود ہیں جسجگہ کھودے پتھر نکلیں گے لیکن بالکل بودے اور ناپائیدار +

اسیری کے زمانہ کی ایک ایک ساعت برسوں کی برابر ہوتی ہی لیکن حضرت نے پانچ سال کا زمانہ اپنے صبر و استقلال سے نظر بر قضا و قدر رکھکر خود بھی سہولت سے گذار دیا اور ہمراہیوں کو بھی آپکے فیض صحبت، اخلاق حسنہ، غایت شفقت کی وجہ سے گویا گراں ہی نہ گذرا۔ بلکہ دیگر اسیرانِ مالٹا کو بھی اپنی اسیری مثمر برکات نظر آتی تھی +

مختلف اوقات میں قلعہ کے بہت سے اسیر حضرت سے پہلے ہی متفرق ہوگئے تھے۔ بعض کو آزادی نصیب ہوئی۔ چنانچہ اشرف بے وغیرہ آپسے ڈیڑھ ماہ قبل رہا ہوگئے تھے۔ اور بعض دوسری جگہ منتقل کر دئے گئے۔ اس جماعت صالحین کی رہائی کی خبریں بھی کئی مرتبہ مشہور ہوئی۔ اور چند مرتبہ مالٹا سے روانگی کی خبریں ملیں لیکن سب بے نتیجہ رہی اور آخر میں تو ایک مرتبہ باضابطہ اطلاع آنے اور تاریخ مقرر ہو جانے پر اسباب سفر باندھکر بالکل تیار ہو جانے کی بھی نوبت آئی لیکن پھر التوا ہو گیا۔ بالآخر ماہ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ میں روانگی کی اطلاع پہنچی اور تاریخ مقرر ہوگئی۔ باقی ماندہ اسیروں کا حال نہ پوچھئے۔

یوسف علیہ السّلام جب زندان سے رخصت ہوئے ہیں تو اہل سجن آہ دلکا کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اُن کو رخصت کر رہے تھے۔ اور یوسف علیہ السّلام اُن کے لئے دعا فرماتے تھے کہ

اَللّٰھُمَّ وَ عَطِّفْ عَلَیْھِمْ قُلُوْبَ الْاَخْیَارِ وَلَا تَنَمْ عَلَیْھِمْ الْاَجْبَارَہٗ" اور جب نکلے ہیں تو دروازہ پر یہ لکھ آئے تھے کہ "ھٰذَا بَیْتُ الْبَلْوٰی وَقَبْرُ الْاَحْیَاءِ وَشَمَاتَۃُ الْاَعْدَاءِ وَ تَجْرِبَۃُ الْاَصْدِقَاءِ" (یعنی یہ امتحان کا مکان ہے اور زندوں کی قبر ہے اور دشمنوں کی خوشی کی جگہ ہے اور دوستوں کا تجربہ ہونے کا موقع ہے) وہی منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل کا سچا مصداق پانچ برس تک اصحاب سجن کو دعوت الی الحق کرنیکے بعد زندان سے جدا ہوتا ہے +

حضرت جیسے قابلِ رحم مقدس شخص کی آزادی اور پاکباز جماعت کی رہائی باعث مسرت تھی لیکن ایسے شیخ کامل کی مفارقت اور اپنی محرومی آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی تھی۔ کئی روز پہلے سے لوگ وصایا اور نصائح حاصل کرکے اور استدعاءِ دعا معروض کرکے رخصت ہو رہے تھے خاص تشریف لیجانے کے دن تمام اسیر مسلمانوں کا ایک جلسہ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس معزز افسر نے خطبہ صدارت میں حضرت کے فضائل۔ آپکی تکالیف اور بے قصور نظر بندی پر افسوس۔ رہائی کی دعا اور اپنی مفارقت و محرومی پر اظہار حسرت کیا۔ بعض لوگوں نے عربی اشعار پڑھے۔ آخر میں سب نے حضرت سے دُعا کیلئے عرض کیا۔ حضرت نے ہاتھ اٹھائے۔ ہر طرف سے آمین کی آواز بلند ہوئی۔ پندرہ منٹ تک بالحاح و زاری خلوص قلب سے دُعا ہوئی۔ بہت سے حاضرین پر رقت طاری تھی +

عین رخصت کے وقت قلعہ کے دروازہ تک ہر صغیر و کبیر بچشم گریاں و دل بریاں مصافحہ اور دست بوسی کے لئے حاضر ہوا اور بکمال حسرت آخری دیدار کرکے حضرت کو رخصت کیا۔ قلعہ سے سمندر کی گودی تک سواری پر تشریف لائے اور محافظوں کی حفاظت میں سوار ہوگئے۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں اور کسلئے۔ کیونکہ کوئی اطلاع نہ تھی۔ البتہ غالب گمان آزادی کا تھا۔ حفاظت میں رفتہ رفتہ کمی اور تخفیف ہوتی جاتی تھی۔ جہاز اسکندریہ پہنچا اور جہاز سے اوتر کر اسکندریہ کے متصل قریہ سیدی بشر میں بائیس روز مقیم رہے۔ بائیس دن کے بعد وہاں سے براہ ریل سویز پہنچے۔ یہاں شہر سے باہر کسیقدر دور مقیم رہے۔ اسکندریہ اور سویز کی یہ اقامت نہایت تکلیف دہ تھی۔ راحت کا مکان نہ تھا۔ بلکہ خیمے استادہ تھے۔ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا کہ کسی سامان راحت کا کچھ فکر کریں۔ چلنے کی خبریں تھیں

لہ یا اللہ نیک بندوں کے دل ان پر مہربان ہیں اور دنیا کی خبریں انسے پوشیدہ نہ رہیں۔ (اسی دعا کا اثر ہے کہ قید خانوں میں بلاتار اور اخبار کے تمام خبریں پہنچتی رہتی ہیں) ۱۲

لیکن فردائے قیامت کی طرح وہ دن ہی نہ آتا تھا۔ کبھی جہاز کا پتہ نہ تھا۔ جہاز آیا تو اُس میں جگہ نہ تھی۔ جگہ تھی تو اِن اسیروں کو اُس میں سوار کرنا خلافِ مصالح تھا۔ اور اُس پر طرّہ یہ کہ سرکاری مہمانداری بھی مالٹا ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ اِن مقامات پر نہ کوئی وظیفہ تھا نہ خوراک۔ اور اِن حضرات کا ذاتی سرمایہ جو محافظوں کے پاس تھا وہ مالٹا ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ یہاں کوئی یار نہ مددگار اور پھر ساتھ ہی استغنا اور حیا ر۔ ایسے وقت میں جس تکلیف سے ایام بسر ہوئے ہونگے آپ خود اندازہ کر لیں تفصیل کیا ہو سکتی ہے۔ بدرجۂ مجبوری مولانا حسین احمد صاحب نے بذریعہ تار مکہ معظمہ میں اپنے معتبر دوستوں کے پاس جمع کی ہوئی امانت میں سے روپیہ طلب کیا +

اسی تکلیف کی حالت میں ڈیڑھ ماہ گذر گیا اور ۲۹ر شعبان کو شہر سویز سے حضرت کے قیامگاہ پر رویتِ ہلال کی خبر پہنچی۔ (خود اِن حضرات نے چاند نہیں دیکھا تھا اور ہندوستان میں بھی اکثر جگہ ۲۹ر شعبان کو رویت نہیں ہوئی تھی) بہت افسوس ہوا کہ ماہ مبارک اسی بے موقع قیام میں بے لطفی سے گذریگا (فرماتے تھے کہ) یہ تو کبھی وہم بھی نہ تھا کہ رمضان المبارک ہی میں خدا تعالیٰ وطن پہنچا دینگے۔ تراویح ادا کی گئی۔ روزے رکھنے شروع کئے۔ مکہ معظمہ سے ابھی روپیہ وصول بھی نہ ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ نے رحم فرمایا اور یہ اس ناگوار قیام کی (جو شبِ ہجر کی طرح تکلیف دہ اور طویل ہوتا چلا جاتا تھا) خدا خدا کر کے سحر نمودار ہوئی یعنی بہت انتظار کے بعد ۵ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو جہاز آیا۔ حضرت مولانا اور رُفقا سرکاری طور پر فرسٹ کلاس کے نہایت مکلّف کمروں میں سوار کئے گئے۔ اب حفاظت و حراست برائے نام رہگئی تھی اور جہاز میں کوئی خاص انتظام نظربندی اور نگہداشت کا نہیں تھا۔ (حضرت فرماتے تھے کہ) اس جہاز میں بجائے پنکھوں کے دوسری قسم کے آلے لگے ہوئے تھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ جہاز چونکہ نہایت سرد خطّوں میں بھی سفر کرتا ہے اسلئے حرارت پہنچانے کے آلے لگائی ہیں تا کہ مسافر شدتِ برودت کی تکلیف سے محفوظ رہیں جہاز میں یہ عزیز مسافر روزے رکھتے رہے۔ عدن پہونچنے پر مولانا حسین احمد صاحب نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر ۸ر جون تک بمبئی پہونچنے کے تار دئیے۔ اور ضروری خطوط بھی لکھکر روانہ کئے اور مولانا موصوف نے بایں خیال کہ شاید ہندوستان پہنچکر موقع نہ ملے بمبئی پہونچنے سے پہلے ہی تراویح میں کلام مجید باطمینان تمام کر لیا (اور ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ یکشنبہ ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچگئے) نظربندی اور مالٹا کے مختصر حالات احقر نے سب یکجائی طور پر جمع کر دئیے ہیں زمانۂ نظربندی میں ہندوستان میں جو واقعات پیش آئے اور رہائی کی تحریکات ہوئی وہ بالاجمال آئندہ مذکور ہونگی +

ہندوستان کی کیفیت - رہائی کی تحریکات - تشریف آوری کے حالات

ہندوستان میں حضرت مولانا کی نظر بندی کی اطلاع پہنچنے کے ساتھ ہی قلوب میں تو بیچینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا - لیکن ابتدا میں چند وجوہ سے اسکا اظہار نہیں ہو سکا - اُمید تھی کہ سرکاری تفتیش کے بعد حضرت مولانا بے جرم ثابت ہو کر جلد رہا ہو جائیں گے - یہ بھی خیال تھا کہ معمولی سٹریکٹ و استدعا کے بعد اسمیں کامیابی ہو جائیگی - ادھر حضرت کے خطوط جو خادموں، دوستوں عزیزوں کے نام آتے تھے صبر و سکون کی تاکید سے لبریز - اور تسلیم و رضا بالقضا کی تاکید سے معمور ہوتے تھے - پھر جوں جوں تاکید ہوتی گئی متوسلین کا اضطراب بڑھتا گیا - اور باطنی تدبیر یعنی الحاح وزاری بجناب باری سے (جسکی طرف سے کبھی غافل ہی نہ تھے) آگے بڑھکر ظاہری تدابیر کی طرف بھی متوجہ ہوئے + مسلمانوں کی قومی جماعتوں (مدارس اور انجمنوں) کی طرف سے اور مخصوص و معزز افراد کی جانب سے مختلف مقامات اور اضلاع و امصار سے ہزار ہا تار، وزیر ہند کو لندن میں اور وایسرائے صاحب کو ہندوستان میں بھیجے گئے جنمیں بعض تمام نظر بندان اسلام کی رہائی کے متعلق تھے اور بعض خاص حضرت مولانا کے اظہار نا کردہ گناہی اور مطالبۂ آزادی پر مشتمل تھے +

آنریبل سید رضا علی صاحب صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی قانونی کونسل کے اجلاس میں حضرت مولانا کی نظر بندی کے متعلق سوال کیا اور یہ بعید عن القیاس جواب پایا کہ " مولانا محمود حسن صاحب اسوقت مالٹا میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اسیران جنگ کے کیمپ میں رکھے گئے ہیں صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کو اطلاع پہنچی ہے کہ مولانا کی گرفتاری ہندوستان کے باہر عمل میں لائی گئی ہے کیونکہ تحریری اور دیگر اقسام کی شہادتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو اون کی فوجی تجاویز میں مدد دی ہے " +

اُردو اخبارات میں آٹھ دس مسلمان اخباروں نے اُس زمانہ کی روش کے اندازہ پر مناسب آواز میں حضرت مولانا کا ذکر خیر اور اُن کی برارت و بے قصوری بیان کر کے اپنے اپنے طرز میں گورنمنٹ سے حضرت کی آزادی کی استدعا کی یا اخباری طرز پر آزادی کا مشورہ دیا +

حضرت مولانا کی قوی الہمت و عالی حوصلہ اہلیہ صاحبہ نے ایک درخواست باقاعدہ مرتب کر اگر گورنمنٹ

میں بھیجی جسمیں حضرت مولانا کی بے لوث زندگی بے قصوری اور ضعیفی اور اپنے ممتد امراض کا اظہار کرکے رہائی کی استدعا کی۔ عرصہ تک اسکا کچھ جواب آیا اور جب[۲] آیا تو خلافِ مراد ✤

منتظمین دار العلوم دیوبند نے حسبِ استطاعت سعی و کوشش شروع کی اور ۵ ر نومبر ۱۹۱۷ء عیسوی (مطابق محرم ۱۳۳۶ھ) کو معزز مدرسین و اہلِ مشورہ کا ایک وفد بمقام میرٹھ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ لارڈ جیمس مسٹن کی خدمت میں پیش کیا اور ایک نہایت مہذب و شائستہ الفاظ کی تحریر پڑھی جسمیں نرم لہجہ میں حضرت مولانا کی رہائی کی درخواست کی گئی تھی ✤

اس وفد کے ساتھ لفٹنٹ گورنر صاحب نے نہایت ملاطفت و اخلاق سے معاملہ کیا۔ اور اگرچہ ایک دوسری گورنمنٹ (یعنی شریف صاحب کی حکومت عربی) سے معاملہ کا تعلق ہونے کی وجہ سے کسی قدر دشواری اور دقت کی طرف[لہ] اشارہ کیا۔ اور کہا کہ "میں اس مجلس میں جو کچھ کہونگا بالکل صحیح اور صاف کہونگا مجھسے میرے خاص دوستوں نے اس بارہ میں کہا لیکن میں نے اُن سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ مولانا کی نظر بندی ہمارے یہاں اور ہمارے حکم سے نہیں ہوئی۔ شریف نے گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کیا ہی وہاں کوئی بات ہوئی ہوگی"۔ لیکن اپنی طرف سے پوری سعی کرنے کا وعدہ کرکے اُمید افزا اور دل خوش کن جواب دیا ✤

اس وعدے کے نتائج کا عرصہ دراز تک انتظار کیا گیا۔ اور بعض تحریکات کا بھی حال معلوم ہوا اور یہ کہ بعض معتمدانِ سرکار نے حضرت مولانا سے مالٹا میں ملاقات کرکے بعض سوالات کئے مگر افسوس ہی کہ کلفتِ انتظار بڑھتی ہی رہی اور حصولِ مقصود کی کوئی علامت و نشان نظر نہ آیا ✤

جسطرح طبیعتِ انسانی کا اقتضا ہے اس مایوسی کے بعد عرصہ تک سکوت رہا بلکہ بہت سے قلوب میں مضمونِ یاس کا غلبہ ہوگیا۔ اور حضرت کے وابستگانِ دامنِ عاطفت نے جو کچھ صدمہ اور رنج اس زمانہ میں برداشت کیا وہ قابلِ بیان نہیں ✤

حضرت مولانا اور اُن کے رفقا کے خطوط آتے تھے (بعض بہت جلد پہنچ جاتے تھے اور بعض

لہ سلطنتِ برطانیہ اور شریف صاحب کے تعلقات اور حضرت مولانا کی گرفتاری کے واقعات معلوم ہوجانے کے بعد اس عذر کی جو کچھ حقیقت ہے وہ مخفی نہیں رہتی۔ خصوصاً جبکہ آپ اُس جواب کو بھی ملحوظ رکھیں جو سید رضا علی صاحب کو قانونی کونسل کے اجلاس میں دیا گیا تھا ۱۲ ✤

محکمہ سنسری کی عنایت سے کئی کئی ماہ کے بعد۔ اسی طرح ہندوستان کے خطوط بھی حضرت کو کبھی آٹھ آٹھ ماہ کے بعد پہنچتے ہیں جیسا کہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "مگر اتنی مدت میں پہنچا کہ سخت تعجب ہوتا ہے کہ اتنی تاخیر کا کیا باعث ہوا۔ تمنے ۲ جمادی الاولیٰ ۳۳۶ھ کو روانہ کیا اور ہمکو ۲۴ صفر ۳۳۷ھ کو ملا۔ حمل کی مدت معتاد سے بھی بڑھگیا۔ مگر الحمد للہ کہ وصول ہوگیا یہ بھی غنیمت ہے۔"

مکان کے خط میں لکھتے ہیں "تمھاری پندرہ سولہ خط اکٹھے ہوکر مجکو صفر کے اخیر میں ملے شوال ذی قعدہ، ذی الحجہ، ان چاروں مہینوں کے خطوط تھے"۔ مگر یہ دیکھکر جگر خون ہوتا تھا کہ کسی خط میں بھی نہ تشریف آوری کے متعلق کوئی اشارہ ہوتا تھا نہ آزادی کی نسبت ایک حرف۔ اور آزادی کے متعلق وہ کیسے لکھتے اور کیا لکھتے کوئی خبر ہو تو لکھیں۔ کوئی بات ہو تو کہیں۔

ان خطوط میں کیا ہوتا تھا معمولی سلام و دعا، عزیزوں دوستوں کے صدمات وفات پر تعزیت و افسوس، عالم آخرت کی طرف ترغیب، دنیا اور تکالیف و مصائب دنیا کا سریع الزوال اور فانی ہونا، رضا و تسلیم کی تلقین۔ ایک تعزیت نامہ میں مستورات کو تحریر فرماتے ہیں "دنیا میں کوئی چیز یوں ہی نہیں ہوجاتی جو کچھ ہوتا ہے اسکا کرنے والا حق تعالیٰ ہے ہر کام میں اسکی حکمتیں اور رحمتیں ہیں جنکو وہی جانتا ہے تمام دنیا کو اسنے پیدا اور آباد کیا۔ پھر ایک دن سب کو فنا کردیگا اور پھر سب کو نئے سر سے پیدا کریگا۔ اسکے ہر حکم کو حق سمجھنا چاہیئے۔ راحت ہو یا مصیبت ہمت کرکے سر پر رکھہ لینا چاہیئے اور اسکی رحمت سے کبھی مایوس ہونا چاہیئے"

گھر میں اہلیہ صاحبہ کو تحریر فرماتے ہیں "خدا کے سوا کوئی کچھ نہیں کرسکتا اسی پر نظر رکھو اور اسی سے دعا کرو دنیا کے تمام قصے بھلے اور برے ختم ہوجانے والے ہیں اس لئے زیادہ خیال کرنے کی لائق نہیں۔ صبر اور سکوت سے جسطرح ہوسکے اپنے دن گذارو اور اللہ کی رحمت سے متوقع اور اسکی ناراضی سے ڈرتے رہو"

دوسرے خط میں فرماتے ہیں "دنیا بہت گندی اور ناپائیدار ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے امید رکھنا بالکل غلط ہے جو احسان کرے اسکا احسان ماننا چاہیئے اور اللہ کا شکر کرنا چاہیئے۔ کہ اسنے اپنے کسی بندہ سے ہمکو نفع پہنچایا۔ اور جو احسان نکرے اسکی شکایت ہرگز نہ چاہیئے"۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں" بات قابل فکر صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے اور کوئی امر قابل فکر و اندیشہ نہیں۔ آدمی کی سعادت اور خوش قسمتی بس یہی ہے کہ اپنے اللہ رحیم و کریم کو کسی حال میں نہ بھولے اور جہانتک ہوسکے اسکے حکم کو مانے باقی کوئی چیز چنداں اعتبار کے قابل نہیں حسبنا اللہ و نعم الوکیل و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العظیم۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ "حق سبحانہ جو تکلیف ڈالتا ہے اُسکے سامنے قرئی مُحصّنہ اور بروج مشیدہ نسیج عنکبوت سے زیادہ کام نہیں دیتے اور جو راحت دیتا ہے اُسکے آگے غربت و بےکسی درماندگی و بے دست و پائی سب ہباءً منثورا بنجاتی ہیں ؎ گر الست توقیع احسانِ دست ٭ و رہیت منشور احسان دست"

۱۳ رجب ۱۳۳۷ھ کو تحریر فرماتے ہیں۔ "کچھ تحریکات جو پہلے سے شروع تھیں اب اُن کا کچھ ظہور ہو رہا ہے مگر بہت آہستگی سے۔ بہرحال سلسلہ شروع ہے حق تعالیٰ کو جو منظور ہے لابُد ایک روز پورا ہی ہو جاویگا ٭

ایک خانگی خط میں ارشاد فرماتے ہیں" بندہ کی سعادتمندی اسمیں ہی کہ مالکِ حقیقی کے حکم کو گو وہ نفس پر کتنا ہی شاق ہو بصبر و رضا سر پر رکھے اور اُسکی رحمت پر بھروسہ رکھے۔ پریشان نہ ہو اُسکی قدرت و رحمت میں سب کچھ ہے اُسکی قدرت کے سامنے کوئی چیز لا علاج نہیں تکلیف کو راحت راحت کو تکلیف کر دینا اُسکو ہرگز دشوار نہیں" ٭

وہی مولانا دیوبندی جنکو مخالفین ایصالِ ثواب کا منکر کہا کرتے ہیں قید میں بیٹھے ہوئے گھر میں اہلیہ صاحبہ کو تاکید کرتے ہیں کہ "اپنے آگے چلی جانے والی لڑکی کو ثواب رسانی سے مت بھولیو قلیل کثیر جو ممکن ہو وقتاً فوقتاً اُسکو ثواب میں یاد رکھو" ٭

مصیبت ہو یا نعمت رنج ہو یا راحت زمانہ کا قدم کبھی ٹھہرتا ہی نہیں۔ تکالیف کی گھڑیاں اور گھنٹے مہینوں اور برسوں سے زیادہ دشوار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آخر گذر ہی جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی معدوم و محو ہو جاتے ہیں جیسے راحت و مسرت کے ایام۔ اس حالت میں بھی دو سال سے زیادہ گذر گئے اور یہ آخری زمانہ کچھ ایسی خاموشی کا تھا کہ نہ کسی اخبار میں حضرت کا ذکر ہوتا تھا نہ کسی جلسے میں ٭

آخر حالات بدلے۔ تمام نظربندوں کی آزادی کے متعلق ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ (دسمبر ۱۹۱۹ء) میں اعلانِ شاہی صادر ہوا۔ ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ اب سید القوم کے مصداق خادمانِ قوم رہا ہونگے اور استحقاقِ آزادی اور اپنی عظمت و جلالتِ شان کے لحاظ سے ہمارے مذہبی مقتدا شیخ الہند کا نام نامی اول نمبر پہ ہوگا ٭

بگر وائے ناکامی کہ چھوٹے اور بڑے مشہور و غیر مشہور ہندو اور مسلمان ہر قسم کے نظربندوں کو آزادی نصیب ہوئی مگر ہمارے زاہد گوشہ نشین کا کہیں نام ہی نہ آیا ٭

اہلِ اسلام میں عموماً اور حضرت مولانا کے خدام و متوسلین و عزیز و اقارب میں خصوصاً اس زمانہ میں جسقدر اضطراب و تردد و اُمید و انتظار کی حالت رہی اُسکا اندازہ مشکل ہے۔ اُردو اخبارات میں کوئی صورتِ مقصود نہیں نظر آتی تھی تو انگریزی منگائے جاتے تھے۔ اُن سے بھی کار برآری نہیں ہوتی تھی تو مناسب مقامات پر تار دئے جاتے تھے۔ مگر سب بے سُود ❊

دیوبند ہی پر منحصر نہیں تمام ہندوستان میں جس کسی جگہ بھی مولانا کے تلامذہ معتقدین و مخلصین اور احباب موجود تھے نہایت ہی قلق و اضطراب کی حالت میں تھے منتظمانِ دار العلوم کے پاس ہر جگہ سے روزانہ خطوط اور تار آتے تھے دار العلوم کے مدرسین و متعلقین سے اُنکے شناسا لوگ استفسار کرتے تھے کہ مولانا رہا ہوگئے یا نہیں "کہاں ہیں" کب آئیں گے"۔ جب خلاف اُمید اور غیر تسلی بخش جواب پہنچتے تھے تو لوگونکی پریشانی میں اور اضافہ ہوتا تھا ❊

اِن ایام میں حضرت کی رہائی کے متعلق بہت سی افواہیں اور بے اصل خبریں مشہور ہوکر مسلمانوں کے لئے اَور زیادہ تکلیف و دقت کا باعث ہوئیں۔ ایک تار میں کسی جگہ یہ خبر دیگئی تھی کہ "مولانا ابوالکلام آزاد ہو گئے"۔ غلطی یا غلبۂ اُمید سے یہ پڑھا گیا کہ "مولانا اور ابوالکلام آزاد ہو گئے"۔ اسی اعتماد پر دہلی سے دیوبند اور دیوبند سے جابجا خطوط اور تار روانہ ہوگئے۔ اور دیندار طبقۂ اسلام میں ایک بے موقع اور قبل از وقت مسرت کا جوش پھیل گیا۔ جسکے بعد نا اُمیدی سے بہت ہی کلفت ہوئی۔ اَور بھی بعض لوگوں نے کسی مصلحت یا غلطی سے آزادی کی خلاف واقع اطلاعیں دیکر چشم براہ لوگوں کو انتظار کی تکلیف میں مبتلا کیا ❊

اعلانِ شاہی اور اُسپر عملدرآمد دیکھکر اور پھر اسی قسم کی خبریں سنکر اس زمانہ میں بار بار یہ اُمید بندھتی تھی کہ حضرت ضرور رہا ہوکر آرہے ہوں گے اور بقدر تعلق ہر شخص شوقِ دیدار سے بے چین ہو رہا تھا جسکا اظہار بعض حضرات نے اشعار اور نظموں کی صورت میں شروع کیا سب سے پہلے مولانا سراج احمد صاحب معتمد المدیر القاسم والرشید نے ایک تیئیس اشعار کی نظم بعنوان "مژدۂ جانفزا" لکھی جسکے چند شعر یہ ہیں :۔ ؎

مالٹا سے اب نسیمِ جانفزا آنیکو ہے
وہ گئے تو زندگانی کا مزا جاتا رہا

دلمیں جاں آنیکو ہے عیسیٰ ادا آنیکو ہے
اب وہ آتے ہیں۔ تو جینے کا مزا آنیکو ہے

اب لبوں پر خیر مقدم مرحبا آنیکو ہے
قاسمِ خیرات کا وہ لاڈلا آنیکو ہے

بحرِ ہستی کا سفر آسان ہوگا بالیقین
کشتئ طوفان زدہ کا ناخدا آنیکو ہے

ہو مبارک تجھکو ای دار الحدیثِ دیوبند
وہ ترا شیخِ حدیثِ مصطفےٰ آنیکو ہے

پھر پھلیے پھولیگا گلزارِ رشیدی قاسمی
سالکو گھبرائیو مت رہنما آنیکو ہے

استقامت کی تھیں تصویر دکھلاونگا میں
نائبِ شرعِ شہِ ہر دو سرا آنیکو ہے

صورتِ حسنِ توکل جسکے چہرے سے عیاں
وہ شہِ اورنگ زیبِ اتقیا آنیکو ہے

عاشقِ شیدائے محمود اے شہِ عبدالرحیم
آپکا محبوبِ یارِ باصفا آنیکو ہے

ہائے افسوس آج تم دنیائے فانی میں نہیں
جسکے تھے تم منتظر وہ دلربا آنیکو ہے

حضرت آئینگے حسین احمد کو بھی لائینگے ساتھ
شیخ آئیکو ہی ساتھ اسکے فنا آنیکو ہے

شیخ حسین احمد وحید احمد عزیزِ باوفا
دوستانِ باصفا کا قافلا آنیکو ہے

پھر اسی طرز پر بہت سی نظمیں جابجا لکھی گئی اور شائع ہوئی بعض مخلصین نے اسی بحر میں کسی قدر تغیر سے لکھا۔ قاری محمد طاہر صاحب خلف الرشید مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم مدظلہم نے قافیہ بدلکر "شوقِ دید" کے عنوان سے ایسے اشعار میں سوزِ درونی کا اظہار کیا۔ اُن میں سے پانچ سات شعر لکھے جاتے ہیں:۔ ؎

انتظارِ دید میں کیا جانے کیا ہونیکو ہے
حسرتوں میں دل کی اب محشر بپا ہونیکو ہے

ولولے مٹی ہوئے اُمید پر پانی پھرا
زندگی آتش بنی اور دم ہوا ہونیکو ہے

مدرسے میں ہونیوالا ہے طلوعِ مہرِ علم
اس اندھیرے گھر میں اب پھر چاندنا ہونیکو ہے

ہے ثبات و استقامت جسکے قدموں پر فدا
ایک عالم اُسکے قدموں پر فدا ہونیکو ہے

دل پریشاں ہے خدارا یہ ہی بتلا دے کوئی
مالٹا سے کب روانہ قافلہ ہونیکو ہے

آپکی صورت پہ صدقے آپکے رخ پر فدا
اپنا اور بیگانہ چھوٹا اور بڑا ہونیکو ہے

حضرتِ محمود آئیں جلد وہ دن ہو خدا
اسپہ بس ختم دعا و مدعا ہونیکو ہے

اور ایک گمنام قائل صاحبزادہ ممدوح کے اشعار پر یہ اضافہ کرکے اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہوگیا ؎

آئے تشریف لانا ہے تو جلد آجائیے — ورنہ حضرت اب تو اپنا خاتمہ ہونیکو ہے

راہِ سنت میں قدم رکھا ہے جسنے پھونک پھونک — سجدہ گاہِ اولیا وہ نقشِ پا ہونیکو ہے

وہ بھی دن ہو یو کہیے طاہر کہ حضرت آگئے — روز کہتا ہے روانہ قافلہ ہونیکو ہے

مالٹا سے جلوہ گر ہونیکو ہی شمس العلوم — جس سے ہندوستان پر نور و ضیا ہونیکو ہے

ہو چکی ظلمت نظر آئیگا اب آبِ حیات — اب میرا خضر طریقت رہنما ہونیکو ہے

آرہے ہیں دیکھکر جنکو خدا آتا ہے یاد — دیکھنا ہر گھر میں اب ذکرِ خدا ہونیکو ہے

ابرِ رحمت آرہا ہی صورتِ محمود میں — وعدہ لا تقنطوا بیشک وفا ہونیکو ہے

کہتے ہیں آئینگے حضرت کلبۂ احزان میں — رشکِ قالین آج میرا بوریا ہونیکو ہے

آرہی ہے مرقدِ قاسم سے آمین کی صدا — اُن کا بچہ آج مشغولِ دعا ہونیکو ہے

ہاتھ اُٹھاکر صدقِ دل سے آپ سب آمین کہیں — دوستو بابِ اجابت جلد وا ہونیکو ہے

بہر حال یہ زمانہ کسی قدر مسرت آمیز انتظار میں گذر رہا تھا کہ تشریف آوری کی تاخیر اور گورنمنٹ کی خاموشی نے اسکو مبدل بہ کلفت کردیا - خادمانِ دار العلوم دیوبند کی طرف سے حضراتِ منتظمین نے اعلیٰ احکام کو استفسارِ حال کے لئے تار بھی دئے مگر خموشی کے سوا کچھ جواب آیا - عجب ضیق کا زمانہ تھا حال ہی نہ کھلتا تھا ؎

اضطرابم نہ گذارد کہ نشینم جائے — انتظارم نہ گذارد کہ زجا برخیزم

اور اسپر طرہ یہ ہوا کہ حضرت یا اُنکے رفقا کا کوئی خط بھی کسی کے پاس اس زمانہ میں نہ آیا جس سے اتنا تو معلوم ہوتا کہ ہیں کس جگہ ؏

جب کوئی تدبیر اور صورت نظر نہ آئی تو حضرات مہتممانِ دار العلوم دیوبند نے سب خدامِ دار العلوم اور حضرت مولانا کے دوسرے مخلص و مخصوص حضرات سے مشورہ کرکے یہ طے فرمایا کہ معزز مسلمانوں کا ایک وفد جسمیں متوسلین دار العلوم کا زیادہ حصہ ہو ولیسرائے کی خدمت میں پیش ہو قلبی اضطراب اور شوق کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جہانتک ہو یہ مرحلہ جلد طے ہوجائے - اور چونکہ اُن ایام میں ویسرائے کا دھلی قیام تھا اور اُنکی کونسل کے اجلاس وہیں ہو رہے تھے اسلئے سب کی یہی آرزو تھی کہ اسقدر جلد انتظام ہوجائے کہ شملہ اور منصوری کے دشوار سفر اور مصارف برداشت کرنے کی نوبت نہ آئے ؏

لیکن ظاہر ہے کہ وفد لیجانا کچھ آسان اور محض اپنے اختیار میں نہ تھا نہایت سعی و کوشش اور اجازت و انتظامات کی ضرورت تھی۔ انہیں امور کی مصروفیت میں مولانا حبیب الرحمن صاحب کا دہلی جاکر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب سے ملنا ہوا تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ وفد کے اہتمام سے پہلے ویسرائے کی کونسل میں حضرت مولانا کے متعلق سوال ہو جائے تو نہایت مناسب ہے۔ یہ بھی ممکن ہی کہ سوال ہی کچھ حصول مدعا کے لئے موید و موثر ہو ورنہ کم از کم اسکے جواب سے حضرت کا کچھ حال تو معلوم ہو گا اور وفد کے مفید اور ضروری ہونے کا بھی اندازہ ہو جائیگا +

اس رائے کی عمدگی میں کسے کلام ہو سکتا تھا اور جو لوگ انتہائی کلفت برداشت کر رہے ہوں وہ کسی امکانی سعی و تدبیر میں کیسے پس و پیش کر سکتے تھے۔ کونسل کے ایک معزز ممبر کو اس قسم کے سوال پر آمادہ کیا گیا۔ اور خاص حضرت مولانا کی رہائی کے متعلق انہوں نے یادداشت بھی لکھ لی مگر افسوس ہی کہ اسکے بعد انکی رائے بدل گئی اور مخصوص سوال چھوڑ کر عام نظر بندوں کی رہائی کے متعلق سوال پیش کیا۔ اس خلاف توقع تغیر کا حال منتظر و امیدوار لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ سوال اور اسکا جواب اخبارات میں شائع ہو گیا +

اس ناگوار تاخیر و ناکامی کے بعد بھی ہمت قاصر نہ ہوئی اور دہلی میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا کفایت اللہ صاحب نے حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے ملاقات کر کے دوبارہ سوال کرانیکا سامان کیا اور الحمد للہ کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کے سوال پر کونسل میں یہ تسکین بخش سوال حاصل ہوا کہ "مولانا مالٹا سے روانہ ہو کر ہندوستان کے راستے میں ہیں اور انکی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے"+

ایک ضیق و انتشار و بے خبری کی حالت میں یہ جواب بہت کچھ غنیمت معلوم ہوا اور کسی کسی درجہ میں اطمینان حاصل ہو کر وفد کا خیال بے سود معلوم ہونے لگا۔ اگرچہ آزادی کے "زیر غور" ہونے سے گونہ تشویش تھی۔ مگر اسمیں شبہ نہ رہا تھا کہ مولانا جلد ہندوستان پہونچ جائیں گے۔ ہر روز یہ انتظار تھا کہ بمبئی سے تار آئیگا۔ بمبئی میں چند اصحاب حضرت مولانا کے متوسلین کی تحریک پر اور بعض اپنی شوق سے خود ہی روزانہ جہازات کی آمد و رفت کی خبر رکھتے تھے اور یقین تھا کہ جب کوئی معمولی اطلاع بھی ملیگی وہ فوراً تار دینگے۔ پھر بھی بعض مرتبہ شدت اضطراب اور انتظار کی بے چینی میں

ہندوستان سے اُن کے پاس بغرض استفسار تار پہنچ جاتے تھے۔
دو چار روز نہیں ایک عرصہ گذر گیا۔ اور صدائے برنخاست۔ اب یہ انتظار پہلے تمام انتظار سے زیادہ شدید اور تشویشناک تھا۔ کبھی خبر آتی تھی کہ عدن میں ہیں اور کبھی افواہ اُڑتی تھی کہ ہندوستان واپس آنا پسند نہیں فرمایا مکہ معظمہ پہنچا دیے گئے۔

حضرت مولانا کی نظر بندی کے ابتدائی زمانہ کی طرح یہ وقت سکوت اور خاموشی کا نہیں تھا۔ تمام ہندوستان اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ خلافت کمیٹی کے جلسوں میں دوسرے رزولیشنوں کے ساتھ حضرت مولانا کی رہائی کا مطالبہ بھی بلند آہنگی سے کیا جاتا تھا۔

کونسل کے سوال و جواب کے بعد جلد تشریف آوری کی اُمید نے خدام دار العلوم دیوبند سے وفد کے خیال کو ملتوی یا ترک کرا دیا تھا اس تاخیر و تشویش نے پھر تازہ کر دیا۔ صرف اسقدر تردد تھا کہ جب مولانا تشریف ہی لا رہے ہیں تو اب یہ تحریک شاید بے سُود یا مضرت رساں ہو۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب مددگار مہتمم دار العلوم نے باوقات مختلفہ بار بار خدام و متعلقین دار العلوم اور حضرت مولانا سے تعلق و عقیدت رکھنے والے دوسرے مقامات کے علما و مشاہیر سے بطریق مراسلت اور زبانی مشورہ کیا۔ اور یہ قرار پایا کہ وفد مرتب کرنے سے پہلے چند مقامات میں رہائی کے مطالبات کے لگے مخصوص جلسے بھی ضروری ہیں۔ (گو اسوقت تک اکثر مقامات میں دوسرے جلسوں کے ضمن میں اسکی بھی تحریک ہو تی رہی ہے) اسی قرارداد کی مطابق حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا جسمیں تجویز شدہ وفد اور دیوبند کے جلسہ کی اطلاع دیگر دوسرے مقامات کے اہل اسلام کو ۲۶ رجب ۱۳۳۸ھ (۱۶ اپریل ۱۹۲۰ء) یوم جمعہ کو اپنے اپنے شہروں میں جلسے کرنیکی تحریک کیگئی تھی۔ اور اشتہار کی اطلاع کی بموجب اُسی تاریخ کو بعد نماز جمعہ دیوبند میں عام اہل اسلام کا ایک جلسہ ہوا جسمیں دیوبند اور اسکے متعلق دیہات کے مسلمان بہ تعداد کثیر شریک تھے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمن صاحب۔ مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کی جنمیں مناسب حالات و واقعات کے ذکر کے بعد پرزور الفاظ میں گورنمنٹ سے حضرت مولانا کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا اور پھر تمام حاضرین کے اتفاق سے ولیسرائے کیخدمت میں اسی مضمون کا تار بھیجا گیا۔ دیوبند کی تحریک پر اسی تاریخ میں سہارنپور۔ بجنور۔ مراد آباد اور دیگر مقامات پر اسی قسم کے جلسے ہوئے اور ولیسرائے کو تار بھیجے گئے۔

جلسوں کی تحریک اور وفد کی اطلاع کے ساتھ ہی ساتھ وفد کا انتظام بھی شروع ہوا اور حاضریٔ وفد کی باضابطہ درخواست اردو میں مرتب کی گئی۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب خود اسکو لیکر میرٹھ تشریف لیگئے اور نہایت کامل ترجمہ انگریزی میں کرا کر معزز حضرات میرٹھ کی معیت میں کمشنر صاحب میرٹھ کی خدمت میں پیش کی۔ اور انہوں نے اسکو باضابطہ ویسرائے کے پاس سفارس کے ساتھ روانہ کر دیا۔

حضرت مولانا کی رہائی کے متعلق خادمان دارالعلوم کی یہ آخری کوشش تھی اسکے بعد وہ کسی قدر اطمینان کے ساتھ جواب درحاضریٔ وفد کی منظوری اور تعینِ تاریخ کا انتظار کرنے لگے اس اثنا میں اگرچہ حضرت مولانا کے ارشد تلامذہ اور رفیق اسیری مولانا حسین احمد صاحب مہاجر کے خطوط سویز سے ہندوستان آکر باعث تسلی ہو گئے تھے اور اسقدر معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا مالٹا سے روانہ ہو کر سویز تک پہونچگئے ہیں۔ اور اب کسی مناسب جہاز کا انتظار ہے کہ ہندوستان روانہ ہوں۔ لیکن چونکہ آزادی ورہائی کا کچھ حال معلوم نہ تھا اور نہ خط لکھنے والے نظر بندوں کو اسکا کچھ علم تھا اسلئے وفد کو ابتک غیر ضروری نہیں سمجھا گیا تھا اور منظوری حاصل ہونے میں جسقدر تاخیر ہو رہی تھی وہ ناگوار گذرتی تھی۔ نہ حضرت مولانا کے ہندوستان پہنچنے کی کوئی اطلاع آتی تھی نہ وفد کی درخواست کا جواب۔

اسی انتظار میں رمضان المبارک شروع ہو گیا اور نہایت افسوس ہوا کہ سویز میں حضرت مولانا کا رمضان تکلیف سے گذریگا اور یہاں حسرت دیدار میں متعلقین کی عید بے لطف رہیگی۔ یہاں یہی خیال تھا مگر ہزاروں بیقرار مسلمانوں کی دعاء نیم شبی اور عرصۂ راز کی آہ وزاری نے رحمت خداوندی کو متوجہ کر دیا اور ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو مولانا حسین احمد صاحب کا تار عدن سے پہنچا کہ "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہونچ جائیں گے"۔

آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر پدید	اللہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

یہ خبر کیا تھی ایک حیات تازہ تھی جسنے مسلمانوں کے مردہ قلوب کو زندہ کر دیا۔ خبر پہنچتے ہی صدہا تار ہزاروں خطوط ہندوستان کے اس گوشہ سے اس گوشہ تک پہنچ گئے اور مخصوص مقامات پر اسی روز اور دوسرے تیسرے روز عام طور سے سب جگہ یہ بشارت پہنچگئی۔

مایوسی آمیز انتظار اور بے چینی کی حالت میں اس خبر نے دینی مسرت کے جو جذبات پیدا کئے اُن کے بیان سے قلم عاجز ہے اور زبان قاصر - ہر شخص چاہتا تھا کہ تشریف آوری سے پہلے بمبئی پہنچ جاؤں - لیکن بعید سفر تھا اور رمضان المبارک کا مہینہ اور گرمی کی شدت - وسعت و ہمت و طاقت کی ضرورت تھی - بعض لوگ پہونچ سکے اور اکثر معذور رہے اور حضرت مولانا کی خدمت میں ایک بزرگ عالم کا یہ مقولہ بجا طور پر منقول ہوا کہ "حضرت بہت سے غیر حاضر مخلص حاضرین سے زیادہ مشتاق ہیں" - حضرت مولانا خود فرماتے تھے کہ "مجھے تو خیال تھا کہ رمضان کا مہینہ ہے اکثر لوگ حافظ ہیں یا قرآن سننے والے سب اپنے کام میں لگ رہے ہوں گے اتنی دور کون آئیگا - مگر دیکھا تو اپنے پچیس ۲۵ تیس آدمیوں کی جماعت بمبئی میں موجود تھی" -

مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کا روحانی تعلق تمام عوارض و موانع پر غالب آگیا - باوجود قربِ مرض اور بقائے ضعف و نقاہتِ انتہائی شدید گرمی اور روزہ کی حالت میں بمبئی کا ارادہ فرمایا اور راجپوتانہ کے خشک ریگستان اور پہاڑ قطع کرتے ہوئے متھرا ناگدا ریلوی کی ویران لائن میں سفر کر کے مع اپنے دونوں صاحبزادوں اور دو مخصوص شاگردوں کے ۷ رجون کو دس بجے بمبئی جا پہنچے -

حضرت مولانا مدظلہم کے دونوں حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولوی محمد محسن صاحب جنکو جدائی کا ایک ایک روز ایک ایک سال گذر رہا تھا اُن کا جوشِ محبت کب پیچھے رہنے دیتا تھا - یہ دونوں حضرات اور مولانا مدظلہم کے مثل فرزند عزیز داماد مولوی محمد حنیف صاحب سب سے پہلے بمبئی روانہ ہوئے اور انہیں کے ہمراہ حضرت مولانا کے نواسے مولوی محمد رفیع -

مراد آباد سے آخری زمانہ کے سیف اللہ قامع المبتدعین مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اور حضرت مولانا کے چند مخلص اور امروہہ سے حضرت کے نہایت خاموش بے ریا خادم و شاگرد مولوی حافظ زاہد حسن صاحب براہ راست بمبئی تشریف لیگئے - اسی طرح دہلی سے محب العلماء والصلحاء حاجی احمد مرزا صاحب اور حضرت مولانا کے ممتاز شاگرد مدرسہ امینیہ کے مدرس اول مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور جدید تعلیم یافتہ معزز لوگوں میں حضرت مدظلہم کے سب سے زیادہ شیدائی و خادم ڈاکٹر مختار احمد انصاری تاریخ مقررہ سے پہلے بمبئی پہونچ گئے - لکھنؤ سے مولانا محمد عبد الباری صاحب وقت پر پہنچ گئے - اور مولانا

شوکت علی صاحب مسٹر گاندھی صاحب بھی جہاز سے اُترنے کے وقت استقبال کرنے والوں میں موجود تھے۔

گورنمنٹ نے حضرت مدظلہم کا دوستانہ طور پر استقبال کرنے اور بعزت و احترام وطن پہنچانے کے لئے مولانا رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ کونسل بہاولپور کا بہترین انتخاب کیا تھا جو گورنمنٹ کی نظروں میں معتمد ہونیکے ساتھ ہی اپنی خداداد اہلیت و دینداری کی وجہ سے طبقۂ علماء و صلحا میں بھی مقبول ہیں۔ چنانچہ جناب موصوف بھی ۷ رجون کو بمبئی پہونچ گئے تھے۔ تار کی خبر سے سب حضرات ۸ رجون کو مولانا کا جہاز بمبئی پہنچنے کی امید کئے ہوئے تھے۔ اور اسی انداز سے اپنے خیال میں ایک روز پہلے اکثر لوگ ۷ رجون کو بمبئی پہنچے ہیں۔ مگر پہنچنے کے ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ آج صبح کو ایک جہاز مالٹا سے آکر ساحل سمندر سے دو میل کے فاصلہ پر کھڑا ہے۔ مولانا رحیم بخش صاحب کو چونکہ نائب الاستقبال ہونے کی حیثیت سے منجانب گورنمنٹ سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں آپ نے بے تار کے برقی پیام کے ذریعہ سے افسر جہاز سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا یہیں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں بامراد جواب سے دل شاد ہونے کے بعد مولوی صاحب موصوف ایک چھوٹے اسٹیمر میں ملاقات کیلئے حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا اسوقت ظہر کے لئے وضو فرما رہے تھے۔

حضرت رحمہم اللہ فرماتے تھے کہ "مولوی صاحب پر نظر پڑتے ہی یہ خیال و تردد پیدا ہوا کہ مولوی صاحب پر چونکہ گورنمنٹ کو اعتماد ہے ادہر مولوی صاحب کو ہمارے حال پر عنایت۔ لہذا ممکن ہے کہ مولوی صاحب نے ہماری نسبت کوئی ذمہ داری منظور فرمائی ہو جسکی پابندی میں ہمکو کلفت ہو۔ اور خلاف وضعداری خلاف مروّت ہو" مگر گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ الحمدللہ اس قسم کی کوئی ذرا سی بھی بات نہیں ہے اور محض دوستانہ طور پر استقبال و راحت رسانی کی فرمائش ہے۔

فی الحقیقت حضرت مولانا کے لئے یہ نہایت کلفت کا موقع ہوتا اور اپنی آزادی انکو ہزار قید دل سے گراں نظر آنے لگتی۔ کیونکہ ادہر آپ مداہنت سے ہزاروں مراحل بعید، اپنے خیال کے پختہ اور کوہِ وقار ہیں۔ اُدہر خلق مجسم، اپنے دوستوں، شناسا لوگوں، بلکہ اصاغر و خدام کے لئے بھی سراپا مروّت، ہر شخص کی عزت و اعتماد کا تحفظ فرمانے والے تھے۔ عنایتِ خداوندی نے اس کلفت سے بھی محفوظ رکھا۔

سمندر کی تمام گودی مختلف ممالک کے جہازوں سے بھری ہوئی تھی اسلئے حضرت کا جہاز لنگر سے دور ٹھہرا ہوا تھا جہاں پہنچنے اور جانے آنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ اور کثرتِ بادوباران نے تو اسکو گویا محال ہی بنادیا تھا لہذا ۷ جون کو مولانا جہاز ہی میں مقیم رہے۔ چونکہ جہازوں سے اسباب اُتارنے چڑھانے میں بڑی دیر لگتی ہے اسلئے گودی خالی ہوئے اور مولانا کے جہاز کو گودی پر لانے کا انتظار کیا جاتا تو غالبًا باوجود عجلت کے چوبیس گھنٹے اور صرف ہوجاتے۔ استقبال کرنیوالوں کی مشتاق جماعت کو اتنا صبر کہاں تھا +

۸ جون کو علی الصباح دیوبندی جماعت کے چند مخصوص حضرات ایک دُخانی کشتی میں سوار ہوکر مولانا کو لینے کے لئے چلے۔ جہاز کے قریب پہنچکر خدا کی اور عناصر مخلوقہ کی قوت کا تماشا نظر آیا۔ ہَوا اس زور سے چل رہی تھی کہ کشتی کو جہاز کے قریب پہنچنے ہی نہ دیتی تھی۔ ذرا قریب پہنچی اور ہوا کا طمانچہ لگا کہ دور جا پڑی۔ دُخانی قوت بیکار تھی اور انسانی تدبیر بے سُود۔ عجب منظر تھا۔ مولانا جہاز پر کھڑے ہوئے اپنے سچے دوستوں جان نثار خادموں کو دیکھ رہے تھے۔ سلام کا جواب دیتے اور اشارے سے اظہار کرتے تھے مگر نیچے نہیں آسکتے تھے۔ اِدھر ہر ایک کا یہی دل چاہتا تھا کہ مبیاختہ قدموں پر جا گرے لیکن قدرت نہ تھی۔ دو گھنٹے یہی تماشا رہا۔ جہاز کے چاروں طرف کشتی کو پھرایا کہ شاید کسی طرف ہوا کا زور کم ہو مگر وہاں ہر سمت ایک ہی عالم تھا۔ بہزار کوشش کشتی ذرا قریب آتی تھی کہ فورًا ہوا دُور پھینکدیتی تھی +

حضرت کے سب علما کو ایک کار آمد شعر کا مضمون یاد آگیا ؎

اِذَا لَمْ تَسْتَطِعْ شَیْئًا فَدَعْہُ ، وَجَاوِزْہُ اِلٰی مَا تَسْتَطِیْعُ

اس تدبیر سے ہاتھ دھوئے اور ایک اَور صورت تجویز کی۔ کسی معزز مسافر (غالبًا پارسی) کو اُتارنے کی ضرورت سے ایک کشتی پہلے سے جہاز سے بندھی ہوئی تھی۔ اُن لوگوں سے صورتِ حال کو ظاہر کیا اُنہوں نے ان سب کی وجاہت اور حضرت مولانا کی عظمت کے لحاظ سے بخوشی منظور کرلیا کہ مولانا اُسمیں اُترکر کنارہ پر چلے جائیں +

حضرت مدظلہم چونکہ بہت ضعیف ہوگئے تھے اور اس کشتی میں پہنچنا بھی خالی از دقت نہ تھا اسلئے

۱؎ جب کوئی بات قابو میں نہ آئے اُسے چھوڑ دو + اور کوئی ایسی صورت اختیار کرو جو طاقت میں ہو ۱۲

اپنے خاص خادم ورفیق مولانا حسین احمد صاحب کی اعانت سے بہ مشکل اس چھوٹی کشتی میں پہنچے اور اُسنے لیجاکر چھوٹے اسٹیمر میں پہنچا دیا۔ جسمیں خاص خاص حضرات مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب مولوی حافظ محمد محسن صاحب۔ حافظ محمد طاہر صاحب۔ مولوی محمد حنیف صاحب۔ مولوی محمد طیّب صاحب۔ مولانا رحیم بخش صاحب وغیرہ آپکو لینے کے لئے آئے تھے پر جوش و مخلصانہ مصافحے معانقے جوشِ گریہ فرطِ مسرت کا عالم قابلِ دید تھا۔ الفاظ میں اُسکے اظہار کی کوشش بے سود ہے ؞

سب سے پہلے مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے بہ چشمِ پُرنم معانقہ فرمایا۔ پھر اپنے حقیقی بھائیوں سے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ موقع بہ موقع سب سے سلام کے بعد مختصر مزاج پرسی کرتے ہوئے اسٹیمر کنارے لگ گیا۔ جہاں بمبئی کے امیر و غریب عوام و خواص ہزارہا ہندو مسلمان اور معزز قومی لیڈر استقبال کیلئے موجود تھے[۱] حضرت نے اللہ اکبر کے پُرعظمت و مسرت نعروں کی آواز میں ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۸ جون ۱۹۲۰ء) ایک بجے دن کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھکر سرزمینِ ہندوستان کو قدومِ میمنت لزوم سے معزز فرمایا۔ بالکل آنکھوں سے نظر آتا تھا کہ ؎

اے تماشا دیکھنے والو خدا کی شان کا　　بھیس میں درویش کے فرمانروا آیا ہے آج

بمبئی کے والنٹیروں نے اپنے مضبوط حلقے میں لیکر حضرت مولانا کو موٹر میں سوار کرایا اور حاجی احمد صدیق کھتری صاحب کے مکان کیطرف روانہ ہوئے۔ باوجود کسی قدر بارش کے رستہ میں مخلوق کا بیشمار ہجوم تھا۔ اور اللہ اکبر کی پُرجوش متواتر آوازیں مسرت و شادمانی کا اظہار کر رہی تھیں ؞

لیڈرانِ قوم اور مسلمانانِ بمبئی کو تو بہی آرزو تھی کہ اعلٰی پیمانہ پر حضرت کا جلوس نکالا جاوے لیکن چونکہ حضرت کے مزاج شناس اور طبیعت سے واقف لوگ بھی موجود تھے۔ اسلئے حضرت مدظلہم کے خلاف طبع کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ احمد صدیق صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور ہزارہا لوگ وہاں آکر مصافحہ و زیارت سے مشرف ہوئے۔ منارہ مسجد میں خلافت کمیٹی اور مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے ایک نہایت مناسب مضمون کا ادریس مشتمل بر خیر مقدم وغیرہ دیا گیا۔ اور حضرت مولانا کی طرف سے بھی بہ تعمیلِ ارشادِ خداوندی فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا[۲] بہترین جواب دیا گیا ؞

---

[۱] مولانا عبد الباری صاحب۔ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی صاحبان۔ اور مسٹر گاندھی جی سیٹھ چھوٹانی صاحب احمد صدیق کھتری صاحب وغیرہ مشاہیر وغیر مشاہیر

[۲] حکم ہوتا ہے کہ جب کوئی تمکو سلام کرے تو اُس سے بہتر طریق پر جواب دو (یہ مستحب ہے) یا اُسی قدر جواب دیدو (یہ واجب ہے)

بمبئی کے معزز لوگونکی استدعا تھی کہ حضرت چند روز یہاں قیام فرماویں تاکہ مشتاق لوگوں کو زیارت اور مہمانداری وضیافت کی عزت حاصل ہو۔ لیکن رمضان المبارک کا مہینا اور آخری عشرہ تھا۔ خود حضرت کو بھی اس قیام میں بے لطفی اور تمام ہمراہی علما وصلحا کی تکلیف کا اندیشہ تھا۔ علاوہ ازیں حضرت کی اہلیہ صاحبہ (مرحومہ) کی زیادہ بیماری کی خبریں پہنچ چکی تھی۔ اسلئے بھی اطمینان نہ تھا۔ لہذا حضرت نے قیام منظور نہیں فرمایا۔ اگلے ہی روز ۲۱ رمضان المبارک کو روانگی کا قصد کیا۔ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت مولانا کے ہم سبق اور مخلص دوست مولانا قاضی محی الدین صاحب مرادآبادی اُسی روز بمبئی پہنچے۔ قاضی صاحب نے چونکہ نہایت ضعف اور مرض کی حالت میں محض قلبی تعلق کی وجہ سے صعوبتِ سفر برداشت کی تھی۔ حضرت مولانا کے اخلاق ومروت نے گوارا نہ کیا کہ قاضی صاحب بلا کسی راحت کے دوبارہ تکلیفِ سفر میں مبتلا ہوں۔ اسلئے ایک روز قیام فرمایا۔ اور ۲۲ ماہ رمضان (۱۰ جون پنجشنبہ) کو بعد مغرب ۸ بجے بمبئی سے مع اپنے تمام رفقا اور استقبال کرنے والوں کے روانہ ہوئے ✤

حضرت مولانا کی عظمت اور رفیع منزلت کو ملحوظ رکھکر اور راحت کے خیال سے مولانا رحیم بخش صاحب نے تو آپکے لئے سکن یا فسٹ کلاس کا انتظام کرنا چاہا تھا۔ مگر حضرت مولانا نے سادگیٔ طبع، تواضع، منکسر المزاجی، نیز بعض ہمراہیوں کی رعایت سے درجہ سوم میں سوار ہونا پسند فرمایا اور ایک خالی گاڑی دیکھکر تمام جماعت نے اُسی میں بستر جما دئیے۔ اور اس اجتماع سے براحت سفر طے ہو گیا ✤

اگرچہ سفر میں شریعت نے افطار کی اجازت دی ہی۔ لیکن بلا ضرورت شدید ماہِ مبارک کی فضیلت چھوڑنے کو طالبانِ اجر و ثواب پسند نہیں کیا کرتے۔ اسی لئے حضرت مدظلہم اور آپکے اکثر رفقا وہمراہیان روزہ دار تھے اور دو چار حضرات حسب اجازتِ شرعی افطار کئے ہوئے تھے۔ اور بالکل جیسا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سفر رمضان کے متعلق مِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَلَا يَعِيبُ بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ[۱] مروی ہے اس مقدس مجمع میں بھی ایک دوسرے پر طعن وتعریض نہیں کرتا تھا۔

بمبئی میں حضرت کا قیام اُمید سے بہت کم ہوا اسلئے اطرافِ بمبئی کے بعض مشتاقانِ زیارت جو ۲۲ رمضان کے بعد بمبئی پہنچے زیارت سے محروم رہگئے ✤

---

[۱] ہم میں سے بعض لوگ روزہ دار ہوتے تھے اور بعض افطار کرنیوالے۔ پھر کوئی شخص دوسرے پر طعنہ نہیں کرتا تھا ۱۲

بہر حال ۲۳ رماہ مبارک کی شب کو بمبئی سے روانہ ہوئے جن لوگوں کے دوستوں رشتہ داروں نے بمبئی سے بذریعہ تار انکو مطلع کر دیا تھا وہ جا بجا راستے میں اسٹیشنوں پر حاضر ہو کر اور اپنی ہمراہ بہت سے مسلمانوں کو لاکر زیارت و مصافحہ سے مشرف ہوتے رہے اور جن صاحبوں کو دیر میں اطلاع ہوئی وہ کف افسوس ملتے رہے +

پہلی قرارداد اور ۹ رجون کو روانگی کے خیال کے مطابق جناب مہتمم صاحب دارالعلوم کا ۸ رجون کا تحریر فرمودہ خط ۱۱ رجون کو بروز جمعہ دیوبند پہنچا کہ حضرت مولانا جمعہ کے روز دہلی پہنچ جائیں گے اور شنبہ کو دیوبند۔ اور اسی خبر کا جمعہ کی نماز کے بعد دیوبند کی جامع مسجد میں اعلان ہوگیا۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے خدام و متوسلین میں ایک اضطراب پھیل گیا۔ سیکروں تیز گام تین بجے کی گاڑی سے دہلی روانہ ہوگئے اور ضعفاء گرانبار اپنی محرومی پر حسرت کرتے رہ گئے کہ دہلی کی حاضری بھی نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اسی وقت بمبئی سے جناب مہتمم صاحب کا اطلاعی تار پہنچا کہ ۹ رجون کو نہیں ۱۰ کو روانہ ہو کر بروز شنبہ ۱۲ رجون کو دہلی اور یکشنبہ کو دیوبند پہونچینگے۔ اس خبر نے ضعیفوں کی کمر ہمت بندھائی ذرا جان میں جان آئی اور شب کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ الحمد للہ کہ اسطرح حضرت مدظلہم کے اکثر اقربا، خدام، دار العلوم دیوبند کے وہ خدام و مدرسین جو بمبئی پہونچنے سے عاجز رہ گئے تھے سب کے سب ۲۴ ررمضان (۱۲ رجون) کی مبارک و میمون صبح کو دہلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نظر آنے لگے۔ اور ان کے علاوہ مراد آباد، امروہہ، خورجہ، بجنور وغیرہ کے حضرات اور ساکنان دہلی عام وخاص فقیر و امیر، مدارس کے طلبہ، دفتروں کے ملازم، شایستہ لباس میں جوق در جوق چلے آرہے تھے اور اسٹیشن کی رونق بڑھا رہے تھے۔ اس راحت آمیز انتظار کو کچھ دیر نگذری تھی کہ جی آئی پی ریلوے نے اپنی تمام عمر کا بہترین کارنامہ دکھلایا۔ اور آٹھ بجے سلطان القلوب کی گاڑی کو پلیٹ فارم پر پہنچایا +

اسوقت کا جوش قابل نظارہ تھا۔ بلا مبالغہ کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا ہر شخص بلا تحاشا اسی گاڑی کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ آخر ذرا وقفہ کے بعد اس مقدس ہستی نے اپنی پرانی وضع میں پلیٹ فارم پر متبرک قدم رکھا۔ نہایت سادہ نیچا کرتہ زیب بدن تھا اور سر پر ایک مختصر عمامہ بندھا ہوا تھا۔ عرصہ دراز کی صعوبات اور سفر کا تکان نورانی چہرہ پر نمایاں تھا اور حضرت مولانا نہایت ہی ضعیف نظر آتے تھے +

گاڑی سے نیچے قدم رکھنا تھا کہ چار طرف سے اللہ اکبر کے مسرت خیز نعروں کی آواز نے اسلامی شان وہیبت کا منظر دکھلا دیا۔ آدمیوں کا سیلاب ٹوٹ پڑا اور بے قاعدہ انبوہ نے حضرت کو گھیر لیا ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔ کوئی مصافحہ کرتا تھا کوئی معانقہ کی آرزو رکھتا تھا کوئی قدموں پر گرتا تھا۔ کوئی آپکے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا تھا۔ غرض ہر ایک ممکن طریقہ سے مخلوق اظہارِ عقیدت کر رہی تھی۔ اور حضرت مولانا بھی تا امکان خود مصافحہ اور مزاج پرسی اور کلماتِ تعارف سے دریغ نفرماتے تھے۔ اس کشاکش میں لوگوں کو سخت تکلیف ہونے کے علاوہ حضرت مولانا کو نہایت شدید جسمانی گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا اسلئے دہلی کے رضاکاروں نے ایک مضبوط حلقہ اپنے ہاتھوں کا بناکر مولانا کو اُسکے اندر لے لیا۔ اگرچہ سلام و مصافحہ کا بے پایان سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ لیکن حضرت مولانا کسی قدر محفوظ ہوگئے۔ بہرحال نہایت دشواری کے ساتھ یہ مجمع اسٹیشن سے باہر ہوا۔ اس ابتری اور بے ضابطگی کی وجہ سے اکثر لوگ مصافحہ سے محروم رہگئے۔ اور بعض کو زیارت بھی نصیب نہ ہوئی ٭
باہر تشریف لانے کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب آپکو موٹر پر سوار کرکے اپنی کوٹھی پر لیگئے جو شہر سے باہر نہایت بعید ہے۔ مگر مشتاقانِ زیارت کسی نہ کسی طرح وہاں بھی پہنچے۔ بعض مستعار اور کرایہ کی سواریوں پر اور بعض قدرتی بائیسکل پر ٭

حضرت مولانا کے رُفقا اسٹیشن پر اسباب کو بحفاظت روانہ کرانے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہرے اور پھر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر دریا گنج پہونچگئے۔ باہر سے آنیوالے لوگ اپنی تعارف کی جگہ مختلف مقامات پر ٹھہر گئے اور تمام دن کوٹھی پر لوگوں کی آمدرفت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں حضرت مولانا ایک وسیع مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ اور لوگ حاضر ہوکر اطمینان کیساتھ مصافحہ معانقہ مکالمہ سے مشرف ہوتے تھے۔ اور حضرت مدظلہم قدیم تعلق کے مناسب ہر شخص سے اُسکے مختصر حالات اہل و عیال کی خیریت اور اُسکے اہلِ وطن اور دوستوں کی کیفیت دریافت فرماتے تھے ٭

اسی مختصر قیام میں ایک مرتبہ قبل از دوپہر اور پھر شب کو حضرت مولانا اپنے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد اور مقدس نمونۂ سلف یعنی مولانا عبد العلی صاحب مہتمم مدرسہ عبد الرب کی ملاقات کو تشریف لیگئے جو بوجہ ضعف و معذوری خود تشریف نہیں لاسکتے تھے۔ اور ظہر کے بعد مولوی امین الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ امینیہ کے مکان پر بہ تقریب تعزیت تشریف لیگئے اور واپسی میں ایک مشتاق دیدار مریض

کی عیادت کو ✤

رات کا اکثر حصّہ بیداری میں بسر ہوا اور قبل نماز صبح دیوبند کی روانگی کا انتظام شروع ہوا سب لوگ اپنی اپنی جائے قیام سے اسٹیشن پر پہنچ گئے - صدہا اہلِ دہلی خوابِ شیریں کو چھوڑ کر حضرت شیخ الہند کی مشایعت کا ثواب حاصل کرنے کیلئے اسٹیشن پر موجود تھے ✤

تشریف آوری کی بہ نسبت اسوقت اگرچہ حاضرین کی تعداد بہت کم تھی لیکن پھر بھی اسقدر ہجوم تھا کہ رخصت ہونے والوں کو بمشکل مصافحہ کا موقع ملتا تھا - یہاں بھی حضرت کے لئے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید اگیا تھا مگر آپ نے ایک معمولی انٹر کلاس میں اپنے خدام و دوستوں کے ساتھ سفر کرنے کو ترجیح دی - پانچ بجے اَللّٰہُ اکبر کی بلند آوازوں کے ساتھ دہلی سے گاڑی روانہ ہوئی بہت سے لوگ قریب کے اسٹیشنوں کے ٹکٹ خرید کر سوار ہو گئے - بعض نے دیوبند تک ہمراہ رہنے کو غنیمت سمجھا ✤ درمیانی اسٹیشنوں پر بعض جگہ صدہا اور بعض جگہ ہزارہا بندگانِ خدا مشتاقِ دیدار کھڑے تھے - اور جہانتک ممکن ہوتا تھا مصافحہ کرنیکی کوشش کرتے تھے - حضرت مولانا بھی ان لوگوں کی تکلیف کا خیال اور آرزو کا لحاظ کرکے جب تک گاڑی کی رفتار تیز نہ ہو جاتی تھی ہاتھ نہ کھینچتے تھے ✤

بعض حضرات کی سفارش سے حضرت مولانا سے نیم رضا حاصل کرکے مولوی مظہر الاسلام صاحب جالندھری نے نہایت اچھے لہجے میں اپنا قصیدہ پڑھکر سامعین کو محظوظ کیا جسکے چند اشعار یہ ہیں :- ✤

دھوم ہے محبوب محبوبِ خدا آیا ہے آج — وارثِ کُل انبیا ہر و اولیا آیا ہے آج
جسقدر جاتا رہا اس سے سوا آیا ہے آج — کُل شہیدانِ وطن کا خوں بہا آیا ہے آج
لائے ہیں تشریف مولانا مبارک دیوبند — خوش ہو اے کنعاں کہ پھر یوسف ترا آیا ہے آج
وہ محدث وہ جہاں استاذ محمود الحسن — یعنی شیخ الہند اسیر مالٹا آیا ہے آج
اے تماشا دیکھنے والو خدا کی شان کا — بھیس میں درویش کے فرمانروا آیا ہے آج
کل تلک جو غیر ممکن تھا وہ ممکن ہو گیا — بیٹھ کر کشتی میں دریا علم کا آیا ہے آج

محل و موقع کا تناسب ، خود مصنف کا بیان ، لہجہ دلکش ، ممدوح کی موجودگی ، سامعین متاثر ہو رہے تھے - ہر طرف سے داد مل رہی تھی - سب کو سنکر اخیر میں حضرت نے فرمایا کہ ہاں صاحب یہ تو مشہور ہی ہے کہ شعر جتنا خلاف واقع ہو اچھا ہوتا ہے - (مقولہ اشعرھم اکذبھم کی طرف اشارہ تھا)

اور ضمناً مضامین مذہبیہ کی تردید ہے) ٭

مسلمانان میرٹھ نے اسٹیشن پر ایک سپاسنامہ پیش کیا ایک شخص نے گاڑی کے اندر کھڑے ہو کر حضرت مولانا کے سامنے پڑھا اور اسی وقت مطبوعہ کاپیاں تقسیم ہوئی - اسمیں مولانا کی آزادی پر خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کیا گیا تھا - اور حضرت کی جدائی میں اہل اسلام کے اضطراب وبیقراری اور اس کی سعی کا اظہار تھا اور گورنمنٹ کی بے انصافی کا شکوہ - حضرت کی صداقت و استبازی عزم و استقلال و للہیت کی توصیف کی گئی تھی - اور آپکی تکالیف پر اظہار ہمدردی - اور موجودہ زمانہ کے اسلامی حوادث و مصائب اور مسئلہ خلافت میں دشمنوں کے ارادوں کی صراحت اور احکام مذہبی کی رہنمائی میں حضرت مولانا سے استعانت کی گئی تھی ٭

حضرت مولانا کی طرف سے آپکے معزز و عزیز رفیق مولانا حسین احمد صاحب نے گاڑی کے دروازے پر کھڑے ہو کر پلیٹ فارم کے موجودہ مسلمانوں کی طرف خطاب کر کے لکھا ہوا جواب پُر رعب لہجہ میں سنایا - جسمیں خدا تعالیٰ کا شکر - اہل اسلام کی ہمدردی کا شکریہ - مصائب و تکالیف کا منجانب اللہ ہونا ، اور گذشتہ مصائب کا ذکر غیر مفید ہونا - اہل اسلام کی تکالیف و مصائب کی واقعیت اور اپنی طرف سے اظہار حق اور عندالضرورت تعلیم و رہنمائی کی مستعدی وغیرہ بیان کیگئی تھی ٭

جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے ہر ایک چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مسلمانوں کا ہجوم رہتا تھا اور بہت سے ہندو بھی درشن کرنیکے شوق میں چلے آتے تھے منظفر نگر کے اسٹیشن پر اطراف و جوانب دو دو دیہات کے لوگ دور تک پھیلے ہوئے تھے اسلئے آپکو ایک بلند چوکی پر کھڑا کر دیا گیا - تاکہ سب زیارت کر سکیں قریب کے ہزار ہا لوگوں نے مصافحہ بھی کیا - اور اس کوشش میں کئی آدمیوں کے خفیف چوٹ بھی لگ گئی ٭

مظفر نگر کے بعد روہانہ کا بہت چھوٹا اسٹیشن آیا - یہ بھی مجمع سے خالی نہ تھا - یہ مقام دیوبند سے صرف آٹھ میل ہے اور درمیان میں کوئی اسٹیشن حائل نہیں اسکے گذرنیکے بعد حدود دیوبند شروع ہو جاتی ہیں - یہاں سے گاڑی چلی اور حضرت مولانا پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی - دیوبند کی سرزمین پیش نظر تھی - اسکے متعلق سرسبز کھیت آم وغیرہ کے باغ سامنے تھے - مولانا کی حقیقت شناس نظر ادھر سے اُٹھتی نہ تھی - اور دلمیں کرشمۂ قدرت خداوندی کا مضمون موجزن تھا کہ وہ کس طرح اپنے ایک ضعیف

بندے کو ہزاروں میل کا سفر کرا کے کیسے کیسے بعید و عجیب ملک و شہر، کتنے کتنے دریا و سمندر دکھلا کر کیسی مضبوط و مستحکم نظر بندیوں سے چھڑا کر آج پھر اپنی اسی پرانی سرزمین میں واپس لا یا ہے"۔ یہ پر عظمت مضمون جسکے ادا کرنیکے لئے الفاظ میسر نہیں ہیں۔ حضرت کی صورت، شکل، طرز، ادا، نظر، سے بالکل ٹپکا پڑتا تھا اور بداہت کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن خاکسار نے اپنی طالبعلمانہ طبیعت کے انداز پر دو تین لفظ لکھکر حضرت سے اسکی تصریح کرا لی۔ والحمد للہ علی ذلک۔

بالآخر نو بجے دیوبند کا اسٹیشن آگیا اور سیر مالٹا پانچ برس کے بعد اپنے وطن پہنچے اسٹیشن کے چار طرف خلقت کا ہجوم تھا اور اسٹیشن کے اندر تل رکھنے کو جگہ نہ تھی گاڑی سے اترنے نہیں پائے تھے کہ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائے آسمانی گونج گئی۔ اور اس شمع ہدایت پر مخلوق خداوندی پروانوں کیطرح بے تحاشا گرنے لگی۔ وہی اظہار عقیدت اور وہی حالت جو دہلی کے اسٹیشن پر گذر چکی تھی یہاں بھی پیش آئی اور چند قوی الہمت مخلص خدام نے حضرت کو حلقہ میں بلکہ گود میں لیکر بمشکل تمام گھوڑا گاڑی پر پہنچایا۔

پہلے یہ تجویز ہوئی تھی کہ ایک مخصوص سواری تام جھام میں حضرت سوار کیے جائیں اور خدام اسکو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کرلے چلیں۔ لیکن حضرت مولانا نے اپنی طبعی تواضع سے نہایت سختی سے انکار فرمایا اور گاڑی میں سے گھوڑے کھولکر آدمیوں کو کھینچنے کی بھی اجازت نہ فرمائی۔

حضرت مولانا کو دیوبند میں سب سے زیادہ عزیز اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار اور احادیث وعلوم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا سرچشمہ تھا یعنی دار العلوم دیوبند۔ جس طرح بوقت رخصت سب سے آخر میں مدرسہ کو رخصت کر کے تشریف لیگئے تھے۔ اسی طرح سب سے پہلے اسٹیشن سے براہ راست دار العلوم کو اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرمایا۔ اور دار الحدیث کے سب سے بڑے (زیر تعمیر) کمرے میں تشریف فرما ہوئے۔ تمام مجمع کے ساتھ ملکر دعا فرمائی۔ جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ مصافحہ اور زیارت سے مشرف ہوئے۔

تقریبًا گیارہ بجے مولانا اپنے مکان پر تشریف لیگئے۔ جہاں پس پردہ صدہا مستورات سلام ومبارکباد کے لئے حاضر تھیں۔ اور اہلیہ صاحبہ (جو بہت علیل تھیں) اور صاحبزادیوں اور دیگر اہل خاندان کو دیدار سے مشرف فرمایا۔ اور تسلّی وتشفی دی۔ مردانہ مکان لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور جدید حاضرین آکر مجمع کو بڑھا رہے تھے اور مصافحے ومعانقے کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا اسلئے حضرت کے بھائی صاحب مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے آپکو علیحدہ زنانخانے میں لیجا کر آرام کرنے کیلئے

مٹا دیا اور مجمع منتشر ہو گیا +

جو لوگ مختلف مقامات سے آکر زیارت و ملاقات کیلئے دہلی میں جمع ہو گئے تھے اُن میں سے صدہا حضرات مولانا کی ہمراہ دیوبند چلے آئے تھے اور درمیانی اسٹیشنوں سے بہت مشتاقانِ دیدار ساتھ ہو گئے تھے۔ اسلئے دیوبند میں ایک معقول تعداد علما و صلحا و دیندار طبقہ کی جمع ہو گئی تھی۔ اور دیوبند پہنچ جانیکی اطلاع ملنے کے بعد تو ہر روز ہر ٹرین میں اس کثرت سے مہمان آنے لگے تھے کہ ایک عظیم الشان اسلامی جلسہ کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ اول تو کسی کا جانیکو دل ہی نہ چاہتا تھا اور اگر اپنی ضرورت و مصلحت سے مجبور ہو کر دس مہمان کسی گاڑی سے رخصت ہوتے تھے تو بیس اُن کی جگہ آجاتے تھے +

حضرت مولانا کا توکل اور اعتماد علی اللہ ان سب کی مہمانداری کیلئے کافی تھا لیکن ظاہری طور سے ایسے کثیر مجمع کے انتظام و اہتمام میں جو کچھ دشواری ہوتی ہے وہ مخفی نہیں۔ لہذا اسکو پہلے ہی ملحوظ رکھکر حضرت کی تشریف آوری سے قبل جناب مہتمم صاحبان دار العلوم نے بمشورہ دیگر خدام و مخلصین یہ انتظام کرکے ایک طویل فہرست مرتب کر لی تھی کہ حسب حیثیت ہر شخص ایک یا دو وقت تمام مہمانوں کی ضیافت کے مصارف کا متکفل ہو اور انتظام اُسکا مدرسہ کے مطبخ میں کر دیا جائے +

اسی تجویز کے موافق سب سے پہلی اور بڑی دعوت بعد مغرب بوقت سحر ابن فرد فرید اور فخر زمانہ شاگرد رشید کے تمام مہمانوں کی حضرت مرشد و اُستاذ قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہوئی یعنی مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم نے اُسکا اہتمام و تکفل فرمایا اور اُسکے بعد بھی جناب موصوف نے چند مرتبہ حسب موقع نہایت سیر چشمی سے تمام مہمانوں اور بہت سے اہل شہر کی دعوت کی +

اسکے بعد مدرسین و متعلقین دار العلوم اور حضرت مولانا کے مخلصین و تلامذہ اور بعض اعزہ و متوسلین کی طرف سے نوبت بہ نوبت ہر دو وقت دعوت ہوتی رہی۔ حضرت مولانا اگرچہ بالطبع اپنے متوسلین و مخلصین کی تکلیف کو گوارا نہیں کرتے تھے لیکن اُن کے اخلاص و محبت اور دلی شوق کی رعایت سے اس انتظام کو قبول فرما لیا تھا اور نہایت بشاشت و فرحت سے خود بھی شریک ہوتے تھے اور آپکے اکثر اقارب و اعزہ بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ کھانا اکثر مدرسہ کے مطبخ میں تیار

ہوتا تھا اور دار العلوم کے طلبہ اور بعض اہلِ شہر اپنی سعادت سمجھکر اسی خدمت میں لگے رہتے تھے اسلئے مہمانداری وضیافت کا ایک مستقل محکمہ ہوگیا تھا۔ اکثر اوقات دار العلوم اور دار الحدیث کے جدید التعمیر وسیع کمروں میں مہمانوں کی بڑی بڑی جماعتوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور کبھی اگر مہمانوں کی تعداد ذرا کم ہوتی تھی تو حضرت کے مکان ہی پر کھانا پہنچا کر اہتمام و انتظام سے کھلایا جاتا تھا۔ بعض مخلص معمولی سادہ کھانے کا انتظام کر سکتے تھے اور بعض اصحابِ وسعت مکلف کھانا تیار کراتے تھے۔ یہ انتظام و اہتمام بدستور رہا یہانتک کہ حضرت مولانا نے سفر کا قصد فرمایا اور بہت سے لوگ اس سعادت اور مہمانوں کی خدمت سے محروم رہگئے ؞

اگرچہ شدید گرمی کے روزہ کی تکالیف بھی مشتاقانِ دیدار کے لئے سفر سے مانع نہ تھی اور رمضان المبارک میں بھی مہمانوں کی آمد کچھ کم نہ تھی لیکن ماہ صیام کی قیود، قرآن مجید و تراویح کی پابندی، بہت سے دیندار لوگوں کو حاضری سے روک رہی تھی۔ اسلئے ماہ مبارک کے بعد مہمانوں کی آمدرفت بہت زیادہ ہوگئی تھی اور جب تک حضرت کے سفر (بجانب لکھنؤ و فتحپور ہسوہ) کا بخوبی اعلان نہیں ہوگیا یہ کثرت بدستور رہی ؞

بلا تمیز امیر و غریب رئیس و فقیر جن مہمانوں کی حضرت کے مکان پر وسعت ہوتی تھی وہ وہاں قیام کرتے تھے اور باقی دار العلوم کی درسگاہوں کے وسیع کمروں میں۔ رسمی رضا کاری اور والنیٹری کا اسوقت انتظام تھا لیکن حضرت مولانا کے خدام اور دار العلوم کے طالب علم اس محنت و محبت سے مہمانوں کی خدمت کرتے تھے اور حتی الوسع راحت رسانی میں سعی کرتے تھے کہ باوجود کثرت کے انہیں کسی قسم کی تکلیف و شکایت نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ دار العلوم میں تعطیل کا زمانہ تھا اسلئے طلبہ کو اور بھی زیادہ وقت مہمانوں کی خدمت میں صرف کرنیکا موقع ملتا تھا ؞

حضرت مولانا بہ تعمیل ارشاد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم [۱] اِنَّ لِضَیْفِکَ عَلَیْکَ حَقًّا مہمانوں کی ملاقات و مدارات کو عبادت سمجھکر ہر وقت اسکے لئے تیار رہتے تھے یہانتک کہ آرام و راحت اور نوافل و وظائف کیلئے بھی گویا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ ہر وقت مجمع رہتا تھا اور مکان بھرا رہتا تھا صبح کی نماز کے بعد ایک ذرا وقفہ کر کے حضرت مجمع میں بیٹھ جاتے اور اسی طرح اکثر اوقات بیٹھے رہتے۔

---

[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو بہت سے حقوق کی تعلیم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے ۱۲ ؞

حاضرین میں سے کبھی کسی اہلِ علم کے چھیڑنے پر مفصلہ بن علیہ کیطرف پورے متوجہ ہو جاتے۔ اور کبھی حسب موقع سفر کے واقعات، مالٹا کے حالات، نہایت بشاشت و انشراح سے بیان فرماتے۔ اور دوسرے اوقات میں جدید مہمانوں کے سامنے وہی واقعات کبھی مکرر نقل فرماتے۔ کبھی مخصوص شاگردوں کے عرض کرنے پر اور کبھی کسی اہلِ علم کی تشریف آوری پر اپنے ترجمۂ قرآن مجید کا مقدمہ خود زبان مبارک سے نہایت دلچسپی سے پڑھکر سناتے اور مناسب مواقع پر مختصر تقریر کر کے سمجھاتے اور جابجا کسر نفسی اور تواضع کے کلمات فرماتے رہتے۔ اور داد کے منتظر نہیں بلکہ معمولی شاگردوں سے بھی اصلاح کے متوقع رہتے۔ اُستاد[1] رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آجاتا تو محو ہو جاتے۔ نام پیچھے زبان سے نکلتا تھا پہلے آنسو بھر آتے۔ گھنٹوں یہی ذکر رہتا۔ آپکے حالات، واقعات، علمی تحقیقات نقل فرماتے رہتے۔ اور جب تک نماز کا وقت یا اور کوئی ضروری امر پیش نہ آجاتا یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا +

رمضان المبارک کی متبرک راتوں میں تراویح کے بعد دار العلوم میں تشریف لیجاتے۔ طلبہ، مدرسین، منتظمین سب جمع ہو جاتے۔ آدھی آدھی رات سے زیادہ گذر جاتی۔ مولانا کے لطائف وفیوض سے حاضرین محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ آہ کسکو معلوم تھا کہ یہ آخری دور ہے +

اہلِ اسلام کے گروہ نہایت جوش وخروش سے دور و دراز اور قرب وجوار سے سفر کر کے سر آنکھوں کے بل حاضر ہوتے تھے۔ معلوم نہیں کونسی کشش اور کیسا قوی اثر تھا کہ لوگ کھنچے ہوئے چلے آتے تھے۔ اور خدا جانے وہ کونسا معنوی حسن و کمال تھا کہ عوام و خواص کی گردنیں یہاں خم کرا تا تھا۔ بڑے بڑے مقتدا عالم، مقدس مشائخ، جو بجائے خود ہزاروں معتقد و مرید رکھتے تھے مولانا کی بارگاہِ عالی میں بے ساختہ جبینِ نیاز جھکاتے تھے۔ اور روزانہ بہت سے آدمی حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہوتے تھے +

ہر وقت ایک اسلامی دربار لگا رہتا تھا اور دار العلوم سے آپکے مکان تک علما و صلحا کی جوق جوق آمد و رفت سے ایک عجیب چہل پہل اور متبرک منظر رہتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی موجودگی کا زمانہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گاہ گاہ دیوبند تشریف آوری کے مجمع بالکل پیش نظر ہو جاتے تھے۔ پرانے مخلص کبھی اُس زمانہ کو یاد کر کے روتے تھے اور کبھی

[1] حضرت مولانا اپنے اُستاذ مولانا محمد قاسم صاحب کا ذکر فرماتے تو اُستاذ رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے ۱۲

اس پر بہار حالت کو دیکھکر شادان و فرحاں ہوتے حضرت مولانا کے معتقدین و متوسلین کیلئے اس زمانہ میں بلا مبالغہ دن عید تھا اور رات شب برات اور بار بار خیال گذرتا تھا کہ ایں چہ می بینم یہ بیداری ست یا رب یا بخواب۔ مگر افسوس کہ ؎

	بزم میں ساقی بھی تھا اور مے بھی تھی اور پیمانہ تھا		خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

آہ کسقدر جلد یہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئی ؎

	ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں آج اُن ایام کو		آہ وہ راتیں کہاں اور ہائے ایسے دن کہاں
	دیکھنے والوں نے کیا دیکھا بتائیں کس طرح		خواب کی تھی اک کہانی۔ خواب کا تھا اک سماں

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی وفات سے کچھ زمانہ پہلے انتہائی رجوع و ہجوم اور بالکل کالمشاہدہ اور عیاناً افاضۂ انوار و برکات کو دیکھکر حضرت ممدوح کے ایک مخصوص بزرگ خلیفہ نے اظہار اندیشہ و خطرہ کے طور پر اپنے خاص لوگوں سے فرمایا تھا کہ "ایسی حالت بہت طویل زمانہ تک باقی نہیں رہا کرتی"۔ اُن بزرگ کا یہ مقولہ فراستِ ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بالکل مشابہ تھا جو سورۂ اذا جاء نصر اللہ کو سُنکر زار زار روتے تھے۔ اُن کا یہ اندیشہ برمحل ثابت ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ کی وفات ہو گئی۔ حضرت مولانا دیوبندی کے دورِ آخر کی بہاریں دیکھکر کبھی کبھی وہ واقعہ یاد آیا کرتا تھا اور اندیشہ ہوتا تھا کہ دیکھئے۔ لیکن یہ محض ایک خطرہ ہوتا تھا جو اِدھر سے آیا اُدھر سے گذر گیا۔ مولانا تندرست تھے۔ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ سفر کا ضعف و تکان بھی تقریباً زائل ہو گیا تھا۔ یہ کہاں خیال تھا کہ آفتاب غروب ہی ہو جائیگا +

حضرت مولانا غایت تواضع و کسر نفسی سے کبھی امامت نفرماتے تھے۔ ہزاروں نیازمندوں میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہو جسنے کسی موقع پر آپ کے پیچھے نماز پڑھی ہو۔ لیکن تشریف آوری کے پانچ روز بعد جو عید واقعہ ہوئی اُسمیں آپ نے مخصوص نیازمند و خادم خطیب و امام عید کی استدعا اور اہلِ شہر کے اصرار پر امامت قبول فرمائی اور ہزارہا بندگانِ خدا کی دیرینہ آرزو برآئی +

حضرت مولانا جس روز سے تشریف لائے تھے اپنے رفیق سفر و اسیری مولوی نصرت حسین صاحب مرحوم کی تعزیت اور اُنکی محزون والدہ اور غمزدہ اہلیہ کی تسلی اور یتیم بچوں کے سر پر دستِ شفقت

سلہ وہ سمجھے تھے کہ کارِ تبلیغ و تعلیم ختم ہوا لوگ فوجاً فوجاً اسلام میں داخل ہو گئے اب تسبیح و استغفار اور رخصت کا زمانہ آگیا ۱۲ +

پھیرنے کے لئے سفر کا ارادہ فرما رہے تھے لیکن مہمانوں کی روزانہ آمدرفت سے مجبور تھے اور اپنی عدم موجودگی میں دور دراز کے مہمانوں کی حیرانی و پریشانی کے خیال سے تاخیر فرما رہے تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ "جہاز میں یہ قصد تھا کہ ہندوستان پہنچتے ہی سیدھے مولوی نصرت حسین مرحوم کے مکان پر جائیں گے۔ لیکن بمبئی میں اپنے لوگوں کی ایک بڑی جماعت دیکھکر مجبور ہو گیا۔ ان سب کا ساتھ چھوڑ کر خود چلا جانا بھی نامناسب تھا۔ اور سب کو ساتھ لیجانا بھی باعث دقت و دشواری، اسلئے ارادہ ملتوی کرنا پڑا"۔

مہمانوں کی آمدرفت کم نہوتی تھی۔ لیکن اخباروں میں سفر کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اور لوگوں کی زبانی بھی رفتہ رفتہ سفر کی خبر مشہور ہو گئی تھی اسلئے کثرت ذرا کم ہو گئی اور دس شوال کے بعد حضرت نے قصد سفر فرما ہی دیا۔ اور دیوبند سے دہلی روانہ ہو گئے۔ اور ایک روز قیام فرماکر وہاں سے بہ قصد فتحپور روانہ ہوئے۔ اگرچہ مقصود فتحپور کا سفر تھا لیکن مخلصین کی عرض معروض اور دور دراز کے ہزارہا مشتاقوں کی خوش قسمتی سے لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، غازیپور، جونپور، فیض آباد وغیرہ میں بھی اُترنے کا اتفاق ہوا اور مخلصانہ عقیدت سے انتہائی طور پر مراسم تعظیم و تکریم لوگ بجالائے۔ الہ آباد و لکھنؤ میں مجمع بہت زیادہ تھا ان کے بعد مراد آباد کا نمبر تھا۔ ان تمام حالات کی تفصیل اور ہر اسٹیشن پر رجوع و ہجوم خلائق کا بیان باعث مزید طول ہوگا اسلئے چھوڑ دیا گیا۔

بہت سے مقامات پر تشریف لیجانے کا وعدہ تھا اور لوگ نہایت مسرت اور شوق سے انتظار کر رہے تھے کہ مراد آباد میں دیوبند سے حضرت کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کے شدید مرض کا تار پہنچا اور آپ ۲۵ شوال کو دیوبند واپس آ گئے۔ جن مقامات پر تشریف نہ لیجا سکے وہاں کے لوگوں کی حسرت و افسوس کا اندازہ دشوار ہے لیکن دنیا بامید قائم۔ وہ اس اُمید پر دل کو تسلی دیتے تھے کہ بمقتضائے وسعت اخلاق کسی دوسرے موقع پر حضرت مولانا ضرور تشریف لائیں گے۔ اُن کو کیا خبر تھی کہ یہاں تشریف لانا مقدر ہی نہیں اور اُن کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوگی ؎

بہت سی حسرتیں ایسی ہیں جنکا خون ہوتا ہے	بہت ارمان ایسی ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

اگرچہ سفر کی اطلاع اخبارات وغیرہ سے ہو گئی تھی۔ مگر بہت سے حضرات جن تک اطلاع نہ پہنچ سکی حضرت مولانا کی عدم موجودگی میں تشریف لائے۔ بعض نے سفر ہی میں جاکر نیاز حاصل کیا۔ اخیر میں آپ نے

انتظار میں ٹھہرے رہے۔صرف دو چار محروم چلے گئے ٭

اس سفر سے واپس آنے کے بعد اگرچہ اہلیہ صاحبہ کی زیادہ علالت سے حضرت کسی قدر متفکر رہتے تھے اور وہ پہلی سی بشاشت و انبساط نہ تھا۔تاہم ایسا شدید تغیر و انقباض بھی نہ تھا کہ حاضرین کو پژمردہ کردے۔حضرت بدستور سابق مہمانوں کے مجمع میں تشریف رکھتے۔گفتگو فرماتے۔سوالات کے جواب توجہ سے بتفصیل عطا فرماتے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے صاحبزادے حافظ قاری محمد طاہر سلمہٗ کی شادی عرصہ سے حضرت مولانا کی تشریف آوری کے انتظار اور بعض دیگر وجوہ سے مؤخر ہوتی چلی آتی تھی۔حضرت کی تشریف آوری کے بعد اسکے لئے ۲۰ شوال مقرر ہوئی اور جابجا دعوت شادی کے خطوط بھیجے گئے۔لوگوں نے اس موقع کو نہایت غنیمت سمجھا اور شیخ وقت کی زیارت اور حضرت قاسم العلوم کے جگر گوشہ کے عقدِ نکاح کی شرکت کو ہم خرما و ہم ثواب سمجھکر اُمید سے بہت زیادہ مہمان اس تقریبِ مسعود میں حاضر ہوئے۔بہت سے حضرات جو شرفِ زیارت حاصل کر چکے تھے وہ دوبارہ شادی کے لئے تشریف لائے لیکن بڑا مقصد وہی قندِ مکرر تھا یعنی حضرت کی زیارت اس طرح اس موقع پر ایک کامل اسلامی جلسے کی شان نمایاں ہوگئی۔علما،صلحا اور اُنکے متبعین و مخلصین کی متبرک صورتیں ہر طرف نظر آنے لگی ٭

جو تقریب قاسم العلوم والخیرات کے خاندان کی طرف منسوب ہو اور شیخ الہند جیسی مقدس ذات کا متبرک قدم درمیان میں ہو وہاں منکرات و رسومات کا کیا ذکر تھا۔نمازِ عصر کے بعد سعادتمند دولہا حضرت شیخ کے مکان پر حاضر ہوا۔حضرت بکمال شفقت بفرحت و انبساط اٹھکر ہمراہ ہوئے۔تمام مجمع شاداں و فرحاں پیچھے ہولیا۔اسی کو بارات کہئے یا اسلامی لشکر سے تعبیر کیجئے۔محلہ دیوان میں دلہن کے مکان پر پہنچے۔حضرت شیخ نے خطبہ مسنونہ متوسط آواز سے پڑھنے کے بعد ایجاب و قبول کرادیا دعائے برکت فرمائی خرمے تقسیم ہوئے۔اس تقریب پر حضرت مہتمم صاحب مولانا حافظ احمد صاحب کی طرف سے علاوہ عام دعوت ولیمہ کے جسمیں تمام طلبہ و مدرسین اور صدہا اہلِ شہر شریک تھے چار وقت تمام مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا ٭

حضرت مولانا کے مردانہ مکان میں مہمانوں کی آمد رفت رہتی تھی اور دربار پُر انوار لگا رہتا تھا۔اور

زنانہ میں حضرت کی اہلیہ صاحبہ (مرحومہ) انتہائی ضعف اور مرض کی تکلیف برداشت کر رہی تھیں۔ صاحبزادیاں اور اعزّہ خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ حضرت بھی کبھی مستورات کے بلانے پر اور کبھی خود ہی حال دیکھنے کے لئے تشریف لیجاتے۔ باہر تشریف لاکر غایتِ تحمل و صبر سے حسب عادت گفتگو فرماتے ہر شخص کا حال دریافت کرتے۔ البتہ کسی وقت شدتِ مرض اور تکالیف کو دیکھکر دیر تک سکوت میں رہتے اور خفیف آثار فکر و رنج کے چہرہ پر عیاں ہونے تھے۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد بمقتضائے حُسنِ خلق زائرین و اضیاف سے طلاقت وجہ اور بشاشت سے گفتگو فرمانے لگتے +

حضرت کی اہلیہ صاحبہ مرحومہ کا مرض و وفات بھی ایک کرامت اور عجائب احوال میں سے ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارادہ حج فرمانے سے پہلے ہی آپ علیل تھیں نشست و برخاست کی طاقت نہ تھی کبھی حالت نازک ہوجاتی تھی کبھی کچھ افاقہ ہوجاتا تھا۔ یہ روتی تھیں اور ڈرتی تھیں کہ حضرت کی عدم موجودگی میں میرا انتقال ہوجائے اور حضرت کی شرکتِ تجہیز و تکفین کی برکت سے محروم رہوں اور حضرت نے برعایتِ حقوق صحبت و رفاقت انکی صحت کے انتظار میں روانگی میں کچھ عرصہ تاخیر بھی فرمائی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کرشمۂ قدرت دکھلانا منظور تھا ہر چند دوا و علاج کئے گئے مگر صحت نہ ہوئی اُدھر حضرت کو داعیۂ جذبۂ الٰہی لبّیک کہنے پر مجبور کر رہا تھا اور مولانا کو یہ امید تھی کہ حج کرکے ایک سال یا چھ ماہ میں واپس ہوجاؤں گا۔ آخر ان کو مریض ہی چھوڑ کر اور آخری ملاقات میں یہ الفاظ کہکر ان کو رخصت کیا کہ "گھبراؤ نہیں انشاء اللہ ایسی ہی آکر دیکھ لونگا" اور زبان حال سے فرمایا کہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست	می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

حضرت مولانا تشریف لیگئے اور دوسرا حج کرکے واپس آنے کا خیال تھا کہ اسیر ہوگئے۔ زمانہ مفارقت طویل ہوگیا۔ بلکہ بعض ایام میں تو واپسی کی کوئی امید ہی نہ رہی۔ یہ صدمات ان مخدومہ کیلئے مرض سے بڑھکر سوہانِ روح تھے اور تمام متعلقین و متوسلین سے زیادہ ان کے لئے تکلیف دہ تھے۔ شب و روز دعا کرتی تھیں اور ظاہری تدابیر میں بھی مقدور بھر کوتاہی نکرتی تھیں۔ ایک مرتبہ بعض ذرائع سے مولانا کو مصارف کی تکلیف و دقت کی خبر سنی تو بے چین ہوگئیں باقاعدہ درخواست مرتب کراکر وسیرائے کی خدمت میں بھیجی کہ یہاں سے روپیہ بھیجنے کی اجازت دیجائے۔ مگر افسوس کہ منظور نہ ہوئی +

پانچ سال کی طویل مدت تکالیف و صدمات ہی میں گذری۔ کبھی امید بندھ جاتی تھی کبھی مایوس

ہوجاتیں۔ مرض میں کبھی خفت ہوجاتی کبھی شدت۔ بلکہ آخری ایام میں ایک درجہ تک اچھی صحت حاصل ہوگئی تھی +

خبریں تو اڑتی ہی رہتی تھی ایک مرتبہ رہائی کی کچھ افواہ سُنی اور بعض ذرائع سے اسکی تصدیق بھی ہوئی تو نہایت خوشی سے مولانا کی راحت اور مہمانوں کی ضیافت کا بہت کچھ سامان مہیا کیا۔ اور وسعتِ حوصلہ سے بڑے بڑے ارادے فرمائے مگر یہ خبر درجۂ افواہ تک ہی رہی اور اسکے بعد عرصۂ دراز تک کوئی اطلاع نہ آئی +

خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ عدن سے حضرت کی تشریف آوری کا تار پہنچا ہی تھا کہ یہ پھر بدستور مریض ہوگئیں اور تقریباً وہی کیفیت ہوگئی جو مولانا کی روانگی کے وقت تھی۔ مولانا مکان پر تشریف لائے تو اُن کو ہوش تھا مگر نہ اسقدر کہ پوری مسرت حاصل ہوسکے یا زبان سے کچھ اظہار کرسکیں۔ بہرحال تقدیر خداوندی نے وہ الفاظ پوری طرح صادق کرادئے جو آپنے بوقتِ رخصت فرمائے تھے۔ اور حضرت مولانا نے اُن کو حالتِ مرض ہی میں آکر دیکھ لیا۔ بقول شخصے ؎

خدا کا شکر ہے تم آگئے ہو میرے بالیں پر	مری قسمت میں تھا یہ آخری دیدار ہوجانا

جسکی آنکھیں پانچ برس سے ترس رہی تھی اور جسکا دل دیدار کا منتظر رہتا تھا اُسکا اسوقت اظہار مسرت کے موقع پر بے اختیار رو بے بس پڑا رہنا اور شدتِ مرض سے سامان رخصت نظر آنا ضرور خون کے آنسو رُلاتا اور زبان حال سے یہ کہلاتا ہوگا ؎

اُمید بستہ بر آمد و لے چہ فائدہ زانکہ	اُمید نیست کہ عمرِ گذشتہ باز آید
شبِ فرقت سرِ بالیں مرے وہ اسگھڑی پہنچے	کہ شمعِ عمر بجھتی تھی طلوعِ صبح تھی غم کی

علاج معالجہ تو پہلے سے بھی ہورہا تھا لیکن حضرت کی موجودگی اور مرض کی زیادتی سے اُسوقت اہتمام بہت زیادہ تھا۔ مختلف اطبا کی رائے شریک رہی اور ہر قسم کی تدابیر کیگئی لیکن وقت پورا ہوچکا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور صد ہا عزیز و اقربا اور ہزار ہا متوسلانِ شیخ کو روتا چھوڑکر بوقتِ چاشت ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ روز شنبہ کو دنیا سے رخصت ہوئیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن +

وفات کے بعد فوراً دار العلوم دیوبند کے علما و طلبہ نے کلمہ شریف کا ختم اور قرآن خوانی شروع کی اور نماز ظہر تک برابر ایصالِ ثواب ہوتا رہا۔ بعد نماز ظہر دار العلوم میں مجمع کثیر نے نماز جنازہ پڑھی

اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پُرانوار کے جوار میں دفن ہوئیں ۔

مرحومہ ایک نہایت عاقلہ، منتظمہ، دیندار، سیرچشم، مہمان نواز عورت تھیں۔ انکی صحت میں تمام عمر حضرت مولانا کو کبھی گھر کے انتظام کے متعلق کوئی فکر اور اپنے مہمانوں کے متعلق کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ اور انکی بیماری میں اور وفات کے بعد بھی صاحبزادیوں نے اپنے حسن انتظام سے مہمانوں کو تکلیف اور مولانا کو فکر کی نوبت نہیں آنے دی ۔

پچاس سال کی شریک رنج و راحت، رفیق عسر و یسر، صالحہ اور فرمانبردار اہلیہ کی مفارقت کا صدمہ کوئی معمولی رنج نہ تھا ایسے واقعات پر حزن و ملال طبعی امر ہے۔ مولانا بھی آخر انسان تھے صدمہ ہوا مگر آپ نے سب دل ہی پر برداشت کیا۔ جزع فزع کا تو گمان بھی نہیں کبھی زبان سے ذکر تک نہیں فرمایا۔ کوئی دوسرا شخص بھی کبھی بطور تعزیت اظہار رنج و ملال کیلئے کچھ ذکر کرتا تو آپ اِدھر اُدھر کی لطیف باتوں میں ٹلا دیتے۔ البتہ کئی روز تک خاموش رہے۔ بہت کم گفتگو فرمائی۔ چہرہ پر رنج کا اثر محسوس ہوتا رہا۔ خدام و حاضرین خود بھی اس رنج سے متاثر تھے اور بلحاظ ادب زائد از ضرورت بات کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے ۔

وفات کی خبر شائع ہوئی تو تعزیت کے لئے خدام و احباب کی آمد شروع ہوئی اور مہمانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ زیادہ تعلق و تعارف رکھنے والے لوگوں کی یہ تیسری حاضری تھی۔ ایک مرتبہ تشریف آوری پر حاضر ہوئے۔ دوبارہ قاری محمد طاہر صاحب کی شادی کی تقریب میں تیسری مرتبہ اب ۔

تشریف آوری کے ابتدائی ایام جس فرحت و نشاط کے ساتھ گذرتے تھے وہ حالت اگرچہ اب نہ تھی تاہم فیوض و برکات میں کچھ کمی نہ تھی اور صبح سے شام تک حاضرین و زائرین سے مولانا کو فرصت نہ ہوتی تھی۔ البتہ آرام کے لئے اب کسی قدر وقت ملجاتا تھا ۔

سلسلۂ حالات اسی طرح جاری رہا۔ یہانتک کہ عیدالاضحیٰ آگئی۔ اور حضرت مولانا نے حسب دستور کئی روز پہلے سے اہتمام و انتظام فرما کر جان نثاران احکام الٰہی کی طرح بہت خوشی سے قربانیاں کی۔ اور عید سے تیسرے روز حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کے مزار پُرانوار کی زیارت اور صاحبزادہ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب کی ملاقات کے لئے گنگوہ تشریف لیگئے اور اسی

میں سہارنپور و رامپور بھی قیام فرمایا *

اس سفر میں بہت سے علما صلحا خدام و مخلصین ہمراہ تھے اور گنگوہ میں اس اسلامی قافلہ نے پہنچکر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانۂ حیات کی یاد تازہ کردی۔ اسی سفر میں حضرت مولانا نے رائپور (ضلع سہارنپور) جاکر بکمال حسرت و افسوس اپنے قدردان اور مخلص بزرگ اور تشریف آوری کے نہایت منتظر حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی جنکی ملاقات کا شوق آپکو مالٹا میں بے چین کئے ہوئے تھا۔ رائپور صرف ایک شب ٹھہر کر حضرت اس سفر سے جلد تشریف لے آئے۔ اور بدستور مکان پر اقامت فرمائی *

جیساکہ آپ سن چکے ہیں حضرت مولانا کو اپنے شناسا و مخلصین کی تکلیف کسی طرح گوارا نہیں تھی خود تکلیف برداشت فرماتے مگر حتی الوسع دوسروں کو دقت سے بچاتے۔ زیادہ ضعیف یا بیمار لوگ جو شوق میں چلے آتے تھے اُن سے کلماتِ معذرت فرماتے اور اُنکی تسلی کرتے *

مولانا محمد فاضل صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نہایت پُرانے خادم و شاگرد پھلت ضلع مظفرنگر میں رہتے ہیں۔ نہایت ضعیف اور بالکل شیخ فانی ہوگئے ہیں۔ اُن کا ارادہ ملاقات کے لئے دیوبند آنے کا معلوم ہوا تو حضرت نے خود پھلت تشریف لیجاکر ملاقات فرمائی *

معلوم ہوا کہ میرٹھ سے ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب باوجود اپنے ضعف وغیرہ کے ملاقات کیلئے تشریف لانے کو تیار ہیں اور ان کو اسمیں نہایت تکلیف اور دقت ہوگی۔ بلکہ اُنکا ایک تار بھی حاضری کی اطلاع کا پہنچا۔ حضرت نے بذریعہ تار مطلع کردیا کہ ہم خود فلاں روز پہنچیں گے خود اپنے مجمع کے ہمراہ میرٹھ تشریف لیگئے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہزاروں مشتاق زیارت سے سیراب ہوگئے۔ حضرت کی صحت و حیات کے زمانہ کا یہ سب سے آخری سفر تھا *

حضرت کی پہلی علالت اور صحت

شروع ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ سے دیوبند میں مرض تپ لرزہ کا آغاز ہوگیا تھا اور روزانہ اسمیں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جسمیں دو چار مریض نہوں بعض گھروں میں کوئی خبر لینے والا اور پانی دینے والا نہ تھا۔ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا کوئی اس سے نہ چھوٹتا تھا۔ بعض لوگ دو چار روز کے بعد تندرست ہو جاتے۔ بعض کا مرض طویل ہو جاتا تھا۔ غرض ایک پریشانی کا وقت تھا۔ دار العلوم میں بہت طلبہ مریض تھے۔ اور مدرسین مریض ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اسلئے عید الضحیٰ کی تعطیل بجائے معمولی پانچ یوم کے بارہ روز تک بڑھا دیگئی تھی اور جب یہ کافی نہ ہوئی تو دوبارہ اٹھارہ روز کی تعطیل کر دیگئی تھی +

حضرت مولانا تندرست تھے اور حسب عادت قدیمہ اپنے متوسلین و خدام کا تفقد احوال فرماتے رہتے۔ حاضرین سے غائبین کا حال دریافت فرماتے۔ زیادہ مرض کی خبر ملتی تو بلا تمیز امیر و فقیر خاص و عام کئی کئی مرتبہ خود تشریف لیجاکر عیادت فرماتے۔ دعا فرماتے۔ زیادہ تکلیف کی خبر آتی تو نہایت متاثر ہوتے چہرہ پر غم کے آثار نمایاں ہو جاتے +

مرض اگرچہ عام اور نہایت تکلیف دہ تھا دو چار روزہ صحت کے بعد پھر عود کر آتا تھا۔ لیکن اکثر لوگ تکلیف برداشت کر کے شفایاب ہو جاتے تھے۔ ضائع ہونے کی نوبت بہت ہی کم آتی تھی۔ حضرت مولانا کی موجودگی اور تندرستی تمام جماعت کے لئے باعث تقویت و طمانیت تھی۔ اپنی مصیبت بیان کرتے تھے دعا کیلئے کہتے تھے۔ آپ تسلی و تسکین فرما دیتے تھے بعض مریض ہلتے کانپتے ہوئے حاضر ہوتے۔ آپکو بیٹھا ہوا دیکھکر دل قوی ہو جاتے۔ مرض بھول جاتے +

عشرۂ محرم کے بعد حضرت مولانا کو بھی بخار ہوگیا اور ترقی کرتے کرتے درجۂ شدت پر پہنچگیا۔ رات بھر تکلیف رہی صبح کو سکون ہوگیا۔ مگر دن بھر ضعف کی وجہ سے خاموش لیٹے رہے۔ حضرت کے منجھلے بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے دوا تجویز فرمائی۔ ابتدا میں کچھ انکار فرمایا مگر پھر بہ طیب خاطر نوش فرمائی +

زمانۂ طاقت وقوت میں حضرت کی عادت تھی کہ تپ لرزہ اور بخار کے علاج میں تعمیلِ ارشاد فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے تازہ پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ اب اگرچہ بدن میں وہ طاقت نہ رہنے کی وجہ سے یہ علاج بظاہر کچھ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا لیکن حضرت نے کمالِ اتباعِ سنت کیوجہ سے اب بھی اس علاج کو نہ چھوڑا۔ اور ایک روز کنوئیں کے قریب بیٹھکر پچاس ڈول آبِ تازہ سے غسل فرمایا۔ ایک روز افاقہ رہا لیکن رات کو بیہوشی کی حالت نظر آنے لگی۔ چوتھے روز پھر خفت ہوئی بعد عشا بیٹھکر بہت دیر تک حاضرین سے گفتگو فرماتے رہے +

ان ایام میں مسجد میں جانے کی بالکل طاقت نہ تھی اکثر کھڑے ہوکر اور گاہ بیٹھکر نماز مکان ہی میں باجماعت اور بعض اوقات تنہا ادا فرماتے تھے۔ باوجود تکلیف اور شدتِ مرض کے نماز شروع کرنیکے بعد اُسی طمانیت اور وقار کیساتھ ادا فرماتے تھے جیسی صحت میں عادت تھی۔ دیکھنے والے کو خیال ہی نہ ہوتا تھا کہ مولانا مریض ہیں۔ اور بالکل جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ[1] کا نقشہ نظر آتا تھا +

دھلی سے مرض کی خبر سُنکر ڈاکٹر انصاری صاحب عمدہ سے عمدہ دوائیں لیکر تشریف لائے لیکن غالباً ایک یا دو دفعہ سے زیادہ حضرت نے انگریزی دوا کو استعمال نہیں فرمایا۔ اسلئے ڈاکٹر صاحب کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب تشریف لائے اور مولانا حکیم محمد حسن صاحب کے ساتھ علاج اور مشورہ میں شریک ہوئے +

ظاہری اور باطنی تدابیر ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا رضامندی سے دوا پی لیتے تھے متعلقین دوست خدام، مخلص ہر طرف دعا میں مشغول تھے۔ دارالعلوم میں آپکے تلامذہ نے بخاری شریف کا ختم کیا تھا۔ تمام مجمع نے یا سَلامُ کا وظیفہ پڑھا۔ غرض ہر شخص کا دل وزبان مصروفِ دعا تھا۔ بخار یا اور کوئی شدید تکلیف ان ایام میں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن غایتِ ضعف کی وجہ سے حضرت بالکل خاموش آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے رہتے تھے۔ اور بعض دفعہ یہ حالت بالکل خطرناک نظر آنے لگتی تھی +

اپنے مخدوم اُستاد کی یادگار دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا کو ایسی وابستگی اور اسقدر تعلقات تھے کہ سفر وحضر صحت ومرض عُسر ویُسر میں بھی کبھی دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ حضرت

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں کی گئی ہے ۱۲ +

ایک زمانہ میں اسکے سب سے پہلے طالب علم رہے پھر کبھی مدرس کبھی صدر مدرس اور پھر سرپرست۔ تذکرہ آجاتا تو فرمایا کرتے کہ "میاں کَبَّرَنِی مَوْتُ الْکُبَرَاءِ۔ رفتہ رفتہ سب اُٹھ گئے مجھے لوگ بڑا سمجھنے لگے۔"

ذَهَبَ الْكِرَامُ فَسُدْتُ غَيْرَ مُسَوَّدِ[۱]	وَمِنَ الشَّقَاءِ تَفَرُّدِیْ بِالسُّؤْدَدِ

دار العلوم کے تعلق اور وابستگی کا کسی قدر اندازہ ذیل کے اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے جسکو احقر اپنے اُنہیں الفاظ میں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے جو ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے روزانہ اخبار ہمدم میں شائع ہوئے تھے۔

"گذشتہ ہفتہ میں حضرت شیخ الہند شدید بخار میں مبتلا ہوگئے تھے۔ غذا دوا سے نفرت تھی ضعیف بڑھتا جاتا تھا۔ خاموش لیٹے رہتے تھے ضعف کی وجہ سے تشویش تھی۔ جابجا خبریں پھیلیں۔ دُور دُور سے خادم احباب آگئے۔ بعض جگہ نہایت وحشتناک غلط خبر مشہور ہوگئی اسلئے صدہا لوگ حیران و پریشان دیوبند آئے بہت سے تجربہ کار طبیب جمع ہوگئے دہلی سے ڈاکٹر انصاری اور اُن کے بھائی صاحب تشریف لائے مگر حضرت نے ڈاکٹری دوا استعمال نہیں فرمائی۔ ابتدا میں پچاس ڈول آب تازہ سے غسل فرمایا کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا ہی علاج روایت کیا گیا ہے اور آخر میں یونانی دوا استعمال فرمائی۔

کل حالت مرض وضعف ہی میں آپکو محلِ انوار و برکات رشیدی و قاسمی یعنی دار العلوم کا خیال آیا اسپر آپکو پالکی میں لٹایا گیا اور بڑے بڑے علما و مدرسین اُسکو اپنے کاندھوں پر فخر و مباہات سے اُٹھا لیگئے جسجگہ آپ درس حدیث شریف دیا کرتے تھے وہاں لیجاکر مولانا کو چارپائی پر لٹایا۔ صغیر و کبیر بیمار و تندرست علماء طلبہ جمع ہوگئے شہر کے لوگ بھی زیارت کیلئے جمع ہوئے آیت کریمہ وغیرہ وظائف واسطے صحت کے سب نے جمع ہوکر پڑھے (ایک روز پہلے بخاری شریف اور یا سلام کا ختم ہوا تھا) اور ایک گھنٹہ کے قریب تمام حاضرین نے بخلوص قلب دعائے صحت مانگی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے غفلت میں کمی ہوئی۔ اور چند گھونٹ چائے کے آپنے نوش فرمائے۔ (اسی شکریہ میں جناب مہتمم صاحب دار العلوم نے تمام مہمانانِ موجودہ کی اپنے ذاتی خرچ سے عمدہ ضیافت کی) گیارہ بجے تمام اہل علم شاداں و فرحاں پالکی کو اپنے کندھوں پر مکان واپس لے گئے۔ آج ۱۰ اکتوبر یوم یکشنبہ کو

[۱] جب اکرم لوگ مرگئے تو میں بدون بنائے ہوئے سردار بنگیا اور یہ نہایت بدبختی کی بات ہے کہ صرف میں ہی سردار رہگیا ۱۲

الحمدللہ مولانا کی طبیعت بہت اچھی ہے تشویش اور خطرہ نہیں رہا۔ گفتگو فرماتے ہیں تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قریب و بعید مہمان خوشی اور مسرت سے واپس ہو رہے ہیں"۔

جیسا کہ اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جس روز کا یہ واقعہ ہے اسی روز سہارنپور میں وفات کی خبر مشہور ہو گئی۔ جو جس جگہ کھڑا تھا ششدر و حیران وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور دس بجے کی گاڑی میں صدہا لوگ دیوبند پہنچ گئے۔ بعض لوگوں نے تصدیق کیلئے تار دیا تھا جس کا عین گاڑی روانہ ہونیکے وقت جواب پہنچ گیا ورنہ ہزارہا آدمی آجاتے۔

جیسا کہ حقیر کی گذشتہ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۲۷ محرم کو حضرت کی طبیعت مائل بہ صحت ہو گئی تھی اور روزانہ فرق نظر آتا تھا۔ دو وقت کچھ غذا بھی نوش فرما لیتے تھے۔ اگرچہ نہایت قلیل۔ اکثر لیٹے رہتے اور کبھی کبھی تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتے اور بعض دفعہ مہمانوں کے پاس خاطر سے بہت بہت دیر تک تکلیف اٹھا کر بیٹھے رہتے۔ مخلص لوگ مرض کی خبر سنکر گھبرائے ہوئے آتے اور حضرت کو اچھی حالت میں دیکھکر باطمینان رخصت ہوتے تھے۔

اسکے بعد حضرت میں رفتہ رفتہ طاقت و توانائی آنے لگی۔ جسکی وجہ سے مسجد میں تشریف لیجانے لگے جب طبیعت ذرا بحال ہوتی پالکی میں لیٹ کر دار العلوم میں تشریف لاتے کبھی صحن میں چارپائی پر آرام فرماتے کبھی اوپر دار المشورہ تک پہنچ جاتے۔ کبھی پیادہ تشریف لاتے۔ اور دوسروں کے اصرار سے پالکی میں سوار ہو کر واپس تشریف لیجاتے۔

حالت اور زیادہ قابل اطمینان ہوئی تو ۲ صفر روز جمعہ کو مخصوص خدام نے بہ تقریب صحت طلبہ و مدرسین دار العلوم اور حضرت مولانا سے خاص تعلق رکھنے والے اہل شہر کی ایک مکلف دعوت دی۔ اللہ اللہ عجیب زمانہ تھا۔ خدام خوشی سے جامہ میں نہ سماتے تھے۔ باہم خوشی خوشی چاء اور شیرینی کی دعوتیں کرتے تھے کارکنان قضا و قدر ہنستے ہوں گے اور کہتے ہوں گے

کیا شاخ گل پہ پھول کے بیٹھی ہے عندلیب	ایسا نہ ہو کہ چشم فلک کو برا لگے

حضرت کی دوسری علالت اور وفات

تو مجھ سے سنیو اب غم کی کتاب آنیکو ہے	چشم گریاں سے بہرنے خون ناب آنیکو ہے
جسکے علم و فضل کی ارض و سما میں دھوم تھی	آج وہ تابوت میں عالی جناب آنیکو ہے
کر دیا جسنے منور ملکِ ہند اور مالٹا	آج وہ شمس الہدیٰ زیر سحاب آنیکو ہے

آخر بہار ہو چلی خزاں کے دن قریب آئے ضعف تو تھا ہی ۶ر صفر ۱۳۳۹ھ کو حضرت کو دوبارہ بخار ہو گیا۔ ایک ہی روز کے بخار میں صاحب فراش ہو گئے۔ اکثر لوگوں کو بار بار بخار آتا تھا صحت ہو جاتی تھی۔ حضرت کی نسبت بھی یہی خیال کیا گیا کہ ضعیف ہیں بخار ہو گیا ہی آج نہیں کل اُتر جائیگا۔ آہ کسکو خبر تھی کہ یہی بخار جنت کا بلاوا اور موت کا سلام ہے۔ کسکو خیال تھا کہ یہی علالت مرض الموت کی صورت اختیار کریگی۔ حسب دستور سابق مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے مناسب دوا تجویز فرمائی۔ بخار کچھ کم ہوا تو پیچش ہو گئی اور ضعف نے نشست و برخاست بھی دشوار کر دی اور مرض کو ترقی ہونے لگی اطبا نے تجویز کیا کہ پہلی علالت کے اثر سے حضرت کا جگر بڑھ گیا ہے +

اگرچہ ہر وقت لیٹے رہتے تھے لیکن اس علالت میں ہر وقت غفلت اور خاموشی نہیں رہتی تھی۔ شدید ضعف کی وجہ سے آواز بلند نہیں نکلتی تھی مگر ضروری گفتگو فرما لیتے تھے۔ اور وارد و صادر سے سلام و مزاج پرسی کر لیتے تھے +

اسی حالتِ مرض میں علیگڈہ کی مسلم یونیورسٹی کا معاملہ پیش آیا۔ مولانا محمد علی صاحب اور دیگر حضرات نے تحریک فرمائی۔ اور حضرت مولانا نے اسکو ایک دینی اور مذہبی کام خیال فرمایا اور اپنے تشریف لیجانیکو مولانا محمد علی صاحب اور اُن کے معاونین کیلئے باعثِ تقویت اور ترکِ موالات کی تحریک کے لئے موجب تائید خیال فرمایا حالتِ مرض کو دیکھنے والے آپکے ارادہ سفر سے متعجب و حیران رہجاتے تھے اور بہت سے مخلص ارادہ فسخ کرنے کا بادب مشورہ دیتے تھے لیکن حضرت نے اپنے مرض و ضعف کی اصلا پروا نکر کے سفر کی شدید تکلیف گوارا فرمائی۔ اور ۱۵ر صفر کو بروز پنجشنبہ چند مخصوص حضرات کی ہمراہ علیگڈہ روانہ ہو گئے ۱۶ر صفر (۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو بروز جمعہ سواری میں کالج تشریف لیگئے اور لوگوں نے بغایت فخر و مباہات آپکو ہاتھوں ہاتھ لیجا کر مولانا محمد عبد اللہ صاحب انصاری ناظم دینیات کے کمرہ میں لٹا دیا۔ نماز جمعہ بہ تکلیف

دا فرمانے کے بعد آپ نے جلسۂ افتتاح یونیورسٹی میں کرسی صدارت کو معزز فرمایا اور سہارا لگا کر تکلیف بیٹھے۔ خطبۂ صدارت (جو آپ کی طرف سے لکھا گیا تھا اور آپ نے حرف بحرف سنکر پسند فرمایا تھا) پڑھا گیا باوجود تکلیف کے حضرت کسیقدر اَور بیٹھنے کی ہمت رکھتے تھے لیکن اطبا و مخلصین نے آپکو زیادہ تکلیف دینا مضر اور نامناسب سمجھا اور بعزت و احترام تمام آرامگاہ میں پہنچا دیا۔ اور مولانا عبدالباری صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔ اور حضرت تیسرے روز دیوبند واپس آگئے۔

اس موقع پر حضرت مولانا نے حسب عادتِ قدیمہ دینی خدمت کے مقابلہ میں آرام و صحت کو ہیچ سمجھا اور لوجہ اللہ یہ تکلیف گوارا فرمائی تھی۔ جسمیں نہ کسی مخفی غرض کا احتمال ہے نہ کسی نام و نمود کا شائبہ۔

ڈاکٹر انصاری صاحب و حکیم اجمل خانصاحب وغیرہ معزز حضرات نے علیگڈھ ہی سے حضرت سے بغرض علاج دہلی چلنے کے لئے باصرار استدعا کی تھی۔ لیکن ایک مرتبہ پھر حالتِ حیات میں دیوبند تشریف لانا مقدر ہو چکا تھا۔ اُسوقت حضرت نے عذر فرما دیا تھا۔ لیکن جب دیوبند رہکر مرض میں تخفیف نہ ہوئی اور ڈاکٹر صاحب اور سب خیر خواہوں کی یہی رائے ہوئی کہ دہلی کا قصد فرمائیں۔ تو حضرت نے منظور فرمالیا۔ شنبہ کو علیگڈھ سے واپس آئے تھے چار روز قیام فرماکر ۱۲ صفر روز چار شنبہ کو دہلی کا ارادہ کر لیا

آہ وہ نقشہ آنکھوں میں پھرتا ہے جب حضرت اپنی آرامگاہ سے باہر آکر پالکی میں سوار ہونے لگے معلوم نہیں حیرت کا عالم تھا یا حسرت کا۔ در و دیوار پر ایک غلط انداز نظر ڈالتے تھے پالکی کے قریب آکر چند منٹ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ اور سوار ہونے کے بعد پانچ سات منٹ توقف فرمایا مریضوں کو مصافحہ کرکے یہیں سے رخصت کر دیا۔

یہ تو کون جانتا تھا کہ دیوبند سے آج حضرت ایسے جاتے ہیں کہ پھر زندگی میں لوٹنا مقدر ہی نہیں ہے تاہم ایک وحشتناک خیال بدن کو لرزا دیتا تھا۔ اور ایک احتمالی خطرہ قلوب کو بے چین کر دیتا تھا۔ شدید مرض اور ضعف و ناتوانی اور پیرانہ سالی کی حالت میں آپکے وطن مالوف اور مجمع خدام و مخلصین سے

ف۱ بعض دنیا پرست اخباروں نے حضرت کی اس شرکت کے واقعہ کو استہزا و تمسخر کے لہجہ میں بیان کرکے اپنی عاقبت خراب کی ہے۔ وہ غالباً سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کی تکلیف میں صحابہ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھکر مسجد میں بغرض شرکت جماعت تشریف لیجانیکے حوصلہ افزا قصہ سے ناواقف ہیں۔ اور رِجلاہ تخطان فی الارض کی تکلیف دہ حالت اُن کو پیش نظر نہیں رہی ۱۲

جدا ہونے کا منظر دیکھکر قلوب بے قرار تھے اور آنکھیں اشکبار۔ آخر جان نثار طلبۂ علما نے پالکی کاندھوں پر اُٹھائی اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی دینی بہار ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ ؛

اسٹیشن تک بہت بڑا مجمع ہمراہ گیا۔ اور گاڑی چھوٹنے تک لوگ مصافحہ اور دست بوسی میں مصروف رہے۔ مولانا کو گاڑی میں براحت و آرام سوار کیا گیا۔ آپکے بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مخصوص خدام و رفقا ہمراہ تھے۔ گیارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی اور حضرت نے دیوبند کو الوداع کہا۔ رخصت کیوقت مرض و ضعف کے علاوہ حزن و ملال سے آپ متاثر نظر آتے تھے ؛

اگرچہ دہلی میں بہت سے معزز و مستطیع لوگ حضرت کو اپنے مکان پر ٹھہرانیکے آرزومند تھے لیکن آخری خدمت و تیمارداری کی سعادت بھی ڈاکٹر انصاری صاحب کی خوش قسمتی سے انہیں کیلئے مقدر ہو چکی تھی۔ چونکہ دہلی تشریف لانے میں زیادہ دخل ڈاکٹر صاحب ہی کی استدعا کو تھا اور گویا حضرت مولانا ڈاکٹر صاحب کے مدعو اور مہمان ہو کر تشریف لائے تھے اسلئے دریا گنج میں ڈاکٹر صاحب ہی کی کوٹھی پر مع مجمع خدام قیام فرمایا ؛

مخصوص حضرات کی زبانی حضرت نے ڈاکٹر صاحب سے کہلا بھی دیا تھا کہ میرے ساتھ چونکہ کئی آدمیوں کا مجمع ہے اور آئندہ بھی مہمانوں کی آمدرفت ضرور رہیگی۔ اور آپکے مکان پر خود آپکے کئی کئی مہمان روزانہ رہتے ہیں۔ اسلئے ہم اپنی ضروریاتِ طعام وغیرہ کا تکفل خود کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسکو کسی طرح منظور نہیں فرمایا اور آخر دن تک کمالِ سیر چشمی حضرت مولانا اور حاضرینِ خدمت خدام و مخلصین و اقارب کے دو وقتہ طعام اور ناشتہ وغیرہ کا انتظام اپنے ہی ذمہ پر رکھا اور گھر والوں نے جس خلوص سے اسکا اہتمام کیا وہ اُنہیں کا حق تھا ؛

علاج ابتدا میں جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا ہوتا رہا اور اخیر میں ڈاکٹر صاحب کا اور حضرت کے بھائی صاحب اور مولانا جمیل الدین صاحب کا مشورہ بھی شریک رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے علاج معالجہ اور راحت و آرام کے سامان میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نکیا۔ حضرت کی ہمراہ کافی سے زیادہ خدام تھے لیکن ڈاکٹر صاحب اور اُن کے ملازم خود بھی ہر وقت خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک معتمد صاحب اس خدمت پر مامور تھے کہ ملاقات کرنے والے لوگ دیر تک آپ کے ساتھ گفتگو نہ کریں

کیونکہ یہ نہایت ہی مضر سمجھا جاتا تھا۔ ایسی قیود اگرچہ مولانا کے خلافِ طبع تھیں لیکن ضرورتاً گوارا فرماتے تھے اور حتی الوسع تو آپکو ایسی قیود کی اطلاع بھی نہ دیجاتی تھی +

ڈاکٹر صاحب اور جناب مسیح الملک نے حضرت مولانا کی خدمت اور معالجہ میں جو کچھ توجہ اور مصروفیت اختیار فرمائی وہ محض بہ حسن عقیدت ایک اسلامی خدمت اور اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھکر کی ہی جنکا اجر اُنکے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کفارۂ سیآت اور ذخیرۂ آخرت ضرور ہوگا۔ تاہم ان حضرات کی اس سعی و توجہ سے حضرت کے تمام اقربا و متوسلین اور دار العلوم دیوبند کے تمام متعلقین نہایت مشکور ہیں +

صحت و شفا قسمت سے ہی اور موت و حیات مقدر۔ لیکن بلا مبالغہ حضرت مولانا کو وہ علاج و دوا میسر آئی کہ بادشاہوں کو نہیں آسکتی۔ ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کا علاج اور پھر خلوص و محبت سے بھرا ہوا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) مولانا محمد قاسم صاحب (قدس سرہ) کے علاج معالجے کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ حرف بحرف حضرت مولانا کے متعلق صادق آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ”اگر دوا و تدبیر پر کام ہوتا تو مولانا کو بیشک صحت ہو جاتی۔ وہ دوائیں مولانا کو میسر آئیں جو اُمرا کو بھی شاید بدشواری میسر آویں اور ایسا علاج ہوا جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدت قلبی“ +

حضرت مولانا بتعمیل یَا عِبَادَ اللّٰہِ تَدَاوَوْا اور بحکم اَعْقِلْہَا وَتَوَکَّلْ ظاہری تدابیر و معالجات کو قبول فرماتے تھے۔ اور بمقتضائے مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ اپنے مخلص معالجوں اور خدمت گذاروں کے لئے مشکور و دعاگو تھے۔ لیکن جیسا کہ ایک عارف کامل کی شایانِ شان ہے کبھی ان اسباب پر اعتماد نہ فرماتے تھے اور نظر اپنے حقیقی مسبب الاسباب پر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی سے وطن واپس ہونے کا کچھ خیال ہوا تو حاضرین خدام نے معالجوں کے اخلاص و توجہ اور دوا و علاج کی سہولت کو ذرا اہتمام سے بیان کر کے عرض کیا کہ ”یہ باتیں دیوبند میں کہاں میسر ہونگی“۔ تو تبسم کر کے ارشاد فرمایا کہ ”بھائی سب بچوں کا کھیل ہے“ +

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام اوصافِ حسنہ سے حصہ دیا تھا اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر بنایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن سے جسقدر محبت تھی وہ مخفی نہیں اسلئے ارشاد فرمایا ”اے بلد مکہ تو خدا تعالیٰ کے تمام شہروں سے بہتر ہے اور سب بستیوں سے زیادہ خدا تعالیٰ کو محبوب ہے۔ اگر میں تجھ میں سے

زبردستی نکال دیا جاتا تو نہ نکلتا۔ کبھی فرمایا کہ "اگر میری قوم مجکو نکال دیتی تو تیری سوا کسی جگہ سکونت نکرتا" (ترمذی شریف)

حضرت کو بھی وطن سے ایک خاص اُنس تھا۔ دھلی میں ہر طرح کی راحت وطن سے زیادہ میسّر تھی لیکن بار بار وطن کا ارادہ فرماتے تھے مگر احکامِ قضا و قدر کیلئے ظاہری اسباب موجود ہو جاتے ہیں۔ کسی قدر دوسروں کا اصرار اور زیادہ تر جمعیۃ العلما کے جلسے کی شرکت کا خیال واپسی سے مانع ہوا جمعیۃ العلما کے اجلاس سے حضرت کو ایک ایسی خاص دلچسپی معلوم ہوتی تھی جیسے دنیا دار لوگوں کو اپنی اولاد و اقارب کی تقریباتِ شادی کے سامان و سرانجام سے ہوا کرتی ہی۔ خطبۂ صدارت خود لکھنے کی طاقت نہ تھی خاص شاگردوں نے لکھا۔ انتہائی درجہ کے معزز اور ثقہ حضرات شاہد ہیں کہ اُن کے سامنے حضرت نے ایک ایک حرف نہایت توجہ سے سُنا۔ بعض الفاظ اور جملوں کے زیادہ اور کم کرنے کی فرمایش کی ✤

جمعیۃ العلما کا صرف نام تھا۔ صدہا علما کا مقصود اعظم حضرت کی زیارت تھی اور تبعاً شرکت جلسہ۔ جو حضرات اس موقع پر حاضر ہوتے حضرت اُن سے نہایت بشاشت اور بہت ہی فرحت کے ساتھ ملتے۔ بعض سے فرماتے کہ "آپکا تو انتظار ہی تھا" بعض سے کہا کہ "بھائی بہت انتظار دکھلا کر آئے" حضرت کے بعض شاگرد جنکی مقبولیت و شہرت کی وجہ سے جمعیۃ العلما کو خاص تقویت کی اُمید تھی جب بالکل یکسوئی اور بے تعلقی کے ساتھ شرکت سے علیحدہ اور مجتنب رہے تو آپکو نہایت حسرت ہوئی اور غایت افسوس کیساتھ اپنے ایک ہمنام آلہ آبادی کی زبان سے گویا یہ فرمایا ؎

کسی کا میرے بزمِ غم سے اُٹھ جانا قیامت ہے — شریکِ محفلِ اغیار ہو جانا

حضرت کا شوق اور دلچسپی اور جس کام کی سرپرستی کا وعدہ کیا ہے اُسکی اہمیت کا لحاظ اور نگرانی کا خیال تو اسی کو مقتضی تھا کہ مقامِ جلسہ پر جاکر حضرت شریک ہوتے لیکن اطبا نے اسکو مضر سمجھا اور اصرار کیساتھ عرض کیا۔ حضرت نے بھی اُن کے خلاف رائے عمل کرنا پسند نفرمایا اور ظاہری شرکت سے مجبور رہے۔ لیکن محض جلسہ کی رعایت سے حضرت کا اُن ایام میں دھلی قیام فرمانا بھی ایک اعلیٰ درجہ کی شرکت تھی اور منتظم اور کارکن لوگوں کے لئے باعثِ عزت ✤

جلسہ میں عجیب قدرتِ خداوندی نظر آتی تھی۔ مختلف الخیال علما ایک جگہ ایک مقصود کیلئے جمع تھے۔ اختلاف کو بھول گئے تھے اور یہ سب بکمالِ خلوص و عقیدت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر

ادابِ نیازمندی بجالاتے تھے۔ جلسہ کامیابی اور خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہونے سے حضرت کو ایک ایسی مسرّت و طمانیت حاصل ہوئی جیسے کسی سپہ سالارِ اعظم کو فتح عظیم سے ✤

۹ ربیع الاوّل کو جلسہ ختم ہوا اور ۱۱ ربیع الاوّل کو مخصوص خدّام علماء باطمینان حضرت سے رخصت ہوکر اپنے مقامات کو واپس ہوئے۔ یہ کسکو معلوم تھا کہ یہ اسلام کا قائدِ اعظم اور دنیا کا بہترین شیخ اب دنیا میں صرف ایک ہفتہ کا مہمان ہے اور اسکا یہ دیدار آخری دیدار ہے ✤

حضرت مولانا جلسہ کے بعد بہت جلد دیوبند کی معاودت کا ارادہ فرما چکے تھے۔ مگر مشیّتِ ایزدی چاہتی تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سچے جانشین محدّث کی روح بھی اُسی سرزمین سے آسمان اور علیّین کیطرف جائے جہاں سے محدثین و فضلا کی ایک عظیم الشان جماعت کی ارواح عالمِ بالا کو گئی ہیں۔ قربِ صحت کی اُمید پر معالجوں نے اصرار کیا۔ حضرت نے واپسی میں عجلت نفرمائی ✤

حضرت کے امراض میں بیّن افاقہ نظر آتا تھا۔ اطبّا کی تشخیص میں جگر کی بھی اصلاح ہوگئی تھی چہرہ کا ورم بھی جاتا رہا تھا۔ البتہ ضعف تھا۔ اور ثقل سماعت ہوگیا تھا جسکی نسبت معالجوں کا خیال تھا کہ صحت اور قوّت کے بعد جلد زائل ہو جائیگا۔ نہ ایسے آثار تھے جن سے قربِ اجل کا گمان غالب ہو جائے اور نہ حضرت نے کبھی کوئی کلمہ فرمایا جو متوسلین کے لئے باعثِ مایوسی ہو جائے ✤

۱۴ ربیع الاوّل یوم جمعہ تک یہی اطمینانی حالت تھی یکشنبہ کے روز حضرت کو لرزہ کے ساتھ نہایت تیز بخار ہوگیا تکلیف بڑھ گئی۔ اور حالت تشویشناک ہوگئی۔ اس سے پہلے اطمینان بخش حالت دیکھکر اور دیوبند میں اپنی صاحبزادی کی شدید علالت سنکر مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبند تشریف لیگئے تھے۔ علالت کی زیادتی دیکھکر ڈاکٹر صاحب نے دیوبند آدمی روانہ کیا۔ دوشنبہ کو بوقت عشا نو بجے حکیم صاحب دہلی پہنچے تو مولانا کی تکلیف نہایت بڑھی ہوئی تھی۔ اور حالت خطرناک تھی۔ تاہم ہوش و حواس بجا تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے کوئی بات فرماتے تھے ✤

رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جسکو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کرسکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلافِ اُمید حلق میں اُتر گیا۔ چھ بجے کچھ اجابت ہوئی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بلحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت طاری تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد موجود تھے۔ دل دھڑک رہے تھے۔ طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے ✤

ساڑھے سات بجے کے بعد (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو) بہت تغیر ہوگیا۔ اور حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اُس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جسکے نام پر اپنے آپکو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ ۔ اللہ ۔ اللہ فرمایا ؂

مولانا کفایت اللہ صاحب نے سورہ یٰسین شروع کی ۔ مگر وہ جوشِ گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے ۔ اسلئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا ۔ سورت قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کرلیا ۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھولکر سیدھی کرلی اور آٹھ بجے جبکہ مولوی صاحب بالکل اخیر سورت پر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کیلئے زبان کو حرکت دی اور خاص اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ کی آواز پر قبلہ رُخ ہوکر ہمیشہ کیلئے آنکھ بند کرلی یُسر و سہولت سے سانس منقطع ہوگیا ۔ اور رُوحِ مقدس رَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِیْمٍ کی بہار دیکھنے کے لئے تمام اہلِ اسلام کو یتیم و بیکس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی ۔ اور رفیقِ اعلیٰ سے جاکر مل گئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بیقراری کا اندازہ آسان نہیں ۔ کچھ دیر تک تو وہ حالت رہی کہ ایک کی ایک کو خبر نہ تھی ۔ کسی کی آہ نکلی ۔ کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ ایسے جانگداز حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے ۔ مگر حضرت کا فیضِ صحبت کام آیا اور رضا بالقضا کا مضمون غالب ہوا ؂

نصف گھنٹہ کے بعد منزلِ اوّل کا فکر ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی صاحب اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دھلی میں دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین کے مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے ۔ حضرت مولانا کی آرزو بھی اپنے مخدوم اُستاذ کے جوارِ باکرامت کی سب کو معلوم تھی اور یہی کشش دوسری دنیا (یعنی مالٹا) سے کھینچکر یہاں لائی تھی ۔ اور دو صاحبزادیاں بھی ابتک دہلی نہ پہنچی تھی اسلئے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا بہتر ہے ؂

دہلی میں تو اس سانحہ جانگداز کی خبر بجلی کی طرح ایک دم میں پھیل ہی گئی تھی۔ دیوبند کو ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ "وفات ہوگئی جنازہ شام کو دیوبند پہونچیگا"۔ اور بعض اخبارات کو بھی تار دئے۔ دہلی سے اور بھی صدہا شخصوں نے بذریعہ تار اپنے عزیزوں اور مولانا کے معتقدین کو اس مصیبت کی اطلاع دی۔ اور دوسرے مقامات پر تار پہونچے تو وہاں سے بھی لوگوں نے اپنی متعارف اشخاص کو حتی الوسع جلد مطلع کیا اور پولس اور خفیہ پولس نے بھی اپنے محکموں میں اطلاع دہی میں کوتاہی نہیں کی۔ اس طرح مغرب کے وقت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قیامت خیز واقعہ کی اطلاع پہنچگئی۔ خیال نہیں ہوتا کہ ہندوستان میں کبھی کسی بڑے سے بڑے مقتدا اور مقتید یا قومی لیڈر کی وفات کی خبر اس سرعت کے ساتھ شائع ہوئی ہو۔

ڈاکٹر صاحب اطلاع دہی اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے حضرت کے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون ان کو غسل دیا۔ کفن پہنا کر تابوت میں رکھا۔ (جو نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا) اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سارٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہوگئے جنکی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب نے جس طرح اپنے اس مخدوم مہمان کی مہمانداری اپنے ذمہ رکھی تھی اسی طرح تجہیز و تکفین اور ریل کے متعلق تمام مصارف بھی خود ہی برداشت فرمائے اور حضرت مولانا کے اعزہ کی طرف سے اسکے خلاف اگر کچھ اشارہ بھی معلوم ہوا تو ناگوار گذرا فجزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

دہلی میں وفات کی خبر مشہور ہونیکے ساتھ ہی تمام اہل اسلام اور ہنود نے بھی دکانیں بند کردی اور ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچگئے۔ ایک مرتبہ کوٹھی کے سرسبز وسیع میدان میں نماز ہوئی اور جنازہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ہزاروں اہل اسلام شریک ہوتے جاتے تھے جنازہ کو کاندھا دینے کا تو کیا ذکر ہے ہاتھ لگانا بھی نہایت دشوار تھا۔ تمام مجمع آہستہ آہستہ ذکر اللہ کرتا جاتا تھا اور بعض دفعہ اللہ اکبر کے نعرے دل ہلا دیتے تھے۔ بہت لوگ بیقرار و اشکبار چلے جارہے تھے۔

جامع مسجد کے قریب پہنچکر لوگوں کا اصرار ہوا کہ جامع مسجد میں دوبارہ نماز ہو لیکن وقت کی تنگی کا عذر کرکے بمشکل تمام اسٹیشن پہنچتے پہنچتے ادنی اندازہ سے بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ یہاں

ایک مرتبہ پھر نماز جنازہ پڑھی گئی اور انجن کے قریب ایک نہایت صاف وشستہ مال گاڑی لگاکر تابوت اسمیں رکھاگیا مسلمانوں کے چہروں پر حسرت برستی تھی اور تمام جگہ افسردگی کا عالم نمایاں تھا - صدہا لوگوں نے ٹکٹ لیکر اسی گاڑی میں دیوبند کا قصد کیا اور مخصوص حضرات جنازہ کے گرد مال گاڑی میں سوار ہوکر خاموشی سے ذکر اللہ کرنے لگے - اڑھائی بجے کے بعد دہلی سے اس قطب زماں کے جسد عنصری کو لیکر گاڑی روانہ ہوئی +

جن مقامات پر خبر پہنچگئی تھی وہاں کے اسٹیشنوں پر مخلوق کا نہایت ہجوم تھا کچھ لوگ حسرت سے جنازہ کی زیارت کرکے چلے جاتے تھے اور بعض اصحاب دیوبند تک ہمراہ رہنے کے لئے سوار ہوجاتے تھے - شہر میرٹھ اور چھاونی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی - جنازہ باقاعدہ قبلہ کی طرف گاڑی میں رکھا ہوا تھا - امام اور دس بیس مقتدی گاڑی پر آجاتے تھے اور باقی تمام مجمع باہر سے اقتدا کرتا تھا +

دیوبند سے چند حضرات کئی روز سے دہلی حاضر ہونے کا قصد کر رہے تھے دوشنبہ کو کسی قدر صحت کی خبر سنکر ٹھہر گئے لیکن سہ شنبہ کو (یعنی وفات کے روز) گیارہ بجے دن کی گاڑی میں دیوبند سے حضرت مولانا کی صاحبزادیاں اور ایک داماد اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، حضرت مہتمم صاحبان دہلی کو روانہ ہوئے - چار بجے یہ گاڑی غازی آباد پہنچی تو دیکھتے ہیں کہ دہلی سے آنیوالی گاڑی (جو اسیوقت غازی آباد پہنچتی ہے) دہلی کے اہل اسلام اور حضرت کے خدام سے بھری ہوئی ہے - ابتداءً تعجب ہوا اور پھر خیال آیا کہ شاید حضرت وطن واپس آرہے ہیں یہ لوگ ہمراہ ہیں - اس خیال کو ایک لمحہ گذرا تھا کہ اُس گاڑی میں سے بعض حضرات نے اُتر کر اس واقعہ فاجعہ کی اطلاع کی کہ روح مبارک وطن حقیقی میں پہنچ چکی اب جسد خاکی اپنے ظاہری وطن میں آرہا ہے - یہ حضرات حیران و پریشان رہگئے - زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی بے ساختہ سب کی زبان سے اِنّا للّٰہ وانا الیہ راجعون ؐ نکلا - گاڑی چھوٹنے کا وقت قریب تھا - یہ حضرات بعجلت تمام اُتر کر دیوبند آنے والی گاڑی میں باچشم گریاں سوار ہوگئے - لیکن صاحبزادیاں اور اُن کے کفیل سوار نہ ہو سکے غازی آباد ہی میں بہ مایوسی وحیرانی ٹھہر گئے +

ڈاکٹر صاحب کے نو بجے روانہ کئے ہوئے تار نے ساڑھے تین بجے اس مصیبت کبریٰ کی خبر پہنچاکر ایک قیامت قائم کردی - دم کے دم میں تمام شہر میں خبر پھیل گئی جس شخص نے جسجگہ خبر سنی ایک

سکتہ کے عالم میں کھڑا رہگیا۔ کوئی روتا تھا کوئی شدتِ صدمہ سے مدہوش تھا۔ کوئی بحالِ پریشان ساکت کھڑا تھا۔ حضرت مولانا کے مکان پر بہت لوگ جمع ہوگئے۔ اکابرِ دارالعلوم میں حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب دیوبند میں موجود تھے۔ آپکی تجویز سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے مزار پُر انوار کے قریب اور حضرت شیخ الہند کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بالکل متصل اُس فخرِ آباء واکابر کیلئے قبر تیار ہونے لگی اور یہ تمام مقبرہ جو نامی گرامی مقدس علما و اولیا و صالحین اور صدہا غریب الوطن طلبہ اور نامی گرامی مدرسین کے قابلِ قدر اجساد سے معمور ہے ایک معزز مہمان کا انتظار کرنے لگا۔ اور مقدس ارواح استقبال کیلئے تیار ہوگئیں +

تمام دیوبند میں خصوصًا دیندار طبقہ میں آج گھر گھر ماتم تھا۔ عورتیں اور بچے تک رنج وغم میں مبتلا تھے۔ بہت سے گھروں میں اس رات کو کھانا نہیں پکا اور صدہا لوگوں نے اسوقت سے حضرت کے دفن ہونے تک ایک دانہ نہیں کھایا +

مغرب کی نماز کے بعد بلا کسی تحریک و ترغیب کے محض جذبۂ الٰہی سے دیوبند کے تقریبًا تمام مسلمان (اور بعض ہندو) انتہائی رنج و ملال کے ساتھ ایک حسرت و عبرت کا منظر دیکھنے اور اپنی مقدس مقتدا و پیشوا کے تابوت کا استقبال کرنے کے لئے حاضر ہوگئے۔ مالٹا سے حضرت کی تشریف آوری دیوبند میں دن کو ہوئی تھی اور کئی روز پہلے سے خبر مشہور ہوگئی تھی مگر اسقدر مجمع نہ تھا۔ خدا جانے آج کہاں سے یہ کثرت ہوگئی تھی کہ مجمع کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا +

پورے وقت پر ساڑھے سات بجے گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اسکے بعد کی حالت لکھنے کی نہ قلم میں طاقت ہے نہ زبان کو یارا۔ دروازہ کھلی ہوئی گاڑی میں حضرت کا تابوت نظر آتا تھا کہ اسٹیشن پر ایک کہرام مچگیا۔ بے اختیار و بے قرار لوگ روتے تھے۔ کسی کی چیخ نکلتی تھی کوئی آہ کرتا تھا ایک پر ایک گرا پڑتا تھا اللہ اکبر کے نعرے جو فرحت و مسرت کے جوش کو دوبالا کردیا کرتے ہیں آج بالکل مایوسی بخش اور بے موقع نظر آتے تھے۔ آہ وہ مردِ خدا جو چار ماہ ہوئے تشریف آوری کے وقت اسٹیشن پر تبسم کرکے مصافحے کرتا تھا آج تابوت میں بے خبر سوتا ہے :-

ازدحام کی وجہ سے تابوت بمشکل تمام اسٹیشن سے باہر نکلا اور پھر دوبارہ ایک بیقراری اور جوشِ غم کا عالم طاری ہوگیا۔ مجمع کی کثرت سے انتظام قائم رکھنا دشوار تھا۔ اور جنازہ کو ہاتھ

لگانا سخت مشکل۔ جسکا ایک دفعہ ہاتھ پہنچگیا وہ چھوڑنا ہی نہ چاہتا تھا۔ بعض لوگ صرف ہاتھ لگا لینا
غنیمت سمجھے ہوئے تھے اور بعض ضعفاء محض ساتھ چلنے کو سعادت +
اسٹیشن سے گذر کر جنگل کا راستہ ختم ہوا شہر میں بازار کے راستہ سے جنازہ گذرا۔ تمام مجمع
سے اسلامی شان وشوکت نظر آتی تھی اور تابوت سکینہ کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ دوکانوں اور چھتوں
پر ہندو و مسلمان بقصد تعظیم بچشم پرنم بحسرت تمام کھڑے ہوئے تھے۔ ازدحام کی وجہ سے راستہ بہت
دیر میں قطع ہوا اور رفتہ رفتہ جنازہ حضرت کے مکان کی نشستگاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ اسوقت
مجمع اپنے جوشش گریہ کو ضبط نکر سکا آہ وبکا کی آواز بلند ہوئی۔ لوگوں کے بدن پر لرزہ پڑ گیا +
افسوس جس مکان میں شیخ الہند ہر وقت رونق افروز رہتے تھے اور پالکی میں سوار ہو کر لوگوں
کو تسلی دیتے ہوئے جسجگہ سے رخصت ہوئے تھے آج وہاں بالکل ساکت و صامت تابوت میں
لیٹے ہوئے جامۂ کفن پہنے ہوئے آرہے ہیں۔ واحسرتاہ واویلاہ +
تابوت کاندھوں سے اُتار کر سہ دری میں رکھا گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد جب لوگوں کا گریہ وزاری
کم ہوا دفن کے متعلق گفتگو ہوئی۔ قبر تیار ہو چکی تھی بعض حضرات کی رائے تھی کہ تعجیل مسنون و مستحب
ہے ابھی دفن کرنا مناسب ہے۔ دوسرے اصحاب زیادہ لوگوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہونیکی
مصلحت سے تاخیر پسند کرتے تھے۔ چونکہ صاحبزادیاں اور داماد غازی آباد میں گاڑی سے رہگئے
تھے جنکے رنج وصدمہ کا بہت خیال تھا اسلئے تاخیر ہی پر اتفاق ہوا۔ اور بعد نماز صبح نماز جنازہ
اور دفن کا اعلان کر دیا گیا +
مکان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی جانا نہیں چاہتا تھا۔ بمشکل تمام اس عذر سے لوگوں
کو رخصت کیا کہ "اب مکان کی عورتیں آکر زیارت کرینگی"۔ بمجبوری سب متفرق ہو گئے۔ عشا کی
نماز ادا کر کے بہت حضرات تسبیح وتہلیل وقرأت قرآن میں مصروف ہوئے۔ بعض دن بھر کے تکان
اور کوفت کی وجہ سے معذور ہو کر آرام کرنے لگے +
صدہا مہمان جو دہلی وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ صرف نماز کے لئے آئے تھے اور ایک بجے
کی گاڑی میں واپس ہو سکتے تھے۔ وہ بھی صبح تک ٹھیرنے پر مجبور ہوئے۔ اور دار العلوم کے
مکانات میں یا جسجگہ موقع ملا یہ رنج وغم کی رات کروٹیں لیکر بسر کر دی +

رات کی گاڑیوں میں سہارنپور کی طرف سے بھی بہت لوگ شرکت نماز کیلئے حاضر ہوگئے اور صاحبزادیاں بھی غازی آباد سے دوسری گاڑی میں دیوبند پہنچ گئیں ٭

جنازہ کو تابوت سے نکالکر چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا۔ مخصوص حضرات و خدام جنازہ کے گرد کلمۂ طیبہ کا ذکر اور قرآن خوانی کرتے ہوئے تمام شب بیدار رہے ٭

بیقراری اور بے چینی کی رات خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ نماز فجر کے بعد جوق جوق لوگ ہر طرف سے آنے شروع ہوئے۔ مختصر مجمع کو ایک مرتبہ مکان پر چہرہ کھولکر زیارت کرائی گئی۔ جنازہ اُٹھایا گیا اور مولانا اپنی نشستگاہ سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہونے لگے۔ در و دیوار زبانِ حال سے الوداع و الفراق پکار کر دم کے دم میں بے رونق ہوگئے ٭

حضرت کے مکان سے دار العلوم تک گلی کوچے آدمیوں سے بھرے ہوئے تھے بہ مشکل تمام آہستہ آہستہ جنازہ دار العلوم میں پہنچا اور صحن میں رکھدیا گیا۔ مجمع کثیر تھا اور ہر شخص شوقِ زیارت میں بے تاب ہوکر ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔ کوئی تدبیر خیال میں نہ آتی تھی کہ بسہولت زیارت ہوجائے نہ یہ گوارا ہوتا تھا کہ اس آخری نظارہ کی حسرت سب دل میں لئے ہوئے محروم رہجائیں۔ بہت دیر کے بعد یہ تدبیر کیگئی کہ غربی جانب کی درسگاہ متصل نودرہ یعنی قدیم دفتر و کتبخانہ کے کمرہ میں جنازہ رکھکر چہرہ کھلوادیا گیا۔ درسگاہ نودرہ کے پاس سے لوگ داخل ہوکر زیارت کرتے تھے اور جدید دروازہ سے دار الحدیث کیطرف نکل جاتے تھے ٭

اگرچہ انتظام مناسب تھا لیکن اس آمدرفت میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی جاتی تھی۔ بہ مجبوری بہت سے لوگوں کو محروم و مشتاق چھوڑنا پڑا اور جنازہ اُٹھاکر درسگاہِ نودرہ کے درمیانی کمرہ میں (جسجگہ حضرت نے تمام عمر حدیث شریف کا درس دیا ہے) رکھا گیا۔ نودرہ اور باہر صحنِ مدرسہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہ مشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت کے ولیٔ اقرب اور برادرِ عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب (جنہوں نے ابتک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی) با قلبِ مضطر و چشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تمام مجمع پر ایک پُرکیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہورہی تھی۔ خواہ اسکو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت و حقیقت ٭

نماز ختم ہوئی اور اُس مکان نے جسکو مولانا ہی کی ذات کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے دار العلوم

وبدار الحدیث کے مرتبہ پر پہنچایا ہے - اور جہاں مولانا نے چالیس برس علوم نبویہ کے افاضہ واشاعت میں گذارے تھے آخری الوداع کہا- اِنا للہ وانا الیہ راجعون ؕ کل شیٔ ھالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؕ

روتا ہے باغباں درِ گلشن پہ زار زار — یعنی چمن سے ہوتی ہے رخصت بہار آج

علما، صلحا، زہاد، وصالحین، معتقدین کے سروں اور ہاتھوں پر جنازہ اٹھا اور چشم زدن میں مدرسہ کے دروازہ سے نکل گیا- دار العلوم خالی ہوگیا- ہر طرف اداسی چھا گئی - اور حسرت ومایوسی برسنے لگی- افسوس ؎

مدرسہ میں پڑ رہا ہی آج کیسا زلزلہ — قاسم الخیرات کا ثانی اٹھا جاتا ہے آج
باغباں رخصت ہوا گلزار سونا ہوگیا — رونق دار الحدیث ومدرسہ جاتا ہے آج
گونجتا تھا جسکی تقریروں سے سارا مدرسہ — وہ مقرر ساکت وصامت چلا جاتا ہے آج
مدتوں روئیگا جسکو آپکا دار العلوم — ہائے استاذِ علوم انبیا جاتا ہے آج
آپ کیا جاتے ہیں جاتی ہی بہارِ مدرسہ — عالمِ فانی سے سب نور وضیا جاتا ہے آج
آئے ہیں لینے رشید وقاسم امداد ورفیع — سوئے جنت سرپرستِ مدرسہ جاتا ہے آج
کون سکھلائیگا اب ہمکو علومِ انبیا — عالمِ علمِ حدیثِ مصطفیٰ جاتا ہے آج
انکے جانیسے مٹی جاتی ہیں پہلی صورتیں — وہ رشیدی قاسمی نقشہ مٹا جاتا ہے آج
بیکسی دیکھی نہیں جاتی ترے خدام کی — بیقراری سے کلیجہ شق ہوا جاتا ہے آج
سخت جانی سے اگر جیتے رہی تو کیا جئے — زندگی کا لطف جینے کا مزا جاتا ہے آج
یاد کرتا تھا اسیرِ مالٹا کو مالٹا — لیجئے ہندوستاں خالی ہوا جاتا ہے آج
قیدِ ہستی سے رہا ہوکر بصد فرح وسرور — ثانی قاسم اسیرِ مالٹا جاتا ہے آج
جسکے دم سے کل تلک گلزار تھا دیوبند تمام — چھوڑ کر بستی سوئے صحرا چلا جاتا ہے آج
دفن ہوتا ہے زمیں میں آج وہ شمس العلوم — تیرہ وتاریک اک عالم ہوا جاتا ہے آج
اہلِ عالم آج کیوں چھوٹے بڑے ہیں اشکبار — مرشدِ کامل ولی رہنما جاتا ہے آج

دیوبند میں آجتک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کی ہمراہ اسقدر مجمع نہیں دیکھا تھا-

مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا۔ ہر شخص کو شوق تھا کہ جنازہ اٹھانے کی سعادت نصیب ہو لیکن مجمع کی کثرت نے اسکو دشوار کر دیا تھا۔ بمشکل تمام چارپائی یا چادر کو ہاتھ لگانے کا موقع ملتا تھا۔

مقبرہ مدرسہ سے کچھ دور نہیں۔ چند ہی منٹ میں جنازہ مقبرہ میں پہنچا اور بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکشی سے استراحت کیلئے یہ شاگرد فخر استاد اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین قطب عالم علوم و کمالات مجسم کو لحد میں اتارا اور منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم کا منظر پیش نظر ہو گیا۔ باوجود صبر و ضبط کے بیقراروں کے گریہ و زاری اور آہ و نالہ کی آوازیں بے اختیار بلند ہو گئیں اور ایک غمزدہ کی زبان سے بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر نکل گیا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں

وللہ در من قال ؎

وکیف استروہ فی التراب وما
یکون للشمس من ستر و تن قبین[1]

بطرز مسنون خشت خام لگاکر لحد بند کیگئی۔ وہ نورانی صورت ہمیشہ کیلئے نظروں سے پوشیدہ ہو گئی اور ستر برس افاضۂ انوار کرنیکے بعد آفتاب رشد و ہدایت غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہر شخص بحال زار حیران کھڑا تھا۔ نظروں میں دنیا تاریک نظر آتی تھی۔ بالآخر حسب دستور قبر خام ڈیڑھ بالشت اونچی بنائی گئی اور سب لوگ دعا کے بعد خالی ہاتھ جھاڑتے ہوئے کف افسوس ملتے ہوئے بچشم گریاں الیس ہوئے۔ وللہ در من قال کانہ یریثہ۔

شمع از جمع شد و محفل ما شد تاریک
رفت خور زیر زمیں ارض و سما شد تاریک

ہادی ما بشد و راہ ہدی شد تاریک
خانۂ شرع و طریقت بخدا شد تاریک

بعد ازیں کیست کہ زیں بیان غم اسلام خورد
فکر ایتام کند یا غم ناکام خورد

اے غم غمزدگاں ہیچ نخوردی رفتی
رحم بر خستہ دلاں ہیچ نکردی رفتی

[1] کیا خوب کہا ہے۔ میرے ممدوح کو کسطرح مٹی میں چھپا دیا۔ حالانکہ آفتاب کو نہ دفن کیا کرتے ہیں نہ پردوں میں چھپایا کرتے ہیں۔

گرم چو وحشت ہمیں بود بسر دی رفتی — چست و چالاک کنوں راہ نوردی رفتی
عجب از خلق کریم تو کہ بے ما رفتی — دوستاں با تو کمر بستہ و تنہا رفتی
جان ما بے تو بجا نیم تو بے ما چونی — شہر وحشت کدہ شد بے تو بہ صحرا چونی
اے کہ خورسند بما بودہ تنہا چونی — در تہ خاک بگو اے گل رعنا چونی
جامۂ علم و عمل بر قد زیبائے تو راست — خلعت فقر بہ بالائے نکویت زیباست

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو — چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہے ہے — پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگان تیہ حیرانی
زمانہ نے دیا اسلام کو داغ اسکی فرقت کا — کہ تھا داغ غلامی جسکا تمغائے مسلمانی
نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے — تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہیں سبکی قربانی
فضائلہائے شتی ہیں ہے کوئی ایک گنوائے — کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط اک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ — بخاری و غزالی بصری و شبلی و نعمانی
جنھیں چھوڑا تھا ہمیر حضرت امداد و قاسم نے — کریگا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی

افسوس بخاری زمانہ اٹھگیا۔ ابوحنیفہ ثانی رخصت ہوگیا۔ مسلمانوں کا مسلمہ شیخ الہند چل بسا۔ قافلۂ علما و طلبہ کا قافلہ سالار کوچ کر گیا۔ موجودہ مسلمانوں کا افضل الناس مقتدا دارالبقا کو چلا گیا۔ دنیا بہترین شیخ الحدیث سے خالی ہو گئی۔ حضرت مولانا کی موت کوئی معمولی موت نہیں سلف صالحین اور اولیائے کرام کی موت کا نمونہ ہے۔ جس سے بلا مبالغہ سرزمین ہند میں ایک معنوی زلزلہ پڑ گیا ؎

فَمَا كَانَ شَيْخٌ حَتْفُهُ حَتْفُ وَاحِدٍ — لَا تَحْسَبُوهُ مَاتَ شَخْصٌ وَاحِدٌ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا — فَمَمَاتُ كُلِّ الْعَالَمِيْنَ مَمَاتُهُ

حضرت کی وفات سے دارالعلوم دیوبند کا سرتاج اٹھ گیا۔ یہ اسلامی کارخانہ بے سرپرست رہگیا۔ ارکان و منتظمین کا پشت پناہ ماوا و ملجا جاتا رہا۔ طلبہ و مدرسین بے کس و یتیم ہو گئے۔ دیوبند کی شان و عظمت و رونق جاتی رہی۔ لطف خداوندی کا وہ مجسم سایہ اٹھ گیا۔ آپکی وفات سے عام اہل اسلام کو نہایت ناموافق زمانہ میں نقصان عظیم پہنچا۔ تحریک خلافت میں ابتری اور فتور آجانے اور لوگوں کی کمر ہمت ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ مگر خدا کے فضل سے امید ہے کہ مسلمان صبر و سکون کے ساتھ ثابت قدم رہیں گے اور

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلکر اپنی کھوئی ہوئی قوت پالینے کی کوشش کریں گے ؎

فتیٔ عیش فی معروفہ بعد موتہ کما کان بعد السیل مجراہ مرتعا

دفن سے فراغت کرنے کے بعد دوپہر تک اکثر مہمان رخصت ہوگئے فصلِ بہار ہو چکی گل مرجھا گئے بلبلیں اُڑ گئیں جو ہونا تھا ہوگیا۔ جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ قضاءُ اللّٰہِ غالبٌ یفعلُ ما یشاء و یحکم ما یرید دم مارنے کی جگہ نہیں کیا تھا اور کیا ہوگیا ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

فخر قوم مشہور لیڈر مولانا محمد علی صاحب وفات کی خبر پر دیوبند تشریف لے گئے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک بہ چشمِ پُرنم شریکِ مجمع رہے۔ ظہر کے بعد دار العلوم کی مسجد میں تقریر فرمائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اوصافِ حسنہ بیان کرکے غمزدہ قلوب کو بیقرار کیا اور حضرت کے اتباع اور تخلق بالاخلاق کی تاکید کی۔

شام کو چار بجے منڈی میں ہندو مسلمانوں کے عام جلسہ میں تقریر فرمائی اور شب کو رخصت ہوگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا ممدوح سے نہایت اُنس تھا اُن کو اپنے مقصد کا مُمد و معاون اور اپنا دست و بازو سمجھتے تھے۔ شدتِ مرض میں بھی باعزاز و احترام تعظیم و معانقہ کے لئے ہاتھ پھیلا دیتے تھے۔

وقتِ وفات سے اسوقت تک جابجا منفرق طور پر ہر شخص بقدرِ طاقت ایصالِ ثواب کر رہا تھا اور شدتِ غم و رنج اور مشغولی تجہیز و تکفین میں موقع کسی عام اجتماع کا نہ ہوا تھا۔ دفن سے اگلے روز پنجشنبہ کو دار العلوم میں طلبہ و علما جمع ہوئے۔ نہایت شوق اور خلوص قلبی سے ایک لاکھ پچیس ہزار کلمہ شریف کا ختم تین مرتبہ ہوا۔ اور باترتیب قرآن مجید پچیس پڑھے گئے۔ متفرق پڑھنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ اسی طرح جمعہ اور شنبہ کے روز بھی دار العلوم میں اجتماع ہوتا رہا اور مختلف اوقات میں بھی متفرق لوگ اپنی سعادت سمجھکر ایصالِ ثواب میں کوشاں رہے۔

یکشنبہ کو جامع مسجد میں بعد نماز صبح شہر کے عام مسلمان اور دار العلوم کے تمام طلبہ و مدرسین و متعلقین جمع ہوئے۔ اکثر لوگ قرآن شریف پڑھتے رہے اور کچھ آدمی کلمہ طیبہ۔ اس طرح باقاعدہ ترتیب وار بیس قرآن مجید ختم ہوئے۔ اور مختلف لوگوں نے بلا ترتیب بھی بکثرت حفظ اور ناظرہ پڑھا۔ اور کلمہ شریف کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ دس بجے مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم دار العلوم کی مختصر پُر درد تقریر کے بعد ایصالِ ثواب اور دُعا ہوکر جلسہ ختم ہوا۔

بعد ازاں بھی تنہا تنہا اور اجتماع کر کے دار العلوم میں طلبہ و مدرسین ایصال ثواب کرتے رہے۔ اور اب بھی کرتے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ عمر بھر کرتے رہیں گے ÷

یہ دیوبند کا حال تھا۔ اور تمام ہندوستان میں (سوائے بعض دیسی ریاستوں کے) جس جگہ تھوڑے سے مسلمان بھی آباد تھے ہر ہر شہر اور قریہ میں اسی طرح مجمع کر کے کلام مجید اور کلمہ طیبہ کا ایصال ثواب کیا گیا۔ اخبارات دیکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ایسے ایسے غیر مشہور مقامات ہیں کہ جنکا کبھی نام بھی نہ سُنا تھا بلا کسی مرکزی تحریک کے خود بخود مسلمانوں نے اجتماع کر کے ایصال ثواب کیا۔ ہندوستان میں ہزاروں اولیاء اللہ، علماء، مشائخ و محدثین کی وفات ہوئی۔ عالم میں زلزلہ پڑ گیا۔ لیکن اُمید نہیں کہ کبھی کسی بزرگ کیلئے اسقدر ایصال ثواب ہوا ہو۔ ؎

عمّت فضائلہ فعمّ مصابہٗ فالناسُ فیہ کلھم ماجورٌ

بلا مبالغہ ہزارہا کلام مجید کا ثواب پہنچایا گیا اور صدہا ختم کلمہ طیبہ کے ہوئے۔ اسمیں شک نہیں کہ خلافت کمیٹیوں کے جابجا قیام کو بھی اس عام ایصال ثواب میں بہت دخل ہے لیکن اصلی اور حقیقی محرک حضرت مولانا کی وہ خداداد عام عقیدت و محبت ہی جو قلوب میں جاگزین تھی۔ سچ ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا[1] ÷

ہندوستان کے اکثر بڑے اور چھوٹے شہروں میں عام ہندو مسلمانوں نے اظہار رنج کے جلسے منعقد کئے تقریریں ہوئی اور عرصہ تک عام قلوب میں حزن و ملال رہا۔ ؎

مضی شیخ ہندٍ حین لم یبق مشرقٌ ولا مغربٌ الا لہٗ فیہ مادحٌ

موت اہل دل کی زندگی جاوداں ہوئی برسوں ہر ایک بزم میں ذکر وفا رہا

حضرت قدس سرہ کے عزیز و اقارب اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحبان کی خدمت میں بہت سے تار ہزاروں خطوط تعزیت کے آئے۔ اخباروں نے مختصر اور طویل مضامین میں حضرت کی وفات اور اسلامی خدمات کا بعنوان شائستہ ذکر کیا۔ اخباروں میں عرصہ تک قطعات تاریخ شائع ہوتے رہے۔ علوم دینیہ کا نشر و اشاعت کرنے والے مدارس ہندوستان کے مہتمم و مدرس صاحبان کے اکثر حضرت ہی کے بلاواسطہ یا بالواسطہ تلمیذ یا خادم ہیں اِلّا ماشاء اللہ۔ اسلئے اس قسم کے تمام مدارس میں حزن و ملال کیوجہ سے چند روز کیلئے

[1] یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے اللہ تعالیٰ مخلوق کے قلوب میں اُن کی محبت بٹھلا دیتے ہیں ۱۲ ÷

تعطیل ہوگئی۔ دار العلوم دیوبند میں تو نہ کسی کا پڑھنے کو دل چاہتا تھا نہ پڑھانے کو۔ ایک عام اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آہ ؎

بزمِ علم و بذلہ سنجی گشت برہم یک بہ یک — ساقی از محفل شد و بشکستہ شد جام و سبو

محفلِ علم و ادب شد بے نمک از رفتنش — کامِ جاں شد بے مزہ از تلخیٔ ہجرانِ او

اکثر اہلِ مدرسہ تنہائی میں قرآن مجید پڑھکر ایصالِ ثواب کرتے یا باہم بیٹھکر حضرت کے کمالات تذکرے کرتے رہتے۔ جو کچھ کام کرتے تھے وہ بدرجۂ ضرورت و مجبوری +

حضرت مولانا رَوح و رَیحان میں پہنچگئے۔ اور جماعتِ مقربین میں جاکر شامل ہوگئے مگر (بقول ایک متبرک بزرگ کے) ہمکو تو اپنی بیکسی اور درماندگی پر حسرت اور اُسکا رونا ہی۔ ہائی جس سچے ہادی نے ہماری ہدایت میں توجہ تام اور جد و جہد بالا کلام مبذول فرمائی اور جملہ مضارِ دینی و دنیوی اور مصیبت و کلفت میں اپنی مقبول دعا اور توجہ و عنایت سے ہماری دستگیری اور پشت پناہی اور اعانت و تسلی میں دقیقہ نہ چھوڑا آج اُس طبیبِ روحانی کے مرضِ مفارقت میں کس سے چارہ جوئی کی توقع کریں اور کس سے اُن نقصانات و حوائج کے جبر و انسداد کی توقع رکھیں ؎

اُس نورِ چشمِ فضل کو کیونکر نہ روئیے — آنکھوں میں رہو ے اب کوئی ایسا نہیں رہا

دامن پکڑکے روئے نہ کیوں ایک ایک کا — جب چھوڑ جائے بیکس و تنہا ہمیں قضا

اولاد وغیرہ اور بعض دیگر حالات

جیساکہ ابتدا میں تحریر ہوا ہی حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ ہجری میں عالمِ ظہور میں تشریف لائے اور ۱۳۳۹ھ میں آپکے ظاہری فیوض سے دنیا محروم ہوئی۔ اس حساب سے آپکے اکہتّر ۷۱ سال کی عمر پائی۔ بائیس ۲۲ سال کی عمر میں محترم والد ماجد نے اپنی ہمسر اور معزز و شریف خاندان میں اُس زمانہ کے متوسط الحال رئیس منشی فہیم الدین صاحب کی صاحبزادی سے اپنی عزت و وجاہت کے شایانِ شان انتظام و اہتمام سے حضرت مولانا کی شادی کردی۔ اِدہر اہلیہ صاحبہ کی دانائی اور انتظام، مزاج شناسی اور اطاعت۔ اُدہر حضرت کی دینداری، اطہارِ اخلاق، حقوق شناسی اور حسنِ معاشرت۔ تمام عمر نہایت اتفاق و راحت سے بسر ہوئی اور حضرت مولانا کو امورِ دنیاوی اور ضروریاتِ زندگی کے تفکرات میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ کامل پچاس سال کی معیت کے بعد

حضرت کی وفات سے صرف چار ماہ پہلے (جنت میں سامانِ راحت انجام دینے کیلئے) دنیا سے رحلت فرمائی (جسکا حال آپ پڑھ چکے ہیں) ÷

یوں تو تمام خدام کو آپکی روحانی اولاد ہونیکا فخر حاصل ہے لیکن نسبی تعلق سے قابلِ فخر اولاد صرف آپکی چند صاحبزادیاں ہیں۔ اولاد کی تعداد و اصناف اگرچہ غیر اختیاری ہے لیکن حقتعالیٰ نے حضرت مولانا کو اسمیں بھی اتباعِ سنت نصیب کیا تھا یعنی ابتدا میں ایک صاحبزادی اور کئی صاحبزادوں کا بہت چھوٹی عمر میں انتقال ہو گیا۔ صرف چار صاحبزادیاں بڑی ہوئی جنکی شادیاں اور نکاح ہوئے ÷

پہلی صاحبزادی کا نکاح حضرت کے بڑے بھانجے مولوی محمد حنیف صاحب سے ہوا۔ کئی بچے صغیر سن انتقال کر گئے۔ پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے عثمان اور پیارا دو فرزند اور ایک لڑکی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ حضرت نے شادی کے بعد ان صاحبزادی کو اپنے مکان ہی پر رکھ لیا تھا اور مولوی محمد حنیف صاحب کو مثل بیٹے کے سمجھتے رہے۔ یہ صاحبزادی حضرت کے سفر اور نظر بندی سے بہت پہلے انتقال فرما گئی تھیں۔ حضرت اُن کی آخری بیماری میں نہایت پریشان اور غمگین نظر آتے تھے۔ لیکن وفات کے بعد ایک عجیب سکون ہو گیا تھا اگرچہ قلبی رنج و الم کچھ کم نہ تھا۔ صاحبزادی کی وفات کے بعد بھی حضرت کی شفقت داماد اور نواسوں پر بدستور رہی۔ اور نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی اُن کو مع اہل و عیال اپنے مکان پر شریک حال رکھا۔ اور سعادتمند بھانجے نے بھی اخیر عمر تک حضرت کو اپنے نیازمندانہ طرز سے خوشنود رکھکر دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کی ÷

دوسری صاحبزادی کی شادی حضرت کے چچازاد بھتیجے مولوی حافظ محمد شفیع صاحب مدرس دہلی مدرسہ اسلامیہ عبد الرب سے ہوئی۔ یہ صاحبزادی بھی بفضلہ تعالیٰ صاحبِ اولاد ہیں۔ مولوی محمد رفیع اور چند لڑکیاں موجود ہیں حضرت کی وفات کے حالات میں غازی آباد کے اسٹیشن پر انہیں صاحبزادی کے ریل سے رہجانے کا ذکر ہوا ہے ÷

تیسری صاحبزادی کے شوہر حضرت مولانا کے قریب محلہ ابو المعالی کے رہنے والے منشی محمد قاسم صاحب ہیں۔ یہ اگرچہ باضابطہ مولوی نہیں۔ مگر اپنی صلاحیت و دینداری اور حضرت کی اطاعت و طلبِ رضا میں عالموں سے کم نہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ دوسری صاحبزادیوں کی طرح انکو بھی اولاد عطا فرمائے ÷

چوتھی اور سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت مولانا کے بھانجے اور مولوی محمد حنیف صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی قاضی مسعود احمد صاحب (حال نائب مفتی دار العلوم دیوبند) سے منسوب ہوئیں۔ اور شادی ہونیکے بعد اکثر حضرت ہی کے مکان پر رہکر والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔ اور ان کے شوہر بھی اپنی قابلِ تعظیم خوشدامن اور

ممانی صاحبہ کیخدمت و اطاعت بہترین اولاد کی طرح کرتے رہے جس سے حضرت مولانا کی خوشنودیِ مزاج میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ابھی تک کوئی اولاد نرینہ نہیں لڑکیاں ہی باعثِ برکت ہیں +

کمالِ ایمان اور طریقۂ انبیا علیہم السّلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو کر ہر ایک مستحق سے اُسکے درجہ کی محبت ہو۔ حضرت کو صاحبزادیوں سے نہایت محبت تھی اور نواسوں پر بے انتہا پیار۔ محمد رفیع اور پیارے جب تک بچے تھے یہی ہر وقت مورِدِ شفقت رہتے تھے۔ اب وہ بفضلہ تعالیٰ جوان ہیں۔ عثمان چونکہ سب سے چھوٹا اور ابھی بچہ ہے آخری زمانہ میں اُسپر زیادہ شفقت تھی۔ وہ بھی ہر وقت اَبّا اَبّا کہتا رہتا تھا۔ اور حضرت بھی خدا جانے دن میں کتنی مرتبہ عثمان عثمان پکارتے تھے۔ اور کبھی باتباعِ سنت اُسکو پیار میں پاجی کہتے تھے۔ نواسوں کی طفلانہ حرکات کا ہنسکر ذکر فرماتے۔ عثمان کی شوخی و شرارت کو بیان کرتے۔ کبھی انہیں باتوں سے علمی پہلو واضح فرما دیتے +

ایکدفعہ فرمایا کہ "لکھا کرتے ہیں کہ وضو امر تعبدی ہے قیاس کو دخل نہیں۔ آج اسنے پیارے نے اول خوب وضو کیا کپڑے پہنے اور اسیوقت پیشاب کیلئے بیٹھ گیا۔ سب نے کہا تیرا وضو جاتا رہا تو خفا ہو کر کہتا ہے کہ واہ میں نے تو پیشاب کیا ہے۔ ہاتھ منہ تو ویسے ہی دُھلے ہوئے ہیں۔ ابھی خشک بھی نہیں ہوئے وضو کیسے ٹوٹ گیا +

مالٹا سے صاحبزادیوں اور اُن کی اولاد کو نام بنام دعا پیار، مضامینِ شفقت، تسلی آمیز جملے تحریر فرماتے مرحومہ صاحبزادی کیلئے ایصالِ ثواب کی گھر میں تاکید تحریر فرماتے۔ اور عالمِ آخرت کو یاد دلاتے +

صاحبزادیوں نے اپنی محترمہ والدہ کی طویل علالت میں پوری خدمت کی۔ اور مالٹا سے تشریف آوری کے بعد جب حضرت فتحپور، ہسوہ اور لکھنؤ وغیرہ کے سفر سے واپس ہوئے تو روزانہ مہمانوں کی مہمانداری بھی انہیں صاحبزادیوں کے حُسنِ انتظام سے بخوبی ہوتی رہی۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی صاحبزادیاں عرصہ تک حضرت ہی کے مکان پر رہیں اور خاص خدام و رفقا اور تعزیت کیلئے حاضر ہونے والے لوگوں کی تواضع و مدارات میں قصور نہ آنے دیا۔ اب بھی چھوٹی صاحبزادی (اہلیۂ مولوی قاضی مفتی مسعود احمد صاحب) حضرت کے مکان پر رہتی ہیں۔ جنکی وجہ سے حضرت کے نام سے آنے والے خادموں کو راحت کا ٹھکانا اور دو گھڑی اشکِ حسرت بہانے کا موقع ملجاتا ہے +

حضرت مولانا نے اِن چاروں صاحبزادیوں کی شادی اپنے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر ایسی ہی سادگی اور اتباعِ سنت سے کی جو حضرت جیسے محدثِ اعظم اور عاشقِ سنت کے شایانِ شان تھی کبھی جامع مسجد میں

نماز کے بعد اعلان کر کے داماد کو بٹھلا کر نکاح پڑھ دیا۔ کبھی مدرسہ میں علما و طلبہ کے مجمع میں بطریق مسنون عقد کر دیا اور معمولی کپڑے پہنا کر معمولی ڈولی میں بٹھلا کر لڑکی کو رخصت کر دیا ٭

موقع بہ موقع اُن کے ساتھ احسان و سلوک فرماتے تھے اور بعض لڑکیوں کو شادی کے وقت بھی کچھ ضروری چیزیں عطا فرمائی لیکن دنیاوی رسوم کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ حضرت نے شادیاں کیا کی دوسروں کو عملی سبق پڑھا دیا۔ حضرت مولانا اور آپ کے مقدس اُستاد ہی کی برکت ہے کہ دیوبند میں عموماً اور حضرت کے اقارب اور برادری میں خصوصاً صدہا رسوم چھوٹ کر شادیاں بالکل بقاعدۂ شرعیہ ہونے لگی۔ حضرت کی برابر سادگی اور اتباعِ سنت تو مشکل ہی تاہم اسقدر اصلاح ہوگئی ہے کہ دوسرے مقامات کے مہمان دیکھکر حیران ہوتے ہیں اور اپنے دیار کی رسوم اور اُن کی دِقتوں اور مضر نتائج پر حسرت و افسوس کرتے ہیں ٭

حضرت تمام عمر مَاوَضَعَ لَبِنَةً عَلٰی لَبِنَةٍ[1] کے مصداق رہے نہ کوئی تعمیر کرائی نہ کوئی مکان بنایا۔ والد ماجد کے تعمیر فرمودہ پختہ مکانات موجود تھے انھیں میں سکونت رہی۔ البتہ مالٹا سے واپس تشریف لاکر گھر میں باورچی خانہ کی انتہائی تکلیف دیکھکر پھونس کے چھپر ڈلوانے کا قصد فرمایا لیکن خدام و حاضرین خدمت نے سمجھایا کہ حضرت آجکل چھپروں میں صرف زیادہ ہے اور آگ لگجانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ آگ بھی نہ لگے تو تیسرے سال گل ضرور جاتے ہیں۔ اسلئے بعجلت تمام اینٹوں کی نہایت ہی سادہ اور معمولی تعمیر کرادی تھی ٭

خود ابتدائی عمر میں اپنے مکان میں رہتے تھے۔ پھر عرصہ دراز تک اپنے مکان کے قریب مسجد کے حجرے میں مطالعہ و کتب دینی و عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ ۱۳۰۶ھ میں جبکہ سنن ابی داؤد کی تصحیح کر رہے تھے مدرسہ کے قریب چھتہ کی مسجد کے بڑے حجرے میں (جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے بزرگان کا عرصہ تک دار الاقامت رہا ہے) آپ نے قیام فرمایا۔ پھر آخر زمانہ میں اپنے والد ماجد کے تعمیر کردہ مردانہ مکان میں مستقل اقامت فرمائی تھی۔ اسمیں اگرچہ دوسرے بھائیوں کے بھی حصے تھے لیکن حضرت کی حیات میں وہ سب حضرت ہی کے مہمانوں اور خادموں کے استعمال و تصرف میں رہی۔ اور بھائیوں نے اسکو بہ طیبِ خاطر پسند فرمایا۔ بلکہ اسکو اپنے لئے باعثِ اجر و فخر سمجھا ٭

اپنے خورد و نوش میں حضرت مولانا نے تمام عمر کبھی تکلف و اہتمام نہیں فرمایا۔ کھانا وقت پر جیسا موجود ہوا نہایت شوق اور رغبت سے تناول فرمایا۔ مکان پر اور ضیافت وغیرہ میں اگر عمدہ سے عمدہ کھانا ہوتا تو اسکو

[1] حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صحابہ کہتے ہیں کہ آپ نے عمر بھر کبھی اینٹ پر اینٹ نہ رکھی یعنی کوئی چھوٹی سی جھونپڑی تعمیر بھی نہیں کی؂

بھی بلا تکلف کھا لیتے۔ نہ کچھ زیادہ اظہارِ رغبت ہوتا نہ زُہد ریائی کے طریقہ پر اظہارِ کراہت۔ ادنیٰ درجہ کا کھانا خصوصًا دوسروں کے مکان پر ایسی رغبت سے تناول فرماتے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا کہ مولانا کو یہ چیز نہایت مرغوب ہے +

مکان کے اندر کھانا کھانے کا اگر کبھی اتفاق ہوتا تو بلا کسی امتیاز کے بے تکلف کسی جگہ بیٹھکر (بلکہ بعض دفعہ چولھے کے قریب اُکڑوں بیٹھکر) کھانا کھا لیتے۔ مجمع میں سب کی ساتھ شروع فرماتے مگر ایسی طرح کھاتے کہ سب کے بعد تک کھاتے رہتے اور کانَ اٰخرھم اکلاً کا نمونہ دکھلا دیتے۔ کبھی ذرا سا شوربا پی لیا کبھی دال یا چٹنی چاٹ لی۔ کبھی گوشت اُٹھا لیا۔ سرسری نظر میں کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ بہت کم کھایا ہے البتہ خیال اور غور سے دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ ابھی ایک روٹی بھی تمام نظر نہیں ہوئی +

قرآن مجید اور احادیث سے جن چیزوں کی فضیلت اور تعریف ثابت ہوتی ہے اُن کو بہت کثرت سے استعمال فرماتے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سرکہ کو نعم الادام (عمدہ سالن) فرمایا گیا ہے اسلئے سرکہ یا چٹنی اگر دسترخوان پر ہوتا تو سب چیزوں سے زیادہ اُسکی طرف رغبت فرماتے بلکہ بعض دفعہ منہ لگا کر ایک دو جُرعہ نوش فرما لیتے۔ ایک مرتبہ مادہ سوداوی کی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ بدن پر پھنسیاں اور بغل میں دُنبل نہایت تکلیف دے رہی تھے۔ اطبا سرکہ سے منع کرتے تھے مگر مولانا کبھی کبھی ذرا سا استعمال کر ہی لیتے تھے +

لحم کو جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطیب الطعام (بہترین کھانا) فرمایا ہے اسلئے مولانا گوشت کو بہت پسند فرماتے۔ معمولی گوشت کے علاوہ جوانی میں خود شکار کرتے اور آخری عمر میں دوسروں کے شکار کئے ہوئے گوشت میں سے لیتے اور کھاتے۔ اگرچہ بہت زیادہ نہ کھاتے تھے مگر بہت رغبت و شوق سے قربانی کے لحم کو دعوتِ رب العالمین سمجھکر دن میں کئی کئی مرتبہ تناول فرماتے۔ اور حاضرین کو کھلاتے۔ اور اُسکے باریک پارچے نمک لگا کر دھوپ میں خشک کراکے رکھ لیتے۔ پھر کبھی کبھی انگیٹھی پر سینک سینک کر خود کھاتے اور طلبہ و خدام کو کھلاتے جاتے۔ مالٹا میں باقاعدہ حلال ذبیحہ کا گوشت نہ ملنے سے عرصہ تک گوشت کھانے کا اتفاق نہ ہوا مگر پھر زندہ خرگوش خرید کر رفقا و خدام ذبح کرتے اور کھانے پکاتے تھے +

کوئی شخص تحفہ میں شہد پیش کرتا تو بہت خوشی سے قبول فرماتے اور مختلف طریقوں سے استعمال فرماتے کیوں نہو خود حق تعالیٰ اسکی نسبت فیہ شفاءٌ للناس فرماتے ہیں۔ آبِ زمزم کا تبرک نہایت قلبی فرحت سے

لہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پیچھے تک کھاتے رہتے تھے ۱۲

قبول فرمانے اور اہتمام سے منگاتے۔ کبھی کبھی مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ خدام ٹین کے بڑے ڈبوں اور کنستروں
میں آب زمزم بھر کر بھیجدیتے اور حضرت بار بار احترام و رغبت سے نوش فرماتے۔ حاضرین و زائرین کو عطا فرماتے
جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شام میں پنیر تناول فرمایا تھا۔ حضرت مولانا کے مرغوبات میں داخل
تھا خصوصاً مکہ معظمہ کا بنا ہوا۔ مزاج شناس اہتمام سے خرید کر ہمراہ لاتے یا کسی آنے والے کے ہاتھ بھیجتے۔
زیتون کے درخت کو ایک جگہ نعمتہائے خداوندی میں شمار کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ شَجَرَةً تَخْرُجُ
مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْآكِلِيْنَ[1] - دوسری جگہ ارشاد ہے مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ[2]-
یہ درخت عمدہا برس پھل دیتا رہتا ہے اور درختوں میں زیتون ایسی کثیر المنافع چیز ہے جیسے چارپایوں میں اونٹ
یہی وجہ ہے کہ دونوں کا خدا تعالیٰ نے خاص طور سے ذکر فرمایا ہے کوئی جزو اسکا بیکار نہیں۔ اسکا تیل روشنی
کیلئے جلایا جاتا ہے۔ سالن کی طرح روٹی سے کھایا جاتا ہے۔ دواؤں میں استعمال ہوتا ہے بدن پر ملا جاتا ہے چمڑے
کی دباغت میں کام آتا ہے۔ تیل کی کھلی چوپایوں کو کھلانے میں اور لکڑی جلانے میں کام آتی ہے۔ راکھ بھی بیکار
نہیں جاتی بلکہ ریشم کو صاف کرنے اور دھونے میں استعمال کیجاتی ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ درخت سب سے پہلے
دنیا میں اُگا ہے اور بڑے بڑے بشر انبیاء نے اسکے لئے دعا فرمائی ہے یہانتک کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے دو مرتبہ فرمایا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِي الزَّيْتِ وَالزَّيْتُوْنِ (یا خداوند تعالیٰ زیتون کے تیل اور درخت
میں برکت عطا فرما)۔
اور احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ - پھر حضرت مولانا
اسکے استعمال میں کیسے کمی فرماتے۔ مالٹا میں یہ تیل بہت میسر ہوا۔ تین روپیہ کو ایک ڈبہ ملتا تھا تیسرے چوتھے روز
سب رفیقوں کے استعمال میں ختم ہو جاتا تھا۔ گوشت کی اصلاح اسی سے ہوتی۔ پلاؤ میں یہ ڈالا جاتا۔ سالن
کی جگہ روٹی سے کھایا جاتا۔ حضرت فرماتے تھے کہ "ہندوستان سے لوگ عمدہ گھی بھی بھیجدیتے تھے۔ لیکن اُسکے
مقابلہ میں مجھے اچھا نہ معلوم ہوتا تھا" فرماتے تھے کہ "ایک پیالی میں میرے پاس رکھا رہتا تھا۔ کبھی اُنگلی بھر کر
کان میں لگالی کبھی ناک میں کبھی سر پر۔ وطن میں بھی کسی قدر موجود رہتا تھا کبھی سر پر لگاتے کبھی کھانے میں استعمال
فرماتے۔ غرض آپنے كُلُوْا وَادَّهِنُوْا کی پوری تعمیل فرمادی۔ یہی شان ولایت ہے کہ شرعی اُمور مرغوبات طبعی

[1] یعنی حق تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک وہ درخت پیدا کیا ہو کوہ طور میں نکلتا ہے جس سے تیل نکلتا ہے اور کھانے والوں کیلئے ترکاری۔
دوسری آیت میں اسی کو بابرکت درخت فرمایا ہے۔ [2] زیتون کا تیل کھاؤ اور بدن پر لگاؤ کیونکہ وہ بابرکت درخت سے بنتا ہے جسکا قرآن مجید میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہوجائیں اُنہیں میں لُطف حاصل ہونے لگے +

چار کی عادت اور التزام نہ تھا۔ لیکن جب خدام بناکر پیش کرتے تو نوش فرما لیتے۔ مولانا حسین احمد صاحب نفیس و لطیف سادہ چار تیار کرتے تو اصرار کرکے کئی کئی فنجان پلادیتے۔ مخصوص مہمانوں کیلئے اہتمام سے چار پکوا کر اُن کی عادت کے موافق وقت پر پلاتے +

پان کی بہت عادت تھی اور اُسکے ساتھ خوشبودار بنا ہوا تمباکو استعمال فرماتے۔ پان کا ڈبا اور چھالیا کا بٹوہ اکثر سفر و حضر میں ہمراہ رہتا تھا۔ اثناء درس میں بھی کئی مرتبہ پان کھاتے اور مُنہ میں پان لئے ہوئے بلا تکلف تقریر فرماتے رہتے۔ مالٹا میں پان چھوڑ دینے کا قصد فرمایا تھا مگر ہندوستان سے چھالیا اور خشک پان وہاں پہنچتے رہتے۔ عادت چھوڑنے کی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہوئی۔ رفقا سے ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ ہندوستان پہنچکر کچھ عرصہ کے بعد پان کھانا ترک کردینگے۔ قضا نے یہ ارادہ ایسے حسنِ اُسلوب سے پورا کردیا کہ حضرت سُرخرو بھی رخصت ہوئے اور خود بخود پان چھوٹ گیا کچھ تکلیف بھی کرنی نہ پڑی۔ ثمارِ جنت کے مقابلہ میں پان کا پتہ کیا چیز ہے +

صحت حضرت کی عموماً اچھی رہتی تھی۔ سُوء ہضم اور ضعفِ معدہ وغیرہ کی وجہ سے پرہیز اور احتیاط اور دواؤں کے دائمی استعمال کی ضرورت نہ ہوتی تھی ضعفِ دماغ اور ضعفِ بصر کے شاکی نہ رہتے تھے۔ نظر قوی اور تیز دوربین تھی۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے حفاظتِ بصر کیلئے چشمہ استعمال فرماتے تھے۔ خونی بواسیر کا کبھی کبھی دورہ ہوتا اور خون نکلنے سے آپ ضعیف ہوجاتے۔ لیکن مخلص طبیبوں کی مجرب دواؤں کے اثر سے خدا تعالیٰ نے اس مرض سے عرصہ دراز ہوا کہ نجات دیدی تھی +

نظر بندی اور اسیری میں صحت اچھی رہتی تھی اور توجہ الی اللہ غالب۔ عالمگیر وبائی بخار کے زمانہ میں رفیقوں کو بخار آیا مگر حضرت محفوظ رہے۔ البتہ مالٹا سے واپس ہوکر سویز کے قیام میں دردِ دنداں کی بہت تکلیف اُٹھائی

سُنا ہے کہ جوانی میں حضرت مولانا لباس نفیس اور مکلّف پہنتے تھے۔ لیکن چند ہی روز کے بعد نہایت سادہ بالکل طالب علمانہ مُلّانی وضع کا ہوتا تھا۔ نہ ایسا پھٹا پُرانا کہ دیکھنے والے نفرت و کراہت کریں یا محتاج سمجھیں۔ نہ ایسا شاندار کہ امتیاز اور خصوصیت کا شائبہ ہو۔ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے نہ دیکھا ہو تو آپکو دیکھ لے۔ اتفاقیہ کہیں قیمتی کپڑا میسر ہوگیا تو وہی پہن لیا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ موجود ہوا تو اُس میں بھی عار نہیں۔ کبھی بیلدار چکن کا کرتہ زیب بدن کئے ہوئے جارہے ہیں اور کبھی معمولی دھوتر اور گزی کا پیراہن پہنے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کی مسند پر بیٹھے ہوئے حدیث پڑھا رہے ہیں نہ اُس میں افتخار نہ اسمیں عار۔ مالٹا کے

سفر سے پہلے بھی دیسی کپڑے کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اور آخری زمانہ میں تو اس طرف نہایت ہی توجہ ہو گئی تھی اور دوسروں کی ترغیب و تحریص کیلئے معمولی دیسی کپڑے اہتمام سے تیار کرائے تھے؛ نیچا کرتہ۔ سینہ پر کھلا ہوا گریبان اور شرعی مغلئی پاجامہ ہوتا تھا۔ دوپلی ٹوپی پہنتے یا عرب کی طرف کی سوزنی گول۔ عمامہ بہت کم باندھتے اور باندھتے بھی تو شملہ بمقدار علم سمجھکر مزین مشین و شاندار نہیں۔ بلکہ نہایت سادہ۔ سفید یا دھاری دار اور مختصر۔ مالٹا سے واپسی پر کبھی کبھی کرتہ پر سفید صدری بھی پہن لیتے۔ موسم سرما میں روئی دار نیمہ آستین یا روئی دار چوغہ (یعنی لبادہ) اور سر پر روئی دار کن ٹوپ۔ سبز کاہی یا کشمشی رنگ کی روئی دار دلائی اکثر استعمال کرتے۔ فرماتے تھے کہ "مالٹا کی سردی میں ان ہماری رزائیوں نے بڑا کام دیا"۔

حضرت مولانا کا توکل اور اعتماد علی اللہ۔ اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ ظاہری سامان معیشت اگر موجود بھی نہ ہوتے تو آپکو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ تاہم دار العلوم دیوبند کی طرف سے جو کچھ آپکی خدمت ہوتی تھی وہ اور والد ماجد کی حصہ رسد جائداد ذریعہ معیشت تھی۔ مگر روزانہ اضیاف کی مدارات اور فقراء و مساکین کی خبر گیری اور بہت سے ذوی القربیٰ اور رشتہ داروں کا تکفل اسقدر مصارف بڑھا دیتا تھا کہ بہت دفعہ قرضدار رہنے کی نوبت آجاتی؛ تحفہ و نذر بہت کم اور کسی بہت ہی مخلص کے اصرار سے قبول فرما لیتے تھے اسلئے یہ کوئی معتدبہ ذریعہ تھا۔ البتہ آخری مرتبہ حج کو تشریف لیجانے سے قبل اور مالٹا کی اسیری سے نجات پانے کے بعد جسطرح مصارف نہایت ہی بڑھ گئے تھے۔ اسی طرح اس میں خدا تعالیٰ نے وسعت فرما دی تھی؛

گھر کے انتظام یا نقد و جنس کے حسابات سے حضرت نے کبھی کچھ واسطہ و سروکار ہی نہیں رکھا۔ مدرسہ کا مشاہرہ اور جائداد کی آمدنی مکان میں وصول ہوتی تھی اور وہیں سے حسب موقع سلیقہ کے ساتھ صرف ہوتی اس طویل سفر حج اور اسیری مالٹا اور وہاں سے واپسی کے بعد وفات تک آمد و صرف سب کچھ رفیقوں کے ہاتھ میں رہا۔ خازن اور رفیق امانت و دیانت سے خرچ کرتے تھے۔ لیکن (خدانخواستہ) اگر چاہتے تو صدہا روپیہ ہضم کر لیتے۔ حضرت کو خبر بھی نہ ہوتی۔ یہ بات لاکھوں میں بمشکل ایک کو میسر ہوتی ہے کہ مال و دولت سے کچھ تعلق ہی نہ ہو؛

حضرت کے خدام راوی ہیں کہ بعض لوگ کئی کئی نوٹ پیش کرتے تھے تو حضرت کھولکر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ کتنے روپیہ کے نوٹ ہیں۔ اسی طرح کبھی تکیہ کے نیچے رکھدیتے کبھی پکار کر مولوی عزیز گل صاحب کے سپرد کر دیتے دینی ضروریات و مصارف میں حضرت یہ نہیں خیال فرماتے تھے کہ ذاتی روپیہ خرچ ہو رہا ہے یا اُنسی مد کا وصول شدہ وغیرہ۔ بلکہ جس طرح ہو سکتا اور جہاں سے ممکن ہوتا جمع کر کے دینی ضروریات کو پورا فرماتے کوئی اس کے

خلاف گفتگو یا اشارہ کرتا تو پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اس قسم کے امور میں حضرت کی وہ حالت تھی کہ اس زمانہ میں یقین آنا دشوار ہے اور ایسی نظیر ملنا محال +

حضرت کے اخلاق وعادات تواضع وانکسار

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے دریافت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان فرماؤ۔ جواب دیا کہ جو کچھ قرآنمجید میں ہے وہی آپکے اخلاق تھے۔ اسی طرح حضرت مولانا کے اخلاق وعادات وہی تھی جو احادیث صحیحہ میں مروی اور سنن نبویہ سے ثابت ہیں۔ نور معرفت سے سینہ معمور اور کتاب و سنت کے علوم سے دل و زبان آباد تھے۔ دیگر اعضاء و جوارح بھی انہیں کے تابع تھے جو حرکت تھی حکم خداوندی کے موافق اور جو فعل تھا سنت صحیحہ کے مطابق۔ سنت سنیہ اور اخلاق نبویہ کا نمونہ مجسم اگر حضرت کو کہا جائے تو بجا ہے اور انتہائی درجہ کے متبعین سنت صحابہ کی زندگی کا نقشہ آپکی حیات کو سمجھا جائے تو زیبا ہے +

کوئی قول و فعل خلاف شریعت ہونا تو درکنار۔ مدتوں خدمت میں رہنے والے خادم بھی یہ نہیں بتلا سکتے کہ کوئی ادنیٰ سا فعل بھی آپ سے خلاف سنت سرزد ہوا۔ دن ہو یا رات۔ صحت ہو یا مرض۔ سفر ہو یا حضر۔ خلوت ہو یا جلوت۔ ہر حالت میں حضرت کو اتباع سنت کا خیال تھا۔ خود بھی عمل کرتے اور اپنے متبعین و متوسلین کو بھی قولاً و عملاً اسی کی ترغیب دیتے اور رفتہ رفتہ عمل بالسنۃ حضرت کیلئے ایک امر طبعی ہوگیا تھا جسمیں کسی تکلف و تحریک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نہایت سہولت و متانت سے سنن و مستحبات کو ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر یہ نہیں کہ ہر وقت ہر ہر فعل پر حاضرین کو جتلانے یا اُن سے داد لینے کیلئے حدیث پڑھکر سنائیں اور عمل کریں۔ بعض دفعہ تو ایسی سادگی سے عمل فرماتے کہ پاس بیٹھنے والے اہل علم کو بھی بمشکل احساس ہوتا۔ نیا پھل کسی نے پیش کیا۔ کبھی خوشبو سونگھ لی رکھدیا۔ کبھی آنکھ سے لگالیا۔ پھر کسی بچہ کو پکارا اور اُسکو دیدیا کبھی کبھی یہ دیکھنے کے حیلے سے کہ بارش ختم ہوگئی یا نہیں دو چار قطرے سر اور جسم پر لیکر حدیث[1] حَدِيثُ عَهْدٍ بِرَبِّي کا لطف اٹھالیا کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ مولانا کیا کر رہے ہیں۔ البتہ جب خیال فرماتے کہ دیکھنے والا سمجھ گیا ہے تو مسرت کیساتھ تصریح فرمادیتے۔ ایک روز احقر کی عیادت کو تشریف لائے اور صرف مصافحہ کرکے واپس ہونے لگے میں نے

[1] حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے قطرے بدن پر لیتے اور فرماتے کہ تازہ تازہ میرے پروردگار کے پاس سے آیا ہے۔ ایسی باتوں میں اہل محبت ہی کو کچھ لطف آتا ہے ۱۲ +

عرض کیا کہ حضرت آپکو بھی آج ہی حدیث پر عمل کرنا تھا تبسم فرماکر فوراً پڑھ دیا کہ اَلْعِبَادَۃُ[۱] کَفُوَاقِ نَاقَۃٍ ✧
غرض چلنا پھرنا لیٹنا بیٹھنا کھانا پینا سونا جاگنا جو کچھ بھی تھا کمالِ اتباع کے ساتھ تھا۔ مگر نہایت خاموشی سے درجۂ اخفا تک پہنچا ہوا۔ سفر میں رفیقوں سے ایسی بے تکلفی اختیار فرماتے کہ وہ سب کلفتِ سفر بھول جاتے اور حکایات وواقعات سنا سنا کر لَا سَمَرَ اِلَّا لِمُصَلٍّ اَوْ مُسَافِرٍ کی حکمت واضح فرما دیتے ✧

سادہ اور بے تکلف طالبعلمانہ صفت کے لوگوں کی صحبت سے نشاط پاتے اور رئیسانہ ساز وسامان اور بے موقع تکلفات سے نہایت منقبض ہوتے۔ کسی تقریب سے ریاست رامپور جانیکا اتفاق ہوا اور کسی معزز شخص کی ہمراہ بطور سیر کے نواب صاحب کے سجے ہوئے مکلّف کمرہ میں پہنچے۔ انتہائی زیب وزینت تھی۔ جابجا نقشے اور تصویریں لگی تھی۔ بکلف قالین اور بستر لگے ہوئے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ "اسقدر انقباض ہوا کہ قریب تھا کہ دم گھٹ کر نکل جائے"۔ فوراً باہر آگئے۔ رئیسوں سے مناسبت اور لگاؤ نہ تھا لیکن بزرگی جتلانے کے لئے اظہارِ نفرت یا اُن کی توہین ہرگز نہ کرتے۔ بلا وجہ مناسب تعظیم فرماتے۔ اخلاق سے ملتے۔ اگر وہ لوگ حضرت کے بزرگوں سے نسبت یا عقیدت رکھنے والے ہوتے تو حضرت اور بھی زیادہ تعظیم سے پیش آتے ✧

ایک مناظرہ کے جلسہ میں ریاست رامپور میں حضرت مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ اور بڑے بڑے علما بلائے گئے۔ حضرت کی خدمت میں بھی تار آیا۔ کچھ عذر فرما دیا لوگوں نے عرض کیا حضرت دوسرا تار آویگا۔ فرمایا کہ پھر آویگا تو لکھوا دیں گے کہ "آنے کیلئے تیار نہیں" وہ خود سمجھ لیں گے کہ ایسے مولوی کو کیا بلائیں جو مناظرہ کیلئے کتابیں دیکھنے کا محتاج ہے اور اگر یہ سمجھ لیا کہ حاضری کے قابل کپڑے موجود نہیں تو اور بھی خوب ہے ✧

مولانا اشرفعلی صاحب کے اصرار سے ایک مرتبہ مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں وعظ شروع فرمایا۔ حضرت مولانا ایک بڑا اعالی مضمون بیان فرما رہے تھے جسمیں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ مولانا لطف اللہ صاحب علیگڈھی رحمہ اللہ اثنائے وعظ میں آکر شریکِ جلسہ ہوئے۔ حضرت کی اُنپر نظر پڑی تو فوراً درمیان میں سے وعظ قطع فرماکر بیٹھ گئے اور آپکے بے تکلف ہم سبق مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے جب کہا کہ مولانا یہ کیا کیا یہی تو وقت تھا تو فرمایا کہ ہاں یہی خیال مجکو آیا تھا اسی لئے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہارِ علم کیلئے ہوگا نہ خالصًا لوجہ اللہ ✧

مہمانوں کی خدمت خود فرماتے۔ کبھی کھانا زنانہ مکان سے لاکر مہمانوں کے سامنے رکھتے۔ عشا کے بعد

[۱] عبادت اسقدر خفیف چاہیئے جیسے اونٹنی کے دودھ نکالنے میں تھن کو دو مرتبہ کھینچنے کے درمیان میں وقفہ ہوتا ہے ✧ ۱۲

کھڑے ہیں اور سب کی ضروریات کو دریافت فرما رہے ہیں۔ خادم اور مہمان شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں اور حضرت مکان میں سے بستر اور لحاف اُٹھا کر لا رہے ہیں۔ سالانہ جلسے کے بعد حضرت بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ مجمع بھی بے تعداد رہتا تھا۔ پھر بھی ہر شخص سے اُس کی راحت و آرام و قیام کا حال کچھ نہ کچھ دریافت فرما لیتے تھے۔ رخصت ہونے والوں کیلئے ریل کے وقت سے پہلے بہت اہتمام و تاکید سے کھانا تیار کراتے تھے۔ ناواقف مہمانوں کی بے تمیزی پر صبر فرماتے تھے۔ بے وقت تکلیف دہی کی کبھی شکایت یا اُسپر سرزنش نہ فرماتے تھے ÷

ظاہر داری اور کسر نفسی سے نہیں بلکہ واقعی طور سے حضرت اپنے آپ کو نہایت حقیر اور ادنیٰ مسلمان سمجھتے تھے اور شانِ عبدیت کے غلبہ سے اپنے تمام کمالات ہیچ نظر آتے تھے۔ ژولیدہ حال پھٹے پرانے بوسیدہ لباس والوں سے بھی ایسی بشاشت سے ملتے تھے کہ اُن کے دِل باغ باغ ہو جاتے تھے۔ خدام و متوسلین میں غایت شفقت اور حسن سلوک سے ہر شخص یہی خیال کرتا تھا کہ مجھپر زیادہ شفقت ہے۔ کافروں اور بد دینوں سے طبعی نفرت تھی اور اہل ایمان و دیندار دں سے نہایت اُنس اور مناسبت۔ صاحبزادہ حضرت مولانا مسعود احمد صاحب گنگوہی کو ایک مرتبہ بہت مکلف بیل گاڑی میں دیوبند سے رخصت کیا بہلبان ہندو تھا اُسکے کھانے کا فکر ہوا لوگوں نے عرض کیا نقد دیدیا ہے۔ فرمانے لگے خیر۔ بھائی اگر ٹوٹی سے ٹوٹی گاڑی ہو اور بہلبان مسلمان ہو مجھے تو وہ پسند ہے ÷

دارالاشاعت لاہور کے منتظم اور بہت سی کتابوں کے مؤلف و مترجم مولوی سید ممتاز علی صاحب دیوبندی کے والد صاحب حضرت مولانا کے والد ماجد کے ہمنام تھے اور ان دونوں ذوالفقارین میں نہایت قدیم شائستہ ملاقات تھی۔ مولوی ممتاز علی صاحب بھی جب کبھی وطن آتے تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی رہتے۔ اور اگرچہ عقائد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پھر بھی حضرت مذکورہ روابط اور اُنکی علم دوستی کیوجہ سے اُنکی طرف توجہ فرماتے۔ ایک مرتبہ مولوی صاحب آئے اور دو شخص کوٹ پتلون پہنے ہوئے ترکی ٹوپیاں سر پر دئے ہوئے اُن کے ہمراہ آئے۔ حضرت نے بالکل رُخ نہ کیا وہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ خود فرماتے تھے کہ "میں نے سمجھا کوئی نیچری ہوں گے لیکن جب مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت یہ ترک ہیں اتفاقیہ ہندوستان آئے ہیں تو حضرت فوراً کھڑے ہو گئے اور خود اُن کے لئے مونڈھے لاکر تعظیم سے بٹھلایا ÷

جو دریدہ دہن لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت کو نیچریوں سے مناسبت ہو گئی تھی وہ آنکھیں کھولکر اس واقعہ کو دیکھیں

حضرت کو نیچریوں سے اُنس نہ تھا البتہ اگر اس لباس میں کوئی خوش عقیدہ صالح الاعمال ایمانی جوش اور اسلام کا درد رکھنے والا اُن کو ملجاتا تھا تو وہ اسکو گدڑیوں کا لعل سمجھکر قدر کرتے تھے اور اُس سے اسلامی خدمت اور عمدہ نتائج کے متوقع رہتے تھے احقر کی کتاب کا اختصار اجازت نہیں دیتا ورنہ معلوم نہیں کسقدر مثالیں اور اس قسم کے کتنے واقعات آپکی نظر سے گذرے ✤

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح سے مشابہت ومناسبت

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم وکمالات واسطہ در واسطہ دنیا میں تقسیم ہورہی ہیں۔ خلفاء راشدین مختلف خصوصیتوں کے ساتھ آپکے کمالات کا مظہر تھے۔ اور پھر یہی کمالات اولیاء اُمت کو بالواسطہ نصیب ہوئے اور ایک دوسرے کے کمالات کا (جو حقیقت میں کمالاتِ محمدی ہی تھے) مظہر بنتا رہا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے علوم وکمالات مختلف فیض یافتہ اور خوشہ چینوں کو نصیب ہوئے۔ مگر مظہرِ تام اپنے اُستاد کے کمالات کے حضرت مولانا شیخ الہند ہی تھے۔ اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کا وصف خصوصی جسمیں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں خاکساری اور نیازمندی تھا۔ یہی وصف حضرت مولانا میں ایسا نمایاں اور جلوہ گر تھا کہ نہ دلیل کی ضرورت نہ بیان کی حاجت۔ وہ اپنے آپکو بالکل ایک ادنیٰ اور معمولی انسان سمجھتے تھے۔ علوم وکمالات نے اُنکے ذہن میں اپنے لئے نہ کوئی تشخص پیدا کیا تھا نہ امتیاز۔ ایک واقعہ میں حضرت کا حد سے زیادہ تواضع و انکسار دوستوں کو ناگوار گذرا تو رقت آمیز لہجہ سے فرمایا کہ "میاں دل تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی جوتیاں مارے تو اُف نہ کروں لیکن رائے اور مشورہ میں سب کا تابع ہوں" ✤

اعلیٰ درجہ کا ضبط وتحمل اور حالات ومقامات اور امورِ قلبیہ اور وارداتِ غیبیہ کو انتہائی درجہ میں مخفی رکھنا اور اپنی نوافل وعبادت کو بدرجۂ غایت پوشیدہ کرنا اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کی دائمی عادت تھی۔ یہی طرز حضرت مولانا کا تھا کہ دیکھنے والے کو محض زاہد خشک نظر آتے تھے اور اپنے ورد ووظائف کو بہ لطائف الحیل مخصوص خدام سے بھی حتی الوسع چھپاتے تھے۔ دینی ضروریات کے مقابلہ میں جیسے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ اپنی جان ومال اور راحت وآرام صحت ومرض کی کچھ پروا نکرتے تھے یہی حال حضرت مولانا کا تھا۔ روڑکی میں پنڈت دیانند کے تشریف لانے اور مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کرنیکا حال سُنکر اُستادِ مکرم جسطرح اہل روڑکی کے عرض ومعروض پر نہایت مرض وضعف اور ضیق النفس کے دوروں میں اسلام کی حمایت کرنے کیلئے روڑکی جاکر سینہ سپر ہوگئے تھے اور

پنڈت صاحب کے میرٹھ جانے پر انہیں امراض میں وہاں پہنچے تھے اسی طرح حضرت مولانا اپنے مرض وفات میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کو دینی ضرورت سمجھکر منتظمان وغیرہ کے اصرار پر صعوبتِ سفر برداشت کر کے علی گڈھ تشریف لیگئے اور منع کرنے والوں کی عرض معروض اور معاندین کے اعتراض کی کچھ پروا نہیں فرمائی +

فراست و ذہانت - علوِ ہمت - جفاکشی چستی و چالاکی جیسے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کو خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اُنہیں کے قریب قریب حضرت مولانا میں موجود تھی - آخری زمانہ کی حالت دیکھنے والوں کو شاید بعض اوصاف کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہو - لیکن پہلے حالات دیکھنے اور سننے والے اسمیں ہرگز شبہ نہیں کر سکتے - شکار کیلئے شہر سے تین چار بلکہ چھ سات میل کے فاصلہ پر نکل جاتے - جمعہ کا وقت قریب ہوتا تو ساتھیوں کو چھوڑ کر دوڑے جامع مسجد میں جمعہ پڑھکر واپس جاتے اور شکار میں مشغول ہو جاتے - اور یہ تو گویا نہایت ہی سہل معمول تھا کہ پنجشنبہ کے روز عصر کی نماز سے قبل پا پیادہ گنگوہ تشریف لیجاتے - شب کو کسی وقت پہنچتے دن کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت و زیارت کی مسرت حاصل فرماتے اور شام کو واپس ہوتے پچیس میل کی منزل طے فرما کر مکان پہنچتے اور شب کو آرام کرنیکا موقع ملے یا نہ ملے صبح کی نماز کے بعد مدرسہ میں درس دینے کے لئے موجود ہو جاتے +

تصنیف و تالیف تحشیہ و تصحیح کا شوق حضرت اُستاد کیطرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ایام طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا اور شعر شاعری کا مذاق اور نظم کا شوق بلا کسی باضابطہ شاگردی کے اپنے اُستاد مکرم کی مانند حضرت مولانا میں بھی قدرتی تھا - اُردو اشعار اور آپکی نظمیں رسالوں کی صورت میں طبع ہو گئی ہیں جنکے الفاظ میں قرآن و احادیث کے مضامین کیطرف لطیف اشارات ہوتے ہیں - اور فارسی اشعار ایک بیاض میں محفوظ ہیں - قدیم اساتذہ اور مستند شعرا کے صدہا اُردو و فارسی اشعار حضرت مولانا کو ازبر تھے - غالب کے اشعار بکثرت یاد تھے اور اُستاد ذوق کے اُن سے بھی زیادہ - اثنائے گفتگو میں کبھی برمحل پڑھ دیتے تھے اور تالیف و تصنیف میں نہایت باموقع استعمال فرماتے تھے - آپکے والد ماجد نے جب علم معانی کی کتاب تذکرۃ البلاغت اُردو میں تصنیف فرمائی تو قواعد علم معانی کی مثالیں شعرائے اُردو کے کلام سے تلاش کر کے دینا حضرت مولانا کا کام تھا +

بزرگوں اور دوستوں کی وفات پر اظہار درد کیلئے تھوڑے سے اشعار یا پورا مرثیہ لکھتے - مجمع میں سناتے تو رقت طاری ہو جاتی - خود ضبط فرماتے اور سامعین کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور دامن تر ہو جاتے - حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا غلام رسول صاحب مدرس دارالعلوم کی وفات کی خبر مالٹا کے زندان میں

پہنچی تو وہیں سے پُر درد مرثیے لکھکر ہندوستان بھیجے۔ اپنے رفیق حکیم سید نصرت حسین کی وفات پر قلبی غم والم کے ساتھ جو اشعار تحریر فرمائے ہیں وہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے احباب کی وفات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہی۔ حالانکہ زیادہ اشتغال نہ تھا لیکن تاریخ وفات ایسی موزوں فرماتے کہ مشتاق دنگ رہجاتے نمونہ کیلئے مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ خلک ہوئی بتصویر قاسم ۱۳۳۰ھ صفحہ دنیا سے لو اور آپکے رفیق اسیری مولوی نصرت حسین صاحب کی رہائی یافتہ از ہر دو قید در یلدم ۱۳۳۴ھ کافی ہیں +

غرض اپنے اُستاد قدس سرہٗ کے علوم و کمالات سے مناسبت تامہ ہونے کے علاوہ زوائد امور میں بھی حضرت مولانا کو نہایت ہی مشابہت حاصل تھی جبکی جزئیات کی مزید تفصیل باعث طولِ کلام ہے۔ بس آخری درجہ یہ ہی کہ مرضِ وفات میں بھی جس قسم کے جان نثار و مخلص طبیب اور بے مثل شاہانہ معالجات اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کو میسر ہوئے تھے بالکل اُسی درجہ کے بے ریا مخلص اطبا و ڈاکٹر اور انواع و اقسام کی بیش بہا دوائیں حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی +

سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ سے تعلق

حضرت مولانا حقیقی طور پر ایک تارک الدنیا راغب فی الآخرہ گوشہ نشین عالم تھے ظاہری رس تدریس اور تعلیم حدیث اور باطنی ہمت و توجہ اور تعلیم ذکر و فکر سے تمام عمر اصلاح خلق میں مصروف رہے۔ اسبابِ شہرت کو نہ کبھی اختیار کیا نہ پسند۔ اور امور سیاسیہ میں کبھی دخل دیا نہ بلا ضرورت اس درجہ کو اپنے منصبِ عالی کے شایاں سمجھا۔ آپکی اس یکسوئی کا اثر تھا کہ آپکے ہزارہا ہم خیال اور زیر اثر مریدوں، معتقدوں، شاگردوں کو بھی اس قسم کے اُمور سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ آپ کا جس کسی سے جسقدر بھی تعلق تھا تھوڑا ہو یا بہت۔ اور جس شخص سے بھی علاقہ تھا محبت کا ہو یا بغض کا وہ سب اسلام و شریعت کے تابع اور ثمراتِ ایمانی میں داخل تھا +

غیر مسلم حکومت اور غیر اسلامی سلطنت خواہ کتنی ہی انصاف پرور اور معدلت گستر ہو مسلمان کے لئے اُسکے ماتحت رہنا ایک انتہائی کلفت ہی اور دینی مصیبت - کتنے احکام شرعیہ ہیں جو بغیر مسلمان حاکم کے نافذ

سلہ یہ سب مرثیے اور اشعار احقر نے کلیاتِ شیخ الہند میں نقل کر دیے ہیں ۱۲ + اصغر حسین عفا عنہ +

سلہ مثلاً تحصیلِ عشر و خراج و اجراء حدود و قصاص و فسخ نکاح بخیار البلوغ و بعدم الکفارۃ وغیرہا ۱۲ + .

ہی نہیں ہوسکتے اور کتنی ضروریاتِ دینیہ اور قضایائے مُہمّہ ہیں جو بدون بااختیار قاضی کے فیصل ہی نہیں ہوسکتے۔ مگر بایں ہمہ حضرت مولانا رضینا بقضاء اللہ کہکر نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ ہندوستان میں بسر کرتے رہے۔ دل میں خواہ کتنی ہی کلفت وکراہت ہو مگر زمانہ شاہد ہے کہ کبھی تحریراً یا تقریراً کوئی اظہار واعلان اس قسم کا نہیں کیا جسکو حکومت بہ نظرِ اشتباہ دیکھ سکے۔ ایک زمانہ میں آپکی محدود وقلیل سالانہ آمدنی پر سرکاری حکام نے ٹیکس تشخیص کردیا۔ جب مطالبہ ہوتا تھا بلاچون وچرا ادا فرماتے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے نام سے ایک زمانہ میں بضرورتِ شرعی جو فتاویٰ عدم جواز غدر بالمعاہدین اور حرمتِ قتلِ معاہدین کے شائع ہوئے وہ حضرت مولانا کے تصدیق فرمودہ اور دستخط سے مزیّن تھے +

مگر اسی کے ساتھ حضرت اپنے پہلو میں ایسا قلبِ سلیم رکھتے تھے جسمیں اسلامی درد تھا۔ اور ایسی جان رکھتے تھے جو ایمان پر فدا تھی۔ اہلِ اسلام کے مصائب وتکالیف آپکو بے چین کردیتے تھے اور دشمنوں کی دست درازیوں کو وہ کبھی ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جناب سیّد العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اَلْمُؤْمِنُوْنَ کَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِنِ اشْتَکٰی عَیْنُہٗ اِشْتَکٰی کُلُّہٗ وَاِنِ اشْتَکٰی رَاْسُہٗ اِشْتَکٰی کُلُّہٗ[۱] اور اَلْمُؤْمِنُوْنَ یَدٌ عَلٰی مَنْ سِوَاھُمْ[۲] آپ کے پیشِ نظر تھے۔ مشہور جنگِ روم وروس میں ہزارہا کوس کے واقعات سُنکر آپ ہی نہیں آپکے مرشد قدس سرہٗ بھی بیقرار ہوگئے۔ وہ لوگ جو قال اللہ وقال الرسول کے سوا دوسرا شغل ہی نہ رکھتے تھے صبح کی نماز کے بعد اخبار کے منتظر بیٹھے ہیں۔ خادم تیزی سے ڈاکخانہ جاتا ہے۔ اخبار میں دشمنوں کی قوت اور مسلمانوں کے ضعف کا حال پڑھکر اور روس کے غلبہ کی خبر سُنکر نورانی چہروں کی مقدس ڈاڑھیں سیلِ اشک سے تر ہو رہی ہیں۔ خدا کا نام لیکر اُٹھے اور جو کچھ وسعت میں تھا کیا۔ دن کو بخاری شریف کے ختم ہو رہے ہیں حصن حصین کے اوراد پڑھے جاتے ہیں۔ علما وصلحا کا مجمع ہاتھ اُٹھائے ہوئے صدقِ دل سے دعائیں کررہا ہے۔ اندھیری رات میں بزرگانِ دین سجدوں میں پڑے ہیں۔ تاریک

[۱] تمام مسلمانوں کی مثال ایسی ہی جیسے ایک شخص کے اعضا جسمی اگر اسکی آنکھ میں درد ہوتا ہی تو تمام اعضا کو تکلیف پہنچتی ہی اسی طرح اگر سر میں درد ہوتا ہی تو سب اعضا بے چین ہوجاتے ہیں۔ شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کا مضمون اشعار میں اداکر کے فرمایا ہی ؎ بنی آدم اعضاء یکدیگراند + کہ در آفرینش ز یک جوہراند + چو عضوی بدرد آورد روزگار + دگر عضوہا را نماند قرار ۱۲

[۲] اہلِ ایمان کو اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہاتھ کی اُنگلیوں کیطرح مجتمع رہنا چاہیئے۔ حدیث طویل ہی اور سب اسی قسم کا مضمون ہی ۲

حجرے دعاؤں کے نور سے معمور ہیں یا دبی یادِ حق کی صدائیں عرشِ اعظم تک پہنچ رہی ہیں۔ وہ خاصانِ خدا جو اپنے لئے حرفِ سوال کو کفر کا مرادف سمجھے ہوئے تھے اسلام کے نام پر کھڑے ہو گئے اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیا۔ نقد و جنس قلیل و کثیر جو کچھ کسی نے دیا خوشی سے قبول کیا اور رفتہ رفتہ ہزارہا روپیہ مظلوم مسلمانوں کی اعانت کیلئے روانہ کیا ◆

۱۳۳۰ھ میں سلطنتِ عثمانیہ کو بلقان کی مہیب جنگ پیش آئی تو حضرت مولانا اور آپکے متبعین نے پھر اپنے اسلامی تعلق کا پوری طرح حق ادا کیا اور حسبِ سابق اپنی ہر قسم کی دعاؤں کے علاوہ آفت زدہ، جلاوطن، فاقہ کش ترکوں کی مالی اعانت کا بھی انتظام کیا۔ ہر قسم کی مناسب تحریکات کی۔ مجامع اور جلسے منعقد فرمائے اور خلافِ عادت خود حضرت مولانا نے تقریریں فرمائی۔ دارالعلوم میں ایک مجلس بنام ہلالِ احمر کھولدی گئی اور جناب مہتمم صاحب مدظلہم کی جانب سے ایک فتویٰ اور اشتہار لاکھوں کی تعداد میں طبع کراکر ہندوستان میں جابجا تقسیم کیا گیا اور چند روز کیلئے دارالعلوم میں کارِ تعلیم بند کر دیا گیا۔ مدرسین نے شہر بشہر جاکر عام جلسوں میں اسکی اہمیت کو بیان کیا اور حضرت کے تلامذہ یعنی دارالعلوم کے طلبہ نے ہندوستان کا دورہ کر کے ہر جگہ اس دینی تحریک کی اشاعت کی اور پھر پوری حمیت و ہمدردی کا ثبوت اسطرح دیا کہ اپنے امتحان سالانہ کے انعام کی تمام رقم اس چندہ میں دینے کے علاوہ زرِ نقد اور اپنی ضروری استعمالی اشیاء بھی چندے میں ڈالدی ◆

باوجودیکہ تحریک کرنے والے طلبہ و علما کی ہدایت کی بموجب اکثر مقامات کے مسلمانوں نے فراہم شدہ روپیہ قابلِ اطمینان ذرائع سے براہِ راست قسطنطنیہ کو بھیجدیا۔ تاہم بیرونی چندوں اور حضرت مولانا کے طلبہ و علما کے عطیوں کو ملا کر خاص دارالعلوم کے ذریعہ سے بمبئی نیشنل بنک کی معرفت پینسٹھ ہزار ۶۵۰۰۰ روپیہ روانہ کیا۔ اس قسم کے چندوں کی مشغولیت کی وجہ سے دارالعلوم کی آمدنی کا بہت سا نقصان بھی گوارا فرمایا لیکن خدا کی راہ میں سر کٹانے والے بھائیوں کی اعانت کے فرض کی ادائیگی میں قصور نہ آنے دیا ◆

گورنمنٹ کی کوئی غلطی ہو یا فروگذاشت اور عمداً ارتکاب کیا گیا ہو یا اتفاقیہ کوئی واقعہ پیش آگیا ہو جس معاملہ میں اہلِ اسلام کی توہین اور تکلیف کا شائبہ بھی ہوتا تھا۔ حضرت مولانا کو بمقتضائے قوتِ ایمانی اُس سے نہایت صدمہ پہونچتا تھا اور عُمال و حکام سے ایک ناگواری کی شان پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس قسم کے تمام امور میں حضرت مولانا نے قلبی احساس اور باطنی صدمات سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور ہمیشہ فان لم یستطع فبقلبہ کی رخصت پر عمل فرماتے رہے چنانچہ کانپور کی مسجد کا المناک اور رنج افزا واقعہ پیش آیا تو حضرت مولانا کو نہایت شدید احساس ہوا۔ اور اُن ایام میں مخصوص طور سے کئی روز تک زبان سے حسرت اور چہرہ سے ملال کا اظہار ہوتا رہا۔ اور باوجودیکہ بعض مشاہیرِ وقت نے مفید سمجھکر حسبِ استطاعت تحریر و تقریر وغیرہ سے کچھ عملی حصہ بھی لیا لیکن حضرت مولانا نے اس فرض کفایہ میں اُن حضرات کی ہمت کو کافی سمجھا۔ یا عدمِ استطاعت کی وجہ سے کسی عملی سعی کو بے سود۔ بہر حال خاموش رہے ◆

۱۳۳۲ھ میں یورپ کی تباہی و بربادی بخش جنگِ عظیم شروع ہوئی اور جرمنی و برطانیہ کی آویزش سے بڑھتے بڑھتے یہانتک

نوبت پہنچی کہ آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند کے جذبات و احساسات کے خلاف برطانیہ نے (ایک ایسی سلطنت کی مراعات و مودت کی وجہ سے جو گذشتہ زمانہ میں برطانیہ کا مدِ مقابل بلکہ ہیبت ناک دشمن شمار ہوتی تھی) ترکوں سے جنگ کو گوارا کر لیا جس سے مسلمانوں کی کلفت و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی اور چونکہ سلطنتِ برطانیہ ہی فریقِ مقابل تھی اسلئے قابلِ رحم ترکی سلطنت کی امداد و اعانت کے طریق بھی ہندوستان کیطرف سے مسدود ہو گئے۔ اور مسلمان اپنا زخمی جگر تھام کر رہ گئے +

اس پُر آشوب اور سخت صبر آزما زمانہ میں گورنمنٹ کے دل خوش کن وعدہائے حفاظتِ مقاماتِ مقدسہ اور حرمتِ اقتدارِ خلافت کے اعتماد پر اہلِ علم اور مقتدا حضرات نے اور اہلِ ہند کے مقتدر لیڈروں نے جس صبر و استقلال اور خاموشی سے کام لیا۔ اور عوام میں جس قسم کا سکون رہا وہ اُسوقت عدمِ استطاعت کے سہل الوصول عذر پر اگرچہ جائز تھا لیکن آئندہ زمانہ میں بنظرِ کراہت نہیں دیکھا جائیگا تو بنظرِ تعجب ضرور +

حضرت مولانا اُسوقت تک ہندوستان میں تشریف رکھتے تھے مگر بالکل خاموش۔ قلبی صدمات اور روحانی کلفتوں کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور گرانی اور ناگواری بڑھتی جاتی تھی لیکن سب برداشت کرتے رہتے تھے اور سیاسی امور میں قولاً و عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔ گویا پالٹکس کے لئے دوسروں کو اہل سمجھکر خود اسمیں دخل نہیں دیتے تھے کیونکہ (جیسا سابقاً معروض ہوا) ہی آپ کے تمام تعلقات حب و بغض تابع شریعت تھے۔ اور شرعاً بھی آپ سکوت کی گنجایش سمجھتے تھے۔ یہاں کی کلفتوں نے حرمین کی خاکبوسی کے شوق کو دوبالا کر دیا اور آپنے ارادۂ سفر فرما دیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اِن ایام میں قلبی ناگواری بہت بڑھ گئی تھی۔ اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ آپکی روانگی سے چھ ماہ قبل جب سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ دار العلوم میں رونق افروز ہوئے تو حضرت مولانا شریک جلسہ نہوئے اور اپنے مکان پر رہے +

ہندوستان چھوڑ کر حرمین شریفین میں پہنچے تو شریف صاحب کی بغاوت اور گورنمنٹ برطانیہ کی اعانت کو بچشمِ خود ملاحظہ فرمایا۔ وہاں سے مظلومانہ طور پر نظر بند اور اسیر ہو کر قاہرہ میں قیام کر کے مالٹا پہنچے تو معزز ترکی افسروں کو اسیر و نظر بند دیکھنا ہی صدمات کے دوبالا کرنے کے لئے کافی تھا۔ پھر اُنکی زبان سے سرکار برطانوی کا مخالفانہ طرزِ عمل سلطنت اسلامیہ کے ساتھ اور وہ باتیں جو ہندوستان کے دُور افتادوں کے کبھی خیال میں بھی نہیں آتی بلا واسطہ بالیقین معلوم فرمائی۔ یہ امور ایک صاف دل مومن کامل کے تکدرِ خاطر و نفرت کیلئے کچھ نا کافی نہ تھے کہ خود اپنی بلا قصور اسیری کی عین الیقین تکالیف نے اُس قلبی مضمون میں بیشمار اضافہ کر دیا۔ اور اب حضرت مولانا اُس مطیع و خائف شہری رعایا کے افراد میں نہ رہے جو مشتبہ و ناگوار سرکار امور کو بھی محرمات ابدیہ کا مساوی سمجھے +

نظر بندی سے رہا ہو کر حضرت مولانا ہندوستان پہنچے تو خلافِ اُمید ملک میں ایک زندگی کی حرکت اور

قوم میں بیداری کے آثار اور مسلمانوں میں اپنے بہت سے ہم خیال دیکھکر نہایت مسرور ہوئے اور احکام شرع کے ماتحت سیاسی جدوجہد کرنے پر مجبور۔ کیونکہ چشم دید حالات۔ مسلمانوں کی نسبت اہلِ یورپ کے ارادے اور خیالات۔ معتبر لوگوں سے سُنی ہوئی سرگذشتیں اور واقعات حضرت کے ذہن میں موجود تھے اور وہ یہ دیکھکر لہو کے گھونٹ پی رہے تھے کہ بقائے احترام اماکنِ مقدسہ کے وعدے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیئے گئے۔ سلطنتِ اسلامیہ کے اقتدار کو بحال و برقرار رکھنے کے مواعید نقش برآب ثابت ہوئے۔ صلح کانفرنس نے اپنے اختیار بھر ترکوں کو (نہیں بلکہ مسلمانوں کو) یورپ سے نکالنے کی تدبیر کرلی۔ جزیرۃ العرب میں سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے خلاف مشرکین کا اقتدار و عمل دخل ہوگیا۔ شام و عراق جیسے مسلمانوں کے مایۂ فخر و ناز مقامات غیر مسلموں کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اور انتہا یہ کہ خلیفۂ صاحب شوکت قادر علی مدافعۃ اعداء الدین کا قیام و بقا، جو ایک قدیم و منصوص ناقابل تغیر و تبدیل مذہبی مسئلہ ہے۔ مخالفوں کی عمداً و قصداً تدابیر سے خطرہ میں آگیا اور انہیں مصائب کے ضمن میں اور بہت سے ناقابل برداشت امور پیش آرہے ہیں ✣

اب حضرت مولانا کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور سکوت و صموت کی گنجایش نہ رہی۔ احکام شرع کی اطاعت، مولانا کی اسلامی حمیت، اور دینی غیرت نے بیٹھنے نہ دیا اور ارادہ کو مضبوط، ہمت کو قوی کر کے نہایت جرأت کیساتھ اعلان حق کیلئے کھڑے ہوگئے اور مخالف و معاوق طاقتوں سے نڈر ہوکر آپنے تحریراً و تقریراً بواسطہ اور بلا واسطہ تبلیغ حق شروع فرمادی۔ استفتا و خطوط کے جوابات میں تو تشریف آوری کے دن ہی سے کلمۃ الحق کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب آپنے اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے بلا توریہ و تقیہ اپنا مشہور معروف **ترکِ موالات کا اعلان** شائع فرماکر اونگھنے والونکو بیدار کر دیا اور جاگتے ہوؤں کو کھڑا کر دیا اور ایسے زمانہ میں کہ آپکے ہم خیال اور متبع و متوسل لوگ بھی اسکو قبل از وقت اور صعب العمل سمجھ رہے تھے بلا خوف لومۃ لائم مذہبی احکام کو واضح فرمادیا۔ اور متردد و متحیر مسلمانوں کے لئے ایک صاف راستہ اور شاہراہ کھولدی جسپر چلنے والوں کا ثواب ہمیشہ آپ کے نامۂ عمل میں تحریر ہوتا رہیگا۔ صدہا اہلِ علم جو اس مسئلہ میں متردد تھے اور حیران تھے کہ اپنے متبعین کو کونسی راہ بتلائیں وہ مطمئن ہوگئے اور بشرح صدر دوسروں کو ہدایت کرنے لگے۔ اور ہزارہا دیندار مسلمان جو دنیاوی مشاہیر کے اقوال پر مضبوطیٔ اعتماد کے ساتھ عمل نہیں کرسکتے تھے۔ وہ آپکے اعلان ہدایت کو ایک شرعی فتویٰ سمجھکر بامید ثواب قومی تحریک میں شریک ہوگئے ✣

آپنے ضعیفوں کے ضعف اور مجبوروں کے عذر کو ملحوظ رکھتے ہوئے قولاً و عملاً کبھی تشدد اور دلخراش طرز کو پسند نہیں فرمایا بلکہ اپنے آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وصیت یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا[1] پر عمل فرمایا - اور احسن المعلمین (روحی فداہ) کی روش پر اپنے متوسلین اور دوستوں کو اسی شاہراہ پر چلنے کے لئے بزرگانہ نصائح سے متاثر کیا اور طرز محبت سے مجبور - اور چونکہ آپکے کمال علمی اور معرفت و بصیرت کا سب کو بدرجۂ اتم اعتراف تھا - اسلئے باوجود ظاہری نامساعدت اسباب و حالات کے سب نے گوارا کیا جسکے خوشگوار نتائج دینی انشاء اللہ تعالیٰ سب متبعین کو ہمیشہ حضرت مولانا جیسے مربی روحانی کا ممنون احسان رکھیں گے ❖

حضرت مولانا کی ظاہری و باطنی توجہ نے اہل اسلام کے بااثر دیندار طبقے کو جوش کے ساتھ آمادہ کر دیا اور آپکے اعلان سے ترک موالات کی مذہبی تحریک کو ایک حیات تازہ حاصل ہو گئی - صدہا علما جو اپنی دینداری سے تعلیم و تعلم ہی کو بہترین اشتغال سمجھے ہوئے تھے وہ بھی ضرورت حاضرہ پر متنبہ ہو کر خلوص نیت سے مسئلہ خلافت میں تحریراً و تقریراً حصہ لینے لگے اور اہل اسلام میں گویا ایک حالت جدیدہ ہو گئی - سوائے شاذ افراد کے عام اہل اسلام کا اتحاد خیال اور قومی تحریک میں لوگوں کی بے تکلف شرکت جو آج مشاہدہ ہو رہی ہے - حضرت مولانا کے اعلان سے پہلے مفقود ہی نہیں تھی بلکہ دشوار معلوم ہوتی تھی ❖

ابھی یہ اعلان رفتہ رفتہ قلوب میں اثر کر رہا تھا کہ حضرت نے اپنی وفات سے پورے ایک ماہ پہلے ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو باوجود شدت مرض کے بنائے مسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں خود شرکت کر کے اپنا درس عبرت یعنی موثر خطبۂ صدارت پڑھوا کر سنوایا - جسمیں موجودہ تکالیف و مصائب کیطرف کچھ اشارہ کرنیکے ضمن میں بااثر آیات قرآنی پیش کرنیکے بعد اسلامی یونیورسٹی کا اظہار ضرورت لیڈران قوم کی تحسین، نوجوانان قوم یعنی طلبہ کی ہمت افزائی فرمانے کے بعد تعلیمی ترک موالات کی تائید فرمائی تھی - اور اسی خطبہ کے اخیر میں اپنی تیسری پُر درد تحریر کا اضافہ فرمایا جو چند روز قبل بعض طلبائے علیگڈھ کے جواب میں تحریر فرمائی تھی جسمیں اسلامی مصائب کو رقت انگیز طرز سے شمار کرنے کے بعد آیات و احادیث سے موالات کفار کی مذمت، ترک موالات کی ضرورت، بعض شبہات کے جواب بیان فرمانے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی تحسین کرتے ہوئے ایسی مصالحت و رواداری کے برتاؤ اور حسن سلوک کا ارشاد فرمایا جس سے احکام مذہبی پر برا اثر نہ پڑے اور شرک و کفر کی نوبت نہ آجائے ❖

[1] یعنی لوگوں کے لئے آسانی کرو دشواری میں مت ڈالو - لوگوں کو بشارت دو احکام دین سے نفرت نہ دلاؤ ۱۲ ❖

حضرت مولانا کی یہ تمام تحریرات اخبارات و اشتہارات اور رسائل وغیرہ کی مختلف صورتوں میں ہزارہا
تعداد میں شائع ہو کر اہلِ اسلام تک پہنچیں اور ان کا ایک خاص اثر ہوا جسکا نتیجہ آپ حالتِ موجودہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں ؛

آخر آپ نے اسی مبارک سعی اور جہاد بالقلم و اللسان میں اپنی پاک زندگی کو ختم کر دیا اور مرض الموت میں دہلی
کی جمعیۃ العلما کی صدارت کو قبول فرما کر اُسکے اہتمام و تعلق کی وجہ سے اشتدادِ مرض کی حالت میں بھی وطن آنا
گوارا نہ کیا اور وفات سے صرف آٹھ روز پہلے قومی عروج کے سنگِ بنیاد یعنی علمارِ ہند کے اس بے مثل و عظیم الشان
اجتماع کو دیکھکر آنکھیں ٹھنڈی فرمائی جو انشاء اللہ تعالیٰ موجودہ مسلمانوں اور اُن کی آیندہ نسلوں کو عظیم الشان
فوائد بخشنے کے ساتھ ہی حضرت قدس سرہٗ کے لئے باقیات صالحات اور بہترین یادگار رہیگا ؛

جمعیۃ العلما کی اہمیت اور اپنے قلبی اور قوی تعلق کے تقاضا سے حضرت بار بار جلسہ گاہ تک جاکر شریک
ہونے کا قصد فرماتے رہے لیکن مرض کی تکالیف اور اطبا کی ممانعت سے مجبور ہو گئے۔ اور تیسرے دن جمعیۃ کے
آخری اجلاس میں آپ کی ایک مختصر مگر نہایت پُر مغز ما قلّ و دلّ سب سے آخری تقریر پڑھی گئی جسکے چند
ضروری جُملے نقل کر کے آخری حیات میں حضرت مولانا کے تعلق بالسّیٰسیات کو واضح کرکے ہم اس بحث کا خاتمہ کرتے ہیں

" مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جسمِ قوم کی روح (جماعتِ علما) نے بعض اُن شعب سیاسیہ میں "
" پھر اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہی جنمیں وہ بالکل مُردہ سمجھے جا چکے تھے۔ اور جنمیں اگر وہ مردہ ثابت ہوتے "
" تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ بخیدہ نہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم و تدین "
" اگر اب بھی عالمِ اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرتِ ایمانی "
" اور شرافتِ انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کئے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔ "
" اب ہم سب کو ملکر متوکلاً علی اللہ اُن تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہیئے جن سے ہمارا ایمان، ہمارے کعبے "
" ہماری خلافت، ہماری عزت و آبرو اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہی۔ اگر اس وقت بھی "
" ہمنے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنیکا یہ آخری موقع ہو گا جسکو ہم جان بوجھکر "
" اپنے ہاتھوں سے کھوئیں گے " ؛

تصنیفات و تالیفات تحریرات و فتاویٰ

حضرت مولانا کی تصنیف و تالیف کی تعریف کرنا "مادحِ خورشید مدّاحِ خود است" کا مصداق بنتا ہے اور اُن کی نسبت کوئی تبصرہ کرنا یا مفصّل بیان لکھنا معمولی اہلِ علم کی وسعت سے خارج۔ لہٰذا معمولی مختصر حالات سوانح اسبابِ تالیف لکھنے کے ساتھ صرف نام شمار کرا دینے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ حضرت کی تصنیف جس مبحث پر دیکھئے گا معلوم ہوگا کہ دریائے علم و تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ اور جنابِ مؤلف بالکل شرحِ صدر کے ساتھ انتہائی درجۂ تحقیق پر پہنچے ہوئے دوسروں کے سمجھانے کی سعی فرما رہے ہیں +

مولانا کو اپنے اکابر کے ساتھ معمولی عقیدت نہ تھی بلکہ اُن کی محبّت و عظمت بدرجۂ کمال دلیں جاگزین تھی۔ جب اُن کی نسبت کوئی خلافِ ادب کلمہ سُنتے یا اُن پر کسی کا اعتراض دیکھتے یا تعریض سمجھتے تو تابِ خموشی نہ لاکر لب جنبانی پر مجبور ہوتے۔ آپکی تمام تصنیفات اسی داعیۂ انتصار للمظلوم اور ذبّ عن السّلف سے لکھی گئی ہیں۔ اور ابتدائے شوقِ تالیف کی محرّک بھی یہی نیّتِ حسنہ ہوئی ہے +

ادلّۂ کاملہ۔ جسکا دوسرا نام اظہار الحق بھی ہے۔ دو جز کا ایک مختصر رسالہ اور سب سے پہلی تصنیف ہے اور حضرت کی نوجوانی کی تیزی اور شوخی اسکی عبارت میں نمایاں ہے۔ دیباچہ میں زیادہ اور اصل مضمون میں کچھ کم لیکن برخلاف عام مصنفین کہ اُن کی ابتدائی تصانیف میں وہ بات نہیں ہوتی جو آخری تصانیف میں ہے حضرت مولانا کی یہ پہلی کتاب بھی آیندہ تصانیف کی طرح مکمل ہے بلکہ اُن سے بھی زیادہ پُرمضامین اور دقیق و مدلل۔ اہلِ علم ہی کچھ داد دیسکتے ہیں کہ کس طرح بڑے بڑے مضامین کو مختصر عبارات میں ادا فرمایا ہے اور اسی لئے عوام تو عوام معمولی اہلِ علم کے فہم سے بھی باہر ہوگئی ہے +

اس تالیف کی تحریک اس طرح ہوئی کہ (تقریبًا اٹھتالیس سال ہوئے) اہلِ حدیث کے مشہور عالم مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے مذہبِ حنفیہ پر اعتراض کرنیکے لئے ایک اشتہار شائع کیا اور گویا تمام حنفیانِ ہندوستان کو اعلانِ جنگ دیدیا کہ رفعِ یدین، قراءتِ فاتحہ، آمین بالجہر، نفاذِ قضاءِ قاضی وغیرہ دس مسئلوں کو اگر کوئی عالمِ حنفیہ کے طرز پر آیتِ قرآنی یا صحیح حدیث سے ثابت کردے تو فی مسئلہ دس روپیہ نذر کریں۔ یہ اشتہار دیوبند بھی پہنچا۔ یہ سخت حملہ عمومًا تمام حنفیوں کو شاق گذر رہا تھا اور پنجاب کے کسی حنفی عالم نے اپنی وسعت کے موافق کچھ جواب لکھا بھی تھا۔ حضرت مولانا اور آپکے محترم اُستاد مولانا محمد قاسم صاحب کو یہ ناگوار طرز اور

یہ فعلی نہایت ہی ناپسند آئی ۔ اور اہلِ علم کی شان سے بعید نظر آئی ۔ اور اس صورت میں بالالتزام گویا صاحب مذہب امام الائمہ کی توہین محسوس ہوئی ۔ اور خیال فرمایا کہ اگر معقول جواب نہ دیا گیا تو تمام احناف کے لئے باعثِ خفت ہوگا اور معترضین کو عوام کی ابلہ فریبی کا موقع ملیگا ۔ حضرت مولانا نے اُستاد مکرم کی اجازت سے قلم اُٹھایا اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا جواب لکھا کہ قلم توڑ دیئے ۔ ہر اعتراض کا بطاہر واشارے ایک الزامی جواب ہی لیکن حقیقت میں اسی الزامی کے ضمن میں ہر جگہ ایک جواب تحقیقی بھی موجود ہی ۔ بلکہ بعض جگہ دو دو تحقیقی جواب ۔ اور اسی پر بس نہیں کی ۔ اخیر رسالہ میں معترض کے مسلک پر گیارہ اعتراض ایسے بر دست چسپاں کئے کہ مقابل کسی طرح سر نہ اُٹھا سکے ۔ یا تو اپنا مسلک چھوڑ کر خفت اُٹھائے یا اعتراضوں کے بارِ گراں میں دبا رہی ۔ حضرتِ اُستاد نے نہایت پسند فرما کر طبع کرانیکا ارشاد فرمایا اور آئندہ تالیف کیلئے ہمت بندھا دی ✣

ایضاح الادلہ ۔ ادلہ کاملہ شائع ہونیکے بعد حضرت مولانا منتظر تھے کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہی ۔ حق واضح دیکھکر مخالف خاموش ہو جاتے ہیں یا حق سے چشم پوشی کر کے دفع عار کے لئے جواب لکھتے ہیں ۔ مولوی محمد حسین صاحب کچھ عرصہ تک اپنی ماہوار رسالہ اشاعۃ السنۃ میں وعدہ فرماتے رہی کہ عنقریب جواب لکھیں گے لیکن کچھ دنوں کے بعد خاموش ہو رہی اور خلافِ اُمید اہلِ حدیث کے لقب دادہ احسن المناظرین مولوی سید محمد احسن صاحب امروہوی کے نام سے ادلہ کاملہ کے جواب میں ایک رسالہ (جسکا غیر موزوں نام اسکے مضامین کا نمونہ ہی) مصباح الادلہ لدفع الادلہ طبع ہو کر مشتہر ہوا ۔ حضرت مولانا نے جواب لکھنے میں توقف فرمایا کہ شاید خود مولوی محمد حسین صاحب بھی کوئی جواب لکھیں تو ایک ہی تالیف میں دونوں کا جواب دیا جائے لیکن جب مولوی صاحب موصوف نے اپنے رسالہ میں اعلان کر دیا کہ "ہمارا قصد جواب لکھنے کے لئے مصمم تھا لیکن سید محمد احسن صاحب کی کتاب لاجواب جواب دبا صواب ہی اب ہمارے لئے اسکا جواب لکھنا فضول ہی" تو حضرت مولانا نے اُستادِ مقدس کی اجازت سے جواب کیلئے قلم اُٹھایا ۔ اور اپنے نہایت مختصر اور دقیق رسالہ ادلہ کاملہ کی دلائل کو ایک شاندار بسط سے بیان کرتے ہوئے مجیب صاحب کے اعتراضات کا جواب اور اُن کی غلطیوں کی تشریح شروع کی اور ایضاح الادلہ اسم باسمی اور موزوں نام کہا تازہ تازہ علم کا وفور اور مقدس اُستاد کی خوشنودی کا نیک خیال اور احقاقِ حق کا جوش دشواریوں کو آسان کر رہا تھا ۔ محنت کو راحت بنا دیتا تھا ۔ مطالعہ اور درس و تدریس کی فراغت کے بعد اکثر رات کو جواب لکھتے اور دن کو جسوقت اُستاد علیہ الرحمۃ کو فرصت ہوتی اپنی تحقیق سُنا کر تحسین و آفرین اور مبارک دعاؤں کا انعام حاصل فرماتے

حضرت کے شوقِ تحقیق اور باکمال اُستاد کی تاکید وتحسین نے تھوڑے ہی دنوں میں قراءتِ فاتحہ کی دشوار گذار منزل کو بھی طے کرا دیا۔ اور حضرت مولانا نے پچیس سال کی عمر میں اپنے آپکو ابجد خواں ناواقف کہتے ہوئے احادیث وآیات کے متعلق وہ عجیب وغریب تحقیقات بیان فرمائی کہ پُرانے اور تجربہ کار عالم دنگ رہگئے یہ بحث اچھی طرح ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اکابر علمائے ہندوستان اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سفرِ حج پیش آیا اور ایک عجیب وبے مثل اہلِ علم وعرفان کا مجمع ہندوستان سے حرمین کی خاکبوسی کو روانہ ہوا اور حضرت مولانا نے بھی شرکت اختیار فرمائی جسکو اپنے الفاظ میں یوں ادا فرماتے ہیں کہ "دیکھا بھائی بعض بعض ہم جیسوں نے بھی دفیعۂ نظرِ بد کیلئے ہمرکابیٔ اہل اللہ اور گرد افشانیٔ راہِ بیت اللہ اختیار کی اور بر کتِ اقدامِ اکابر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو کر وطن واپس آ گئے" +

واپسی کے بعد مخدوم اُستاد کی علالت اور درس وتدریس کے علاوہ شب وروز کی حاضری وخدمت نے تکمیل وتحریر کی فرصت نہ دی اور ان ایام میں (غالبًا) ایک یا آدھی بحث لکھکر سُنانا نصیب ہوا تھا کہ دو برس تک مختلف عوارض کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد مخدوم ومطاع وسیلۂ دارین اُستاذ محترم نے وفات پائی۔ اس نمونۂ فزع اکبر میں حضرت مولانا کی حیرانی وپریشانی نے مشاغلِ علمیہ کو بالکل چھڑا دیا۔ خود فرماتے ہیں کہ "درس تدریس کے نام سے نفرت اور کتاب کے خیال سے وحشت ہوتی تھی"۔ (جیساکہ ابتدا میں معلوم ہو چکا ہی) ایک ماہ کے بعد حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کی توجہ اور دلدہی سے حضرت مولانا نے تعلیم وتدریس کا کام جاری فرما دیا۔ لیکن یہ تصنیف ناتمام پڑی رہی۔ جسکی ناتمامی اور تکمیل کا حال دیباچہ میں بایں الفاظ تحریر فرماتے ہیں "اسی طرح جب ایک عرصہ گذر گیا تو مخدوم زادۂ عالم مُطاع ومکرم جناب مولوی حافظ احمد صاحب زادہ اللہ علماً علی علمٍ وفضلاً علی فضلٍ خلف الصدق حضرت مولانا معتمدی ومستندی ووسیلۃ یومی وغدی رحمۃ اللہ علیہ وعلی اتباعہ نے تحریر مذکور کی تکمیل کیلئے فرمایا۔ ہرچند بوجہ تن آسانی وپریشانی احقر نے انکار کیا مگر اُن کا اصرار احقر کے انکار سے بڑھا رہا۔ اسلئے ناچار اوراق مسطورہ نکالکر بنامِ تعدا اُن کو پورا کیا۔ اور جملہ صفحاتِ باقیہ کا جواب لکھکر لتعمیلاً للحکم مولوی صاحب کے حوالہ کیا" +

حضرت مولانا نے اس کتاب میں شرحِ معانیٔ حدیث اور تطبیق بین الروایات اور توفیقِ اقوال المجتہدین بالمحدیث میں اپنے خداداد تفقہ فی الدین کا نمونہ دکھلایا ہے اور مختلف ابحاث کے ضمن میں ایسے ایسے مضامین عالیہ بیان فرمائے ہیں کہ اذہانِ متوسطہ کو اُن کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اور آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ

علیہ وسلم بلکہ اقوالِ فقہاء ومجتہدین کی بھی اس خوبی سے شرح فرمائی ہی کہ بیساختہ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْن
زبان سے نکل جاتا ہی۔ اور قراءتِ فاتحہ اور نفاذ قضاء قاضی اور نکاح محرمات اور زیادۃ ونقصان ایمان کی
ابحاث میں بے مثل تحقیقات کو دیکھکر الہام من عند اللہ کا الیقین ہوجاتا ہے۔ اور پھر اسی کے ساتھ اُردو عبارت
نہایت سلیس۔ تعریضات واشارات بے شمار اور باموقع اُردو فارسی کے پُر مغز وذائقہ دار اشعار۔ اس
بے مثل خزینۂ علوم محدثین کو چارسو صفحات پر ختم کرکے ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا نے فراغت پائی۔ اور اسی و قت
طبع ہوکر مقبولِ خاطر اہلِ علم ہوا۔ حضرت مولانا کے علوم وکمالات کے لئے اگر بالفرض دنیا میں کوئی بھی ثبوت
اور کوئی بھی یادگار نہ ہوتی تو یہی کتاب کافی تھی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین ✤

احسن القِریٰ فی توضیح اوثق العریٰ۔ ایضاح الادلہ سے چودہ سال کے بعد حضرت نے اس کتاب
کے لئے قلم اُٹھایا اور باعث وسبب تالیف اسکا بھی وہی رفع العار عن الاکابر اور جوشِ تحقیقِ حق ہوا یعنی کسی
شخص کے استفتا پر دہلی کے اہلِ حدیث نے یہ جواب دیا کہ جمعہ میں کسی مکان کی تخصیص نہیں جب دو شخص کسی جگہ
ملکر جمعہ پڑھ لیں گے جمعہ ہوجاویگا۔ اور انہیں سے کسی دستخط کرنے والے نے اس مسئلہ میں مذہب حنفیہ کو ہوس
من ہوسات الشیطان لکھکر اپنی عاقبت سنواری۔ یہ فتوی جب گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب (قدس سرہٗ)
کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت ممدوح نے اس جواب کو خلافِ حق وتحقیق خیال فرماکر موافق مذہبِ حنفیہ جواب
لکھوایا اور روایاتِ صحیحہ سے اپنے مدعا کو محقق فرمایا اور یہ ثابت کردیا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
حیات میں دیہات وقریٰ میں جمعہ کا کہیں وجود نہ تھا ✤

یہ رسالہ بنام اوثق العریٰ بصورتِ رسالہ مطبوع ہوکر شائع ہوا تو مولوی محمد سعید صاحب بنارسی نے
مستقل جواب لکھا اور مولوی محمد علی صاحب اعظم گڈھی نے مولانا ظہیر احسن صاحب کے رسالہ جمعہ کے جواب کے آخر میں
اوثق العریٰ پر اعتراضات کئے۔ چونکہ ان دونوں رسالوں میں مذہبِ حنفیہ کی نسبت سخت الفاظ استعمال
کئے گئے تھے اور حضرت مولانا گنگوہی مؤلف رسالہ قدس سرہٗ کی طرف خلاف واقع امور منسوب کیے گئے تھے اسلئے
حضرت مولانا کے جوشِ ایمانی نے حمایتِ حق پر قلم اُٹھانے کے لئے مجبور کیا۔ اور مولوی محمد سعید صاحب کے رسالہ کے
جواب کو مقصود بالذات رکھکر اُسی کے ذیل میں اعظم گڈھی صاحب کی نکتہ چینیوں کا بھی جواب دیا۔ خود ارشاد

سلہ پھر سنہ ۱۳۳۰ھ میں احقر نے تصحیح کا اہتمام کیا اور جابجا حضرت مولانا سے دریافت کرکے اغلاطِ کتابت کی اصلاح کی اور اکتیس
برس کے بعد دوبارہ نہایت عمدگی سے طبع ہوکر شائع ہوئی اور حضرت مولانا نہایت مسرور ہوئے ۱۲ فقیر اصغر حسین عفی عنہ

فرماتے ہیں کہ "تعجب ہے کہ ان ہر دو رسائل کو دیکھکر اس ہیچمدان کو بھی خود بخود شوقِ تحریر جواب دامنگیر ہوا اور بسم اللہ کہکر بلا تامل قلم ہاتھ میں لے بیٹھا۔ حالانکہ اہل علم وفہم کے نزدیک ان جوابوں سے انشاء اللہ تعالیٰ اوثق العریٰ میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوا اور نہ مجھ جیسے کی تائید کی کوئی حاجت۔ نہ کسی بڑے چھوٹے نے مجھکو اس کام کے لئے مجبور یا مامور کیا"۔

اس ضخیم کتاب کی عبارت مولانا کی تمام تصانیف سے زیادہ شگفتہ اور سلیس و رواں ہے اور مولانا کی مہذب ظرافت اور بذلہ سنجی بہ نسبت دیگر تصانیف کے اسمیں زیادہ نمایاں۔ اثباتِ مدعا کیلئے احادیث و اقوال محدثین کے علاوہ جابجا آیات واحادیث کی طرف لطیف اشارات اور موقع بموقع ادیبانِ عرب کے مشہور مقولے اور اہل عرب کی زبان زد مثالیں تحریر فرماتے جاتے ہیں۔ کبھی عارفِ شیرازی کے شعر سے بیان میں جان ڈال دیتے ہیں اور کبھی اُستاد فرزدق و غالب کے کلام سے لطف دوبالا کردیتے ہیں اور بسط وطول کی پروا نکر کے نہایت سلاست سے اظہار مقصود وافہام مطلوب میں انتہائی سعی فرماتے ہیں اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اختصار میں جو حقائق غامضہ اور معانی دقیقہ عقول متوسطہ سے مخفی رہگئے تھے۔ اُن کے اظہار میں کمال کرکے ناظر فہیم کو متحیر بناتے ہیں۔ کبھی وہ حضرت مؤلف کے فضل وکمال وسعت نظر اور قوت استدلال پر عش عش کرتا ہے اور کبھی حضرت مولانا کے ذہن رسا، کمال فہم اور حسن بیان پر سبحان اللہ کہتا ہے۔

مذکورہ بالا دو جوابوں کے بعد اوثق العریٰ کا ایک بہت مختصر جواب ایک غیر مشہور عامل بالحدیث مولوی مولابخش خانصاحب نے بھی لکھا تھا۔ جسمیں رسائل سابقہ سے کوئی بات زائد اور نئی نہ تھی۔ بعض لوگوں کے اصرار سے حضرت نے اسکا بھی مختصر جواب بنام التلمیع الیٰ مفاسد التجمیع تحریر فرماکر احسن القریٰ کے اخیر میں بطور ضمیمہ ملحق فرمادیا اور چونکہ خانصاحب نے جسارت اور بیباکی سے کام لیا تھا اور بزرگوں کی نسبت سخت الفاظ کا استعمال کیا تھا حضرت مولانا نے بھی علی سبیل الانتصار و مدافعۃ عن العشیرۃ تلمیحات و اشارات اور برمحل اشعار اور برجستہ فقرات سے اس طرح مہذب خبر لی کہ بیحیا کو گردن اُٹھانے کی جگہ نہ رہے۔

باایںہمہ عظمت وشان حضرت مولانا کی خاکساری اور خلوص وعقیدت اور قدرشناسی اکابر کا یہ حال تھا کہ زمانۂ تصنیف میں احسن القریٰ کے اجزاء گنگوہ لیجاتے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب (قدس سرہٗ) کو سناتے اور اصلاح کے منتظر رہتے۔ مولانا ممدوح کتاب کے مضامین سنکر نہایت محظوظ ہوتے اور قلبی فرحت کے ساتھ حضرت مولانا کی تحقیقات کی داد دیتے۔ یہ کتاب حضرت مولانا گنگوہی کی حیات ہی میں آپ کے مخصوص معزز خادم

مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام سے طبع اور شائع ہو گئی تھی ؛

جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل - یہ رسالہ مولانا کی تصانیف میں ایک مستقل شان رکھتا ہے۔ اول تو بحث ہی من حیث المعقول پھر روئے سخن ایسے حضرات کی طرف جو بخیال معتقدان خود ان علوم میں یکتائے روزگار۔ اسلئے موقع بہ موقع اپنے مضامین و استدلالات میں اسی علم کو استعمال فرمایا ہے اور انتہائے تحقیق سے نظریات کو مثل البدیہیات واضح اور مشاہد کرا کے دکھلا دیا ہے جس سے علوم نقلیہ میں مسلم الکل ہونیکے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ علوم عقلیہ میں مولانا کا کیا درجہ اور کسقدر زبردست پایہ ہے ؛

منشائے تحریر یا سبب تالیف اس رسالہ کا بھی وہی امر مشترک فی جمیع التالیفات ہے یعنی خلوص نیت وذب العارض للسلف وحمایت اہل اللہ۔ اور صورت اسکی یہ ہوئی کہ بعض مروجان بدعت اور مخالفان حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحریک و ترغیب سے مولانا احمد حسن صاحب پنجابی مدرس مدرسہ کانپور نے ابطال امکان کذب میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کر کے شائع کیا جسمیں مولانا شہید اور اُن کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقۂ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اسپر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابر دین کی نسبت ایسی ژاژ خائی کی اور ایسے کلمات سے یاد کیا کہ سُننے والا تاب نہ لاوے۔ حضرت مولانا کو طیش تو بہت آیا مگر بمقتضائے علم و تقویٰ یہ فرمایا کہ "ان گستاخ لوگوں کو بُرا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں لیا جا سکتا اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہکر اگر دل ٹھنڈا کیا جاوے تو وہ لوگ معذور و بے قصور ہیں" ؛

بہرحال حضرت مولانا نے طعن و تشنیع اور تفسیق و تضلیل کے جواب سے بفحوائے اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا اعراض فرما کر مولوی احمد حسن صاحب کو عالم اور مہذب اور بزرگوں کا صحبت یافتہ خیال کر کے بامید انصاف و رجوع الی الحق مخاطب بنا کر غایت تحقیق سے جواب تحریر فرمانا شروع کیا اور چند مقدمات کو عقلاً و نقلاً ثابت کرنیکے بعد بطور تمہید ایک نہایت پُرزور و بسیط تقریر تحریر فرمائی جسکے سُننے اور دیکھنے سے اہل علم کے دل منور ہوتے ہیں اور آنکھیں روشن۔ اور اسکے بعد مسئلہ مبحوث عنہا میں صاحب رسالہ کے جواب کے ضمن میں مسائل علم کلام کی تحقیقات عجیبہ اور علوم منطقیہ کی تدقیقات غریبہ فرمانے لگے۔ استدلال پر استدلال بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور عبارت پر عبارت نقل فرماتے ہیں۔ کتب متداولہ اور غیر متداولہ اور شروح اور حواشی کے ایسے غیر مانوس اور بعید مقامات کی عبارات نکالکر سامنے رکھدیتے ہیں جنکی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ باکمال مجیب کے سامنے تمام کتابوں کے صفحات کھُلے ہوئے پڑے ہیں۔ جن سے وہ بے تکلف اپنے

مفید مدعا اقوال نقل کر دیتے ہیں یا خزینۂ حافظہ میں تمام عبارات محفوظ اور قلب مصفی کے آئینہ میں تمام مضامین منعکس ہو رہی ہیں کہ نقل مستدل میں دیر ہی نہیں لگتی۔ اور اسی پر اکتفا نہیں عبارات کی شرح فرما کر صحیح مطلب اور واقعی مقصود سمجھاتے ہیں اور جن عبارات کو مؤلف تنزیہ الرحمٰن نے سرسری نظر میں اپنے لئے مفید سمجھکر پیش کیا تھا وہاں عبارات و اقوال کا حقیقی مدعا بالقرائن و دلائل و شواہد واضح فرما کر مؤلف صاحب کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی تائید اور اُن کی حقانیت کا اظہار فرماتے جاتے ہیں۔ اور جب کلامِ نفسی و لفظی کی مشہور و مزلۃ الاقدام بحث شروع ہوتی ہے تو حضرت مولانا ایک اعلیٰ ثبات و استقلال سے بفرحت و انشراح ایسی تحقیقات و تقریرات فرماتے ہیں کہ گویا لوحِ محفوظ سے دیکھ دیکھ کر فرما رہے ہیں۔ اس بے مثل رسالہ کی نسبت کچھ زیادہ لکھنا حدادب سے نکلنا ہے۔ دو حصوں میں تقریباً تین سو صفحہ پر طبع ہو کر مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام سے شائع ہوا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اسکی طبع و اشاعت میں اتنی تاخیر ہوئی کہ اصل مخاطب یعنی مولانا احمد حسن صاحب مقیم کانپور کی وفات ہوگئی اور غالباً قبل الطبع بھی اُن کی خدمت میں نہیں پہنچ سکا ✤

ترجمۃ القرآن المجید۔ بعض اہل علم کی استدعا اور بہت مصالح سے اور حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کی غایتِ آرزو دیکھکر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنیکا خیال ہوا لیکن بجائے ترجمہ کرنیکے آپنے مولانا شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی خدمتِ تصحیح و ترمیم اختیار کی اور خلافِ محاورہ الفاظ کی تبدیل و تغیر کا التزام فرمایا اور حاشیہ پر فوائد و نکات بھی بیان کرنے شروع کئے مختلف ترجمے اور معتمد تفسیریں حضرت کے سامنے کھلی رہتی اور خدام و تلامذہ اور فارغ التحصیل طلبہ خدمت میں بیٹھتے۔ اور اُن تراجم و تفاسیر کو دیکھتے رہتے۔ آپکے خادمِ خاص مولوی احمد اللہ صاحب خدمتِ کتابت کو ادا فرماتے اور ایک ایک لفظ بہت سی تحقیق اور غور کے بعد لکھا جاتا۔ ہندوستان میں چھ پارے سے زیادہ مکمل ہو گئے تھے باقی آپنے بحالت اسیری بمقام مالٹا بلا موجودگی کتب کے مخصوص توجہ اور پورے غور و فکر سے تمام کیا اور جیسا کہ سابقاً گذر چکا ہے ماہ شوال ۱۳۳۶ھ میں باعانت خداوندی یہ عظیم الشان کام آپکے دستِ حق پرست سے انجام کو پہنچا اور حضرت کو مسرتِ روحانی حاصل ہوئی ✤

اس ترجمہ کی ابتدا میں حضرت مولانا نے ایک بسیط مقدمہ مشتمل مضامین عالیہ تحریر فرمایا ہے جو خود ایک مستقل علمی رسالہ ہے جسمیں قدیم ترجمہ کے بیشقدر علمی نکات اور دقیق محاسن بہ تشریح و بیان امثلہ واضح فرمائے ہیں

جن سے حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی اور تفقہ فی الدین اور اُسکے ساتھ ترجمہ کا حسن ظاہر ہوتا ہی۔ اور خود جن امور کی رعایت فرمائی ہے اُن کو بھی بیان کیا ہی۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد حضرت مولانا اہلِ علم کے مجمع میں اسکو سُناکر خود بشاش ہوتے اور دوسروں کو محظوظ کرتے بڑے بڑے اہلِ علم و کمال اسکو سُنکر اپنے عجز و قصور کے معترف ہوتے اور وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کے قائل۔ ترجمہ اور مقدمہ ابتک حضرت کے وارثوں کے قبضہ میں محفوظ ہی اور افسوس ہی کہ بعض مشکلات کی وجہ سے اسکی طبع و اشاعت میں غیر معمولی اور نہایت مضر تاخیر ہو رہی ہے جو منتظرین کیلئے باعثِ محرومی و مایوسی ہی ؂

الابواب و التراجم ۔ حضرت مولانا کو علوم حدیث میں کمال حاصل ہونے کے ساتھ ہی اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری سے ایک مخصوص مناسبت تھی اور حضرت مولانا اس مخزنِ علوم حدیث کے غوامض و دقائق، اسرار و حقائق سے باحسن الوجوہ واقف اور ماہر تھے اور اسکے درس و تدریس میں آپکو ایک خاص حظ حاصل ہوتا تھا اور مناسبۃ التراجم بالابواب میں شروح و حواشی کے علاوہ اپنی نفیس و گرانمایہ تحقیقات بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ نظر بندی مالٹا میں ترقی درجات و رفعت مقامات کے ساتھ وحی الٰہی کا ترجمہ ختم کرتے ہوئے علوم قرآن پر مزید غور کرنے سے مناسبت بالاحادیث کو اضعاف مضاعف ترقی ہوئی اور علوم بخاری گویا منکشف ہوکر ایک داعیہ رغیبی بخاری شریف کے متعلق کسی تحریر کا محرک ہوا اور حضرت نے تراجم بخاری کے متعلق متفرق اوقات میں بطرز یادداشت کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ کیا اور ایسے زمانہ میں کہ آپ کے پاس بخاری شریف کا صرف ایک مصری نسخہ بلا حاشیہ و بین السطور موجود تھا حسب معمول سلیس اردو میں اپنی تحقیق اور بہترین مناسبت بالابواب تحریر فرمانی شروع کی۔ اور جسقدر تحریر فرمانا مد نظر تھا ابھی اُسقدر لکھنے کی نوبت نہ آئی تھی بلکہ ابتدائی ۶۷ ابواب کے متعلق لکھا گیا تھا کہ قید فرنگ سے رہائی ہوئی اور ہندوستان پہنچکر کچھ ایام کثرت زائرین و مہمانان میں اور کچھ ضروری سفر میں اور باقی تکالیف و مرض میں گذر کر صرف پانچ ہی ماہ کے بعد وفات ہوجانے سے یہ عظیم الفوائد تحریر ناتمام رہگئی۔ حضرت کی یہ آخری تصنیف اسی ناتمام حالت میں مولانا حسین احمد صاحب کی حسن سعی سے بصورت رسالہ مرتب ہوئی اور مولانا عزیر گل صاحب کے اہتمام سے طبع ہوکر شائع ہوگئی اسکی ابتدا میں حضرت مولانا کے حالات اور صورتِ تالیفِ کتاب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کا نہایت مختصر مگر شاندار دیباچہ ہے۔ اور پھر تراجم بخاری کے متعلق حضرت مولانا کے تحریر فرمودہ پندرہ اصول اور پھر اصلی مقصود یعنی کتاب الایمان کے ابواب و تراجم کے متعلق تحریر ہے اور پھر ابواب و تراجم کے اصول ہیں

حضرت مولانا کی ایک عربی تحریر درج ہے اور سب سے آخر میں ابواب بخاری کی ایک جدید و مفید نہایت کارآمد فہرست حضرت ہی کی مرتب فرمودہ ہی۔ غرض یہ تالیف حضرت کی بہترین آخری یادگار ہے اور مشتغلین فنِ حدیث کے لئے ایک کامل اُستاد اور معین و مددگار +

اِن عظیم النفع علمی تصنیفات خمسہ معتبرہ کے علاوہ صحاح اربعہ (بخاری مسلم ترمذی ابو داؤد) خصوصاً ترمذی و بخاری کے متعلق حضرت مولانا کی اثنائے درس میں فرمائی ہوئی تقریریں جو صدہا طلبہ نے ضبط کی ہیں اور نقل در نقل ہوکر اُن کے ہزار ہا قلمی نسخے ہوگئے ہیں جنمیں مضامین علمیہ تحقیقات احادیث اور تفصیل مذاہب اور ترجیح مذہب ابی حنیفہ بطرز محققانہ بکمال شرح و بسط مذکور ہیں۔ بطرز بزرگان سلف علیٰ مولانا کی افضل التصانیف میں شمار ہونیکی قابل ہیں جو انشاءاللہ تعالیٰ مطبوعہ تصانیف سے بھی زیادہ حضرت مولانا کے لئے باعثِ اجر و صدقۂ جاریہ رہینگی +

تصحیح ابی داؤد بھی حضرت قدس سرہٗ کی ایک قابلِ قدر خدمتِ حدیث اور کامل اہتمام اور نہایت عرقریزی کا ثمرہ ہے۔ ابوداؤد کے قلمی و مطبوعہ قدیم جدید نسخوں کو جمع فرماکر آپنے اُن کے مطالعہ اور مقابلہ سے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمانے کا ارادہ کیا۔ درس تدریس سے فراغت پانے کے بعد آپ منتخب فارغ التحصیل طلبہ کی جماعت کو لیکر اور تمام نسخے سامنے رکھکر تصحیح پر متوجہ ہوتے۔ ہر لفظ و اعراب کو صحیح فرماتے تعلقات عبارت کی رموز ثبت فرماتے اور دوسرے نسخوں کی عباراتِ زوائد جو قلمِ ناسخین سے متن میں شامل ہوگئی تھی اُنکو بہ حُسنِ ترتیب حاشیہ پر درج کراتے اور جو عبارات و الفاظ غلطی سے چھوٹ گئے تھے اُن کو اضافہ فرماتے اور دیگر کتب حدیث و شروح سے بھی مدد لیکر صحت میں کوشش فرماتے۔ طویل مدّت اور کمالِ محنت سے ایک نسخہ بغایت صحت مرتب ہوا جو ۱۳۱۸ھ میں مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوگیا ہی۔ یہ مخفی نرہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے صرف متن کی صحت کی ہی۔ اہلِ مطبع نے حاشیہ اور بین السطور کو ایک مولوی صاحب سے سرسری اور معمولی نظر سے صحت کرا کے قدیم مطبوعہ نسخوں سے نقل کر لیا ہے۔ پس اس قسم کی غلطیاں حضرت مولانا کی تصحیحِ متن میں قادح و مخل نہیں ہوسکتی +

۱۳۲۸ھ میں جب حضرت مولانا اور دیگر مقدس بزرگانِ ہمعصر کی سرپرستی میں دارالعلوم دیوبند سے رسالہ القاسم شائع ہوا تو حضرت مہتمم صاحبان مدظلہم کی فرمایش اور نیازمند احقر کی استدعا اور مکرر معروض

لہ اساتذہ کچھ فرماتے جاتے اور شاگرد قلمبند کرتے رہتے اس طریقہ املا پر جمع شدہ تصنیف کو امالی کہتے تھے +

بلکہ تقاضہ پر حضرت نے ایک محققانہ بے مثل مضمون بعنوان "عظمت وحی" تحریر فرمایا جو القاسم کی متعدد اشاعتوں میں طبع ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ علمی کساد بازاری اور مسلمانوں کی ناقدر دانی سے یہ نادر مضمون ایک مرتبہ القاسم میں چھپکر نظروں سے چھپ گیا دوبارہ بصورت کتاب طبع ہونے کی نوبت نہ آئی۔

اِن تحریرات کے علاوہ حضرت مولانا کی بعض اُردو نظمیں بھی سالوں کی صورت میں شائع ہوگئی ہیں اور بعض تاریخات وفات اور مرثیے وغیرہ متفرق طور سے طبع ہوئے ہیں۔[1]

فتاویٰ حضرت مولانا کے بقید کتابت ضبط و مرتب نہیں ہوسکے۔ کیونکہ غایت تواضع کی وجہ سے اپنے آپکو اسکا اہل نہیں سمجھتے تھے اور دیگر مشاغل میں فرصت بھی نہیں ہوتی تھی۔ دار العلوم میں باضابطہ دار الافتاء کے قیام سے پہلے جسقدر سوالات دار الاستفتا دار العلوم میں اور خاص حضرت کے نام آتے تھے وہ سب فارغ التحصیل اور ذی استعداد طلبہ لکھتے تھے اور دار الافتا قائم ہوجانے کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں آئے ہوئے تمام استفتاؤں کے جواب بھی حضرت مفتی صاحب مدظلہم تحریر فرماتے تھے۔ اسلئے خود تحریر فرمانے کی نوبت نہ آتی۔ اور اگر کبھی ضرورتاً لکھتے بھی تو فتوے کو صورتِ مراسلت وخط کتابت کے طرز میں بدل دیتے علیٰ ہذا القیاس جو خطوط صورتِ استفتا میں نہوتے بلکہ شناسا و خدام لوگ ضمن معروضات میں مسائل بھی دریافت کرلیتے۔ اُن کے جواب خود تحریر فرماتے۔ اور بعض مدرسین اور فارغ التحصیل حضرات مشکل مسائل آپ سے زبانی دریافت کرکے فتاویٰ تحریر کرتے۔ چنانچہ احقر راقم کو بھی اپنے اخیر زمانۂ طالبعلمی میں تحریر فتاویٰ کا شوق ہوا اور کتاب دیکھنے کی فرصت نہ تھی تو حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے صدہا مشکل مسائل دریافت کرکے مفصل لکھدیا تھا۔ غرض اِن تمام اقسام کے فتاویٰ حضرت مولانا کے اگر شمار کیئے جائیں تو ہزارہا ہوسکتے ہیں مگر مجموع و مکتوب نہ ہوسکے۔

دار العلوم دیوبند سے جسقدر فتاویٰ جاتے تھے تقریباً سب ہی پر حضرت کی تصدیق و دستخط ہوتے تھے اور "الجواب صحیح" لکھکر صرف "بندہ محمود عفا اللہ عنہ" تحریر فرماتے تھے۔ عثمانی، چشتی، صابری، قاسمی وغیرہ پُر معنے القاب سے نام کی عظمت نہیں بڑھانا چاہتے تھے۔ ایک مخلص نے آپ کے نام نامی کی مہر بھی تیار کرا کر بھیجدی تھی جو نقرئی انگشتری کے حلقہ میں لگی ہوئی کسی امین کے پاس محفوظ رہتی تھی اور کبھی شاذ و نادر کسی بہت مہتم بالشان فتوے پر یا کسی شخص کی انتہائی آرزو کی وجہ سے نام کے نیچے ثبت کردی جاتی تھی۔ اسمیں آپکا

[1] خاکسار نے تمام اردو منظوم کلام کو یکجا جمع کرکے بنام منظوم کلیات شیخ الہند طبع کرادیا ہے ۱۲ فقیر اصغر حسین عفی عنہ دیوبندی

یہ پسندیدہ و مقبول سجع بہ ترتیب مزین کندہ تھا۔ " الٰہی عاقبت محمود گرداں" ہم بھی اسی دعا پر آمین کہکر اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔ امین یا مجیب دعاء السائلین آمین ؛

عبادت و ریاضت۔ شریعت و طریقت اور تصوف

علوم اسلامیہ کا نشر و اشاعت اور علم حدیث و تفسیر کا شغل شرعی نقطۂ نگاہ سے بہترین عبادت اور افضل الطاعات ہے اور حضرت مولانا کے حالات سے ظاہر ہے کہ تمام عمر اسی میں صرف ہوئی لیکن ہمارے عرف میں جس کو عبادت و ریاضت کہتے ہیں۔ حضرت مولانا کا درجہ اُسمیں بھی نہایت اعلیٰ تھا۔ طلب علم کی مشغولیت میں اس قسم کی عبادات کا بہت کم لوگوں کو خیال ہوتا ہے مگر (جیسا کہ حضرت کے ہمعصر لوگوں سے معلوم ہوا) مولانا ایام طالبعلمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے اور حضرت اُستاد کی خدمت میں دہلی اور میرٹھ میں رہتے ہوئے جس طرح دن کو تعلیم و تعلم کا شغل رہتا تھا رات کو ادائے اوراد و اذکار معمولہ مشائخ اور تعلیم فرمودہ حضرت اُستاد کا۔ شب کو دس گیارہ بجے تک حضرتِ اُستاذ کی خدمت میں رہتے اُسکے بعد گاہ گاہ شب کو مطالعہ و سبق دیکھتے ذرا آرام کرکے نوافل و ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے۔ مخدوم اُستاد تمام خدام سے اپنی عبادات کو مخفی رکھنا چاہتے تھے لیکن حضرت مولانا کی خصوصیت نیز اُن کی شب بیداری کی وجہ سے اِن سے اخفاء کی کوشش بھی نکرتے تھے۔ تعطیل کے ایام کو طلبہ اکثر لہو و لعب یا سیر و تفریح میں بسر کیا کرتے ہیں حضرت مولانا اِن ایام کو اور ان کی راتوں کو عبادت کیلئے مخصوص کر لیتے ؛

فراغتِ تحصیل علم اور قیام دیوبند کے بعد (جیسا کہ ابتدائی حالات میں مذکور ہو چکا ہی) باوجود تمام دن درس و تعلیم کی محنت برداشت کرنے کے عام طور سے شب کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور بکمال اتباع سنت نوافل ادا فرماتے۔ اگر وقت میں تنگی نہ ہوتی تو طویل قیام اور طویل رکوع و سجود سے نماز ادا فرماتے اور اکثر نمازِ صبح تک بیدار رہکر ذکر خفی میں مشغول رہتے لیکن گاہ گاہ فراغت کے بعد آرام فرماتے تھے اور جدید وضو سے نمازِ فجر ادا فرماتے تھے ؛

رمضان المبارک میں مولانا کی خاص حالت ہوتی تھی اور دن رات عبادت خداوندی کے سوا کوئی کام ہی نہوتا۔ دن کو لیٹتے اور آرام فرماتے۔ لیکن رات کا اکثر حصّہ بلکہ تمام رات قرآن مجید سُننے میں گذارتے۔ کئی کئی حافظوں کو سُنانے پر مقرر رکھتے اگر وہ باہر کے رہنے والے خادم و شاگرد ہوتے تو اُن کے قیام و طعام کا اہتمام فرماتے اور

تمام مصارف برداشت کرتے۔ کبھی اپنے مرشدزادہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم مدظلہم) سے اصرار کرکے کئی کئی قرآن مجید سُنتے کبھی اپنے بے تکلف پیر بھائی حافظ انوار الحق مرحوم سے کبھی اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد محسن صاحب کو مقرر فرماتے اور کبھی اپنے عزیز بھانجے مولوی محمد حنیف صاحب کو۔ اور اخیر زمانہ میں اکثر مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب اس خدمت سے سرفراز ہوتے تھے +

تراویح سے فارغ ہوکر بہت دیر تک حاضرین کو مضامینِ علمیہ اور حکایاتِ اکابر سے محظوظ فرماتے اور پھر اگر موقع ملتا تو چند منٹ کے لئے لیٹ جاتے اُسکے بعد نوافل شروع ہوتی۔ ایک حافظ دو چار پارے سنا کر فارغ ہوکر آرام کرتا مگر حضرت اُسی طرح مستعد رہتے اور دوسرا حافظ شروع کر دیتا اسی طرح متعدد حفاظ باری باری سے کئی کئی پارے سُناتے۔ قاری بدلتے رہتے تھے مگر مولانا کبھی دو تین بجے تک اور کبھی بالکل سحر کے وقت تک اسی طرح کھڑے سُنتے رہتے +

بعض رمضان میں فرائض مسجد میں پڑھکر مکان میں بجماعتِ خدام و حاضرین تراویح پڑھتے اور اسطرح چار چار اور چھ چھ بلکہ کبھی دس دس پارے تراویح میں پڑھے جاتے۔ تراویح ختم ہوجاتی تو کوئی حافظ نوافل میں شروع کر دیتا۔ تمام رات یہی لُطف رہتا تھا۔ اور اسقدر طویل قیام کے باعث جب پاؤں ورم کر جاتے تو خدام و مخلصین کو رنج ہوتا اور حضرت دلمیں خوش ہوتے کہ حتیٰ[۱] تو رمت قل ماہ میں سید الاولین والآخرین کا اتباع نصیب ہوا +

ایک مرتبہ تقلیلِ طعام اور قلتِ منام اور پھر طولِ قیام سے رمضان المبارک میں نہایت ضعیف ہوگئے پاؤں کا ورم بہت زیادہ ہوگیا مگر قلبی شوق چین نہ لینے دیتا تھا۔ کثیر مقدار میں قرآن مجید سُننے کے لئے مستعد تھے۔ آخر لاچار ہوکر مکان میں سے عورتوں نے مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب کہلا بھیجا کہ آج کسی بہانہ سے قلیل مقدار پر بس کر دینا۔ مولوی صاحب نے تھوڑا سا پڑھکر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کیا۔ حضرت کو دوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا خوشی سے منظور کرلیا۔ اندر حافظ صاحب لیٹ گئے باہر مولانا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے اُنھوں نے ہوشیار ہوکر جب دیکھا کہ خود حضرت مولانا ہیں تو اُن کی حیرت و ندامت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اُٹھکر کھڑے ہوگئے اور مولانا فرمانے لگے کہ نہیں بھائی کیا حرج ہے تمھاری طبیعت اچھی نہیں ذرا راحت آجائیگی +

[۱] حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شب کو نماز میں اسقدر طویل قیام فرماتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر گئے ۱۲ +

سنتِ نبویہ اور شریعتِ مطہرہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت مولانا نے طریقت کو پالیا تھا اور یہی وہ حقیقی طریقت ہے جو اولیا و انبیا و صوفیا و علما کے نزدیک ممدوح و مقصود رہی ہے۔ وہ امورِ اسلامی پر عمل کرتے ہوئے درجۂ احسان تک پہونچ گئے تھے اور تعبدُ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ[1] کے معنے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ شریعت اوصاف و اخلاقِ رذیلہ کے نتائج سے مانع ہے اور طریقت اُن اوصاف کی بیخکنی کرتی ہے جیسے کہ ڈاکٹر صاحب کی کنین کا استعمال بخار کو روک دیتا ہے لیکن طبیب صاحب کا جوشاندہ و خیساندہ اخلاط کی اصلاح کر کے بخار کے مادہ کو قطع کرنا چاہتا ہے یہی طہارتِ اخلاق باعثِ قربِ خداوندی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی اور یُزَکِّیْهِمْ وَيُطَهِّرُهُمْ کے اشارات سے یہی شرعاً محبوب ہے، اور دعائے اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی مطلوب۔ یہی عین طریقت ہے اور یہی اصلِ تصوف اور کمالِ ولایت۔ اور تخلق باخلاق اللہ یا سلبِ ارادہ وکون العبد فی رضاء اللہ اسی کے ثمرات و نتائج ہیں یا اسی کے ساتھ لازم و ملزوم۔ حضرت مولانا بفضلہ تعالیٰ ان امور میں درجاتِ عالی رکھتے تھے اور غایتِ اتباعِ سنت اور حُبِّ نبوی کی برکت سے کمالاتِ نبوت سے حصۂ وافی عطا ہوا تھا۔

حالات و کیفیاتِ قلبیہ کے اخفا کا اس درجہ اہتمام تھا کہ مخصوص خدام کو بھی پتہ لگنا مشکل تھا اور انتہائی سادگی کی وجہ سے ظاہر پرست و عجائب پسند لوگوں کا آپکو ولی کامل سمجھنا نہایت دشوار۔ تراویح میں قرآن مجید سُنکر بے قرار ہو جاتے۔ غور کرنے والوں کو تغیر محسوس ہوتا مگر کیا مجال کہ اُف نکل جائے یا بدن پر اثر آجائے کبھی بے اختیار آنسو گر پڑے تو خیر ورنہ جذب کر لیتے۔

آپکی عظمت و محبت قلوبِ خواص کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور آپکی صحبت میں جو جمعیتِ خاطر حق تعالیٰ نے رکھی تھی وہ زبان و قلم سے بیان نہیں ہو سکتی ؎

در صد ہزار ساغر و مینا نیافتیم — خاصیتے کہ در نگہِ مے فروشش بود

مصائبِ دنیا اور تکالیفِ قلبیہ سے مضطر ہو کر لوگ خدمت میں حاضر ہوتے۔ کچھ لفاظی اور پُر گوئی تو حضرت کے یہاں تھی ہی نہیں۔ محض ایک دو کلمۂ تسلی یا وعدۂ دُعا سے اطمینانِ خاطر پاتے تھے۔ عام مستفیدین و معتقدین و تلامذہ کی حسبِ استعداد اصلاحِ قلوب و تصحیحِ عقائد تو ایک مسلّم اور بدیہی امر ہے۔ ایسے مخصوص تصرفات بھی آپکے بیشمار ہیں کہ خوش نصیب لوگ اپنے خراب و خستہ حال لیکر حاضر ہوئے اور توفیقِ خداوندی اور حضرت

[1] حضور سید عالم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی طرح کرو کہ گویا تم حق تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو سمجھو کہ وہ تمکو دیکھ رہا ہے ۱۲

کی نظرِ توجہ سے قابلِ رشک حالت ہوگئی ؂

بزرگوں کے ادب و احترام اور مقبولانِ خداوندی سے محبّت و عقیدت میں مولانا کی برابر کوئی دنیا میں نظر نہیں آتا۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہما سے ایک خاص اُنس تھا اور اُن سے سوء عقیدت رکھنے والوں سے نفرت۔ ان حضرات کے حالات و کمالات بیان کرنے کے وقت مولانا کی بشاشت اور قلبی انشراح قابلِ دید ہوتا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب۔ اور اُن کے ہمعصر حضرات رحمہم اللہ کے اوصافِ حسنہ کمالِ محبت سے نقل فرماتے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں ہر ہفتہ پا پیادہ حاضر ہونا اور باوجود اپنی وجاہت و عظمت کے عقیدتمندانہ پیش آنا اور اپنی تصانیف کو بنظرِ اصلاح سنانا حقیقی محبت پر دال ہے اور حضرت مولانا کا ایک اعلیٰ کمال۔ مدرسے کے مشاہرہ اور تعلیم کے معاوضہ سے دل گھبراتا تھا لیکن مولانا ممدوح کے ارشاد سے خاموش رہے۔ اُستاد کی وفات پر تعلیم و تعلم سے دل برداشتہ ہو کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیا تھا مگر حضرت مولانا رفیع الدین قدس سرہٗ کی قلبی عظمت نے تعمیلِ ارشاد پر مجبور کیا۔ حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ اپنے ہمسر اور ہم عصر حضرات سے ایسے ادب و تعظیم سے پیش آتے کہ گویا یہی پیر و مرشد ہیں۔ سچ ہے اِنَّمَا یَعْرِفُ ذَا الْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوُوْہُ ؂

اپنے مرشد و اُستاد حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے فنافی الشیخ کا تعلق حاصل تھا اور محبت بدرجۂ عشق پہونچی ہوئی تھی۔ اُنکے کمالات اُن کے علوم۔ اُنکا تفقہ تمام عالم سے بڑھکر نظر آتا تھا۔ اور پھر اُسکو اسی حسن و خوبی سے بیان فرماتے کہ باید و شاید۔ اُن کے ذکر میں ایک خاص لطف آتا اور سلسلۂ کلام ختم ہونے کو نہ آتا۔ کبھی ذکر کرتے ہوئے انتہائی درجہ کو بشاش ہو جاتے اور کبھی نام لیتے ہوئے آنسو بھر لاتے۔ وفات کے بعد اُنکا ذکرِ خیر حضرت کے لئے موجبِ راحت تھا اور زندگی میں اُن کی خدمت۔ حضرت نے ایسی خدمتیں کی ہیں کہ اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے ؂

ایک مرتبہ عین برسات کے زمانہ میں مولانا نے اپنے وطن نانوتہ سے دیوبند کا قصد فرمایا۔ کچا راستہ خام سڑک، یہاں سے وہاں تک پانی بھرا ہوا، اور پھر کسی قدر ترشح موجود۔ مولانا بیماری سے اُٹھے تھے اور نقیہ ہو رہے تھے۔ جان نثار شاگرد نے اونچا تہمد باندھا ایک ہاتھ سے اُستاد کے سر پر چھتری کا سایہ کیا۔ اور گھوڑے کی رکاب سے بالکل متصل ہو کر دوسرا ہاتھ کمر میں ڈالکر سہارا لگایا۔ چودہ میل اسی شان سے طے کئے۔

راستہ میں ایک دو جگہ اُستاد کی راحت کے خیال سے ٹھہرے ورنہ حضرت مولانا کی کمر ہمت ڈھیلی نہ ہوئی مرشد کی ایسی خدمتیں وہ منازل و مقاماتِ سلوک ایک روز میں طے کرا دیتی ہیں جو برسوں کی عبادت سے بمشکل طے ہوتے ہیں۔

مشہور و معروف نسبتِ بیعت آپکی اپنے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے ہی ہے ہر چہار خاندان میں بیعت فرمایا تھا۔ اور چاروں سلسلوں میں اجازتِ بیعت عطا فرمائی تھی لیکن معروف و معمول بہا ان حضرات میں سلسلہ چشتیہ ہے۔ اور حضرت شیخ العرب و العجم مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بذریعہ والا نامہ کے اجازت و خلافت عطا فرمائی تھی۔ ایک زمانہ میں اسکے متعلق بعض حضرات کا طلبِ ثبوت محسوس کر کے مولانا حسین احمد صاحب نے اس والا نامہ کا فوٹو لیکر شائع کر دیا تھا۔ بہرحال بالواسطہ اور بلاواسطہ آپ کا سلسلہ ارشاد حضرت حاجی صاحب تک پہنچتا ہے (اور حضرت ممدوح کے شجرات ہر چہار سلاسل میں مشہور و شائع ہیں یہاں اُنکے نقل کرنے کی ضرورت نہیں)+

حضرت مولانا بھی اپنے بزرگوں کے معمول کے موافق سلسلہ چشتیہ میں بیعت فرماتے تھے لیکن تعلیم و تلقین بلا پابندی سلسلہ حسبِ استعداد و مناسبت فرما دیا کرتے تھے۔ ابتدائے زمانہ سے تمام شناسا لوگوں اور فیض یافتہ طالب علموں کے قلب میں آپکی محبت و عقیدت تھی۔ اور تمام شاگرد آپکو ایک کامل شیخ سمجھتے تھے اسلئے بہت لوگ بیعت کے لئے اصرار کرتے تھے مگر بدشواری کبھی کوئی کامیاب ہوتا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی وفات کے بعد بلا اختیار منجانب اللہ آپکی طرف خلقت کا بہت زیادہ رجوع ہوا۔ اُسوقت آپنے کسی قدر وسعت فرمائی۔ پھر بھی اکثروں کو یہ کہکر ٹال دیتے کہ جو حضرات اس کام کو کر رہے ہیں اُن سے رجوع کرو زیادہ فائدہ ہوگا کسی کو صرف تعلیم و تلقین کر دیتے اور کسی کو بہت انکار و اصرار کے بعد بیعت فرما لیتے +

مالٹا میں حق تعالیٰ نے آپکو اقطارِ بعیدہ کے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ بہت لوگونکو باقاعدہ سلسلہ میں داخل فرمایا اور صدہا کو آپکی صحبت بابرکت اور آپ کے رفقا کی نصیحت سے اتباعِ صراطِ مستقیم کی توفیق نصیب ہوئی۔ واپسی ہندوستان پر چونکہ اجلِ مقدر کا قرب ہوا لہذا بالکل یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا منظر پیشِ نظر ہو گیا معمولی استدعا پر، ذرا سی سفارش پر بیعت میں داخل فرما لیتے۔ سفر و حضر میں جا بجا صدہا لوگ داخلِ سلسلہ ہوئے جنہیں اکثر فیوضِ باطنی سے مالا مال ہوئے +

بیعت کا طریقہ بالکل سادہ تھا نہ کوئی اہتمام نہ انتظام نہ تکلف۔ اکثر نمازِ مغرب یا نمازِ عشا کے بعد اور کبھی حسبِ موقع و ضرورت اور کسی وقت طالب کو بلا لیتے بعض کو دوگانہ نفل پڑھنے کا ارشاد کرتے اور مختصر الفاظ توبہ بتوجہ قلبی کہلاتے جنکا طالب پر خاص اثر پڑتا اور مدتوں قائم رہتا۔ پھر مناسبِ استعداد و حالات کچھ مختصر

یا طویل ذکر اللہ تعلیم فرماتے۔ بعض کو دوازدہ تسبیح بتلاتے۔ جو لوگ باقاعدہ ذکر و شغل جاری رکھنا چاہتے اُن کو اُسکی تعلیم فرماتے اور نگرانِ حال رہتے۔ ممکن ہے کہ اپنی شومیٔ قسمت سے کوئی بالکل عاری اور خالی رہگیا ہو ورنہ کچھ نہ کچھ اصلاحِ حال ضرور نصیب ہوتی تھی اور یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی طالب عدمِ فیضان یا بے توجہی کی شکایت سے حضرت کا دروازہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا ہو +

خلافت و اجازت کی حضرت کے خادموں میں نہ کسی کو آرزو ہوئی تھی نہ خیال۔ اور کمالِ تواضع کی وجہ سے نہ حضرت اپنے آپکو اس قابل سمجھتے تھے کہ ان امور کا کوئی خاص اہتمام و انتظام فرماویں اسلئے حضرت کے خلفا کی تفصیل مشکل ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ کسی معمولی آدمی کو یہ عزت عطا نفرماتے تھے کسی بہت ہی محنت کش اور کامل کو مستحق سمجھتے تھے جیسے مولوی صوفی محمد اکرم صاحب پنجابی یا مولانا شاہ وارث حسن صاحب جو حضرت گنگوہی رحمہ کے دربار سے بھی مجاز تھے اور مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری اور ایسے ہی اور بعض حضرات +

جیسا کہ ابھی عرض ہوا ہے حضرت اپنے آپکو کوئی شیخ یا پیر مرشد نہ سمجھتے تھے اسلئے شجرات کا بھی کچھ اہتمام نہ تھا۔ دوسرے بزرگوں کے شجروں پہ آپکے نام کے اشعار لکھکر خدام اپنے پاس رکھتے اور پڑھتے لیکن ۱۳۳۰ھ کے بعد جب کثرت سے لوگ حیران کرنے لگے تو بہ تعمیلِ ارشادِ حضرت احقر نے آپکا شجرہ طبع کرا کر رکھ لیا۔ جو کوئی اصرار کرتا احقر کے پاس بھیجدیتے۔ آخر زمانہ میں مفصل کتاب شجرات خدام کے اہتمام سے طبع ہوگئی اور مولانا عزیز گل صاحب وغیرہ کے سپرد رہتی تھی جسکو حضرت مستحق سمجھتے دلوادیتے۔ احقر وہی اپنا طبع کیا ہوا مقبولِ بزرگان شجرہ چشتیہ نقل کرنا کافی سمجھتا ہے +

اوقاتِ عزیز ضائع کرنے والا شغل تعویذات و عملیات کا حضرت نہ رکھتے تھے۔ قدیم زمانہ میں حضرت کو اہل سمجھکر بعض بزرگوں نے بکمالِ شفقت سکھلانا بھی چاہا مگر آپنے پسند نفرمایا۔ آپکی دعا صدہا عملیات سے بڑھکر تھی اور آپکی توجہ بہترین تعویذ۔ البتہ اگر کوئی مخصوص خادم و مخلص نیازمندی سے استدعا کرتا تو کبھی کبھی کوئی تعویذ لکھکر عطا فرمادیتے +

بزرگوں کی بے اصل کرامات تو حضرت کو یاد نہ تھی البتہ جب بزرگانِ دین اولیاء اللہ اور ائمہ اسلام کے حالات و واقعات بیان کرنا شروع فرماتے تو سننے والے کو مرضیاتِ الٰہی کی طرف بے اختیار رغبت ہوتی تھی اور دنیاوی مشاغل سے نفرت۔ اظہارِ کمال کیلئے الفاظ میں اصطلاحاتِ تصوف کا بے موقع استعمال تو نفرماتے لیکن کبھی موقع آجاتا تو ایسے حقائق بیان فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بالکل کسی امر مشاہد کو بلا اشتباہ بیان فرما رہے ہیں

ایک روز مختصر مجلس تھی۔ باتوں باتوں میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا ذکر آ گیا خادموں نے انبساط دیکھکر چھیڑنا شروع کیا کسی نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین عالیہ کا ذکر کیا کسی نے دو چار جملے اُسکے نقل کئے کسی نے ذرا ہمت کر کے عرض کیا حضرت کچھ فرمائیے ایک دو مرتبہ ٹلایا پھر تو حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین کی شرح کرتے ہوئے خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ سامعین حیران تھے کہ کس خزانۂ علمی کا دروازہ کھل گیا ہی۔ مولانا تو حدیث وفقہ میں موشگافیاں فرمایا کرتے تھے یہ مضامین کہاں سے آرہے ہیں مضامین کا ضبط کرنا تو دشوار تھا ہی مگر اُس حالت کا نقشہ دکھلانا تو ممکن ہی نہیں +

منجانب اللہ جسقدر شہرت ہوئی تھی ہوئی ورنہ حضرت نے اپنے آپکو چھپانے میں کوتاہی نہیں فرمائی۔ اپنے واقعات، حالات، واردات کو ہمیشہ بہت ہی گھٹا کر اور معمولی سطح پر لاکر بیان فرماتے۔ ایک شب کو معمولی بخار کی حالت اور یکسوئی اور تنہائی کے وقت میں صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب کی ایک آیت قرآنی کے متعلق کچھ مضمون عجیب منجانب اللہ القا ہوا۔ اگلے روز خدام جمع ہوئے تو فرماتے ہیں "بیماری کی باتوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اور بخار میں دماغ بہت پریشان ہوتا ہے کل اسی حالت میں بخاری کے ترجمۃ الباب اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ کَمَا اَوْحَیْنَا اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِہٖ کی نسبت ایک بات خیال میں آئی مگر پریشانی کی حالت کی بات کچھ ایسی ہی ہوتی ہی" شاگردوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ تو فرمائیے فرمایا کہ میاں کچھ بات بھی ہو۔ خیر زیادہ اصرار پر فرمایا۔ اِسوقت دیر ہو گئی رات زیادہ گئی ہے کل انشاءاللہ بیان کرونگا۔ اگلی شب کو بیان فرمانا شروع کیا اور باوجود ضعف کے نہایت شرح و بسط سے باب سے آیت کی مناسبت اور آیت میں مِنْ بَعْدِہٖ کی قید کا فائدہ بیان فرماتے ہوئے اور آیات و احادیث سے استشہاد کرتے ہوئے فیوض علیہ سے سامعین کو مالا مال فرما دیا۔ پوری تقریر محفوظ رہنی دشوار تھی۔ مکان پر جاکر جسقدر یاد آیا پنسل سے لکھکر رکھ لیا۔ یہ تقریر کسی قدر اجمال کے ساتھ رسالۃ الابواب و التراجم کے پہلے باب میں صفحہ ۲۰ و ۲۱ پر درج ہو گئی ہے +

وفور علم و وسعت نظر اور خداداد تفقہ فی الدین کی وجہ سے مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے مگر غایت تواضع سے محدثین و مجتہدین و مصنفین کے سامنے اپنا کوئی درجہ ہی نہیں سمجھا اور کبھی یہ نفرمایا کہ میرے نزدیک یہ راجح ہے یا میں یہ کہتا ہوں۔ بہت سے بہت کبھی فرمایا تو یہ کہ "اچھا یوں معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ یوں کہا جائے"۔ اہل علم تو کجا کبھی معمولی لوگوں سے بھی اپنے آپکو ارفع نہ سمجھا۔ ظہر کے بعد ہم لوگ ملا حسن کا سبق پڑھ رہے تھے کہ ایک بزرگ سفید ریش آ گئے جنکو سُنے سُنائے کچھ اختلافی مسائل کی شُد بُد تھی اول کچھ سوال کئے اور پھر اعتراض کرنیلگے اور

مناظرہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ مولانا مختصر اور مسکت جواب دیکر خاموش ہوجاتے۔ بڑے میاں عاجز ہوکر خفگی اور سختی سے دو چار جاہلانہ اعتراض کرتے یا کچھ جواب دیتے۔ بڑے میاں تیز ہورہے ہیں آواز بلند کرتے ہیں مگر حضرت ہنس ہنس کر آہستہ جواب دے رہے ہیں۔ عصر کی نماز کو کسی قدر دیر بھی ہوگئی مگر جب تک پیرمرد نے خود بس نکردی حضرت بیٹھے رہے یہ تحمل و بردباری کسکو نصیب ہوتی ہے؛

نظربندئ مالٹا کے زمانہ میں سکوت غالب رہتا تھا اور علمی اشغال کے بعد ذکر و فکر میں مصروف رہتے تسبیح ہاتھ میں لٹکائے رکھتے تھے اکثر جیب میں رکھتے جب کہیں بیٹھتے اور فراغت ہوتی فوراً نکالکر خاموشی سے پڑھنا شروع فرماتے اور لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ پر عمل کرتے؛

مخدوم کا اثر خادموں میں بھی آتا ہے اسلئے حضرت مولانا اور آپکے اکابر کے متوسلین ہر وقت کرامت شماری کے خیال میں نہیں رہتے تھے عمل بالسنۃ اور اتباع شریعت ہی کو یہاں کمال سمجھا جاتا تھا تاہم اگر حضرت کے معمولی واقعات و خوارق عادات جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہوجائے۔ احقر کو چونکہ استیعاب حالات مقصود نہیں اور رسالہ بھی اُمید اور ارادہ سے زیادہ طویل ہوتا چلا جاتا ہے اسلئے تحقیق و تلاش سے جمع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اپنی ذاتی معلومات یا اتفاقیہ کسی معتبر سے سُنے ہوئے ایک دو واقعات ذکر کئے دیتا ہوں؛

احقر نے اثنائے درس میں حضرت مولانا کی زبان سے سُنکر بڑی محنت سے کچھ تقریریں اور یادداشتیں جمع کی تھی۔ طالب علم تو ایسے علمی جواہرات کے خواہشمند ہوتے ہی ہیں اور بلا محنت ہاتھ آجائے تو سبحان اللہ جواز و عدم جواز کا خیال نہ کیا کوئی مہربان طالب علم لے اُڑے۔ نہایت رنج ہوا اور کوئی صورت دستیابی کی نظر نہ آئی اسی غم میں ایک روز مدرسہ جانے کو بھی دل نہ چاہا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو عصر کے بعد تسلی کیلئے مکان پر تشریف لائے مفصل حال دریافت کرکے افسوس ظاہر فرمایا صبر دلایا اور پوچھا کہ تمہاری ہی لکھی ہوئی تھی میں نے عرض کیا جی حضرت میں نے ہی لکھی تھی۔ فرمایا پھر کیا غم ہے پھر لکھ لینا اور عجب نہیں کہ مل جائے۔ اگلے روز بخاری کے سبق کے بعد میں نے یاد دلایا تو سب طلبہ کو خطاب کرکے نہایت جوش سے ایک شاندار لہجہ میں فرمایا کہ "دیکھو! سید کی تقریر جس نے لی ہو دیدو انکو بہت رنج ہے اگر نہیں دیگا تو خواہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوجائے لیکن علم نہیں آئیگا اور یہ خیال نکرنا کہ معلوم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بتلا بھی دیتے ہیں" یہ سُنکر سب طلبہ سہم گئے اور چند روز کے بعد چور صاحب ہی قفل کھولکر وہ تقریر رکھ گئے۔ اس واقعہ سے حضرت کی کرامت

وبرکت معلوم ہونے کے ساتھ ہی آپکی غایت توجہ اور شفقت علی الخدام والاصاغر بھی معلوم ہوتی ہے کہ مقبولی مصائب میں بھی ہمدردی اور اعانت کا خیال فرماتے تھے۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنئیے ✤

مولانا عبدالسمیع صاحب (مدرس دارالعلوم) کی اہلیہ اور صاحبزادی دونوں ہیضہ میں مبتلا ہوئیں سخت تکلیف تھی وبا کا زمانہ تھا بہت کم مریض جانبر ہوتے تھے۔ حضرت کو خبر ہوئی تو بلا طلب مکان پر تشریف لیگئے مولوی صاحب نے حالت بیان کی اور بچی کو گود میں لیکر سامنے کیا آپنے اُسکے سر پر دست مبارک رکھکر فرمایا کہ "اجی یہ تو اچھی ہو جائیگی" مولوی صاحب کو مدرسی کے شغل میں یہاں بھی قید احترازی کا اندیشہ ہوا اور گھبراکر عرض کیا کہ حضرت" اور اُسکی والدہ" آپ نے طمانیت بخش لہجہ میں فرمایا "وہ بھی انشاءاللہ تعالیٰ اچھی ہو جائیگی" مولوی صاحب نے کسی قدر پانی دم کرالیا اور حضرت نے ذرا سا اُسمیں سے نوش کرکے اُس کو متبرک کردیا اور واپس ہوگئے۔ لڑکی کا مرض بڑھکر مایوسی کی حالت ہوگئی اور سب نے خیال کیا کہ اب احتیاط وپرہیز سے کیا فائدہ۔ پیاس شدید ہے ٹھنڈے پانی کے لئے کیوں ترسایا جائے وہی متبرک پانی خوب پلا دیا کچھ عرصہ کے بعد لڑکی کو افاقہ شروع ہوا اور شام تک حالت سنبھل گئی۔ پھر کیا تھا وہی پانی کا نسخہ اُسکی والدہ پر جاری کیا گیا اور حق تعالیٰ کے فضل سے اُسکو بھی صحت ہوگئی ✤

یہی اہلیہ مرحومہ دوسری مرتبہ بیمار ہوئیں کئی روز کی پریشانی کے بعد مولوی صاحب کو اُسی بابرکت علاج کا خیال آیا۔ تقدیر خداوندی دیکھئے۔ مکان پر حاضر ہوتے ہیں تو حضرت مولانا موجود نہیں۔ مدرسہ میں تلاش کیا تو حضرت مکان تشریف لیگئے۔ مسجد میں تلاش کرتے ہیں تو ملتے ہی نہیں۔ اُسی روز حضرت مہتمم صاحب کے مکان پر مجمع کی دعوت ہوئی۔ مولوی صاحب نے غنیمت سمجھا اور نہایت اہتمام سے حضرت کے سامنے کا بقیہ شوربا مریضہ کیلئے لیکر اپنے مکان کی طرف چلے راستہ میں خلاف عادت ایسے گرے کہ پیالہ ٹوٹکر شوربا گر گیا اور راستہ کے پانی میں مل گیا۔ مولوی صاحب اُسی وقت سمجھ گئے کہ بس قسمت ہی میں نہیں مایوس ہوکر چلے گئے اور مریضہ کی وفات ہوگئی رحمہا اللہ تعالیٰ ✤

میرے ایک متین ہم سبق اور عنایت فرما اور حضرت مولانا کے نہایت مخلص خادم وشاگرد کا صاحبزادہ قرآن مجید حفظ کرتا تھا دوائیں کھلائیں دعائیں کرائیں اُستادوں کو بدلا لیکن یاد ہی نہوتا تھا اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی ارادہ ہوا کہ چھڑا دیں۔ حاضری دیوبند میں حضرت سے بقصد طلب اجازت عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پڑھنے دو چھڑاؤ نہیں اور شاید کوئی تسلی کا لفظ فرمایا۔ تعمیل میں کہاں عذر ہوسکتا تھا۔

حضرت کی برکت سے لڑکے نے حفظ کرلیا۔ اور اب بہت اچھا حافظ ہے۔ تراویح میں سُناتا ہے +

۱۳۲۲ھ کے آخر میں دیوبند میں شدید طاعون ہوا چند طلبہ بھی مبتلا ہوئے ایک فارغ التحصیل طالب علم محمد صالح ولایتی جو صبح شام میں سندِ فراغ لیکر وطن رخصت ہونے والے تھے اسی مرض میں مبتلا ہوئے اور حالت آخری ہوگئی۔ وفات سے کسی قدر پہلے اُنہوں نے ایسی گفتگو شروع کی کہ گویا شیطان سے مناظرہ کر رہے ہیں۔ اُسکے دلائل کو توڑتے اپنے استدلال پیش کرتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنہوں نے مناظرہ میں شیطان کو بخوبی شکست دیدی۔ پھر کہنے لگے افسوس اسجگہ کوئی ایسا خدا کا بندہ نہیں ہے جو مجھے اس خبیث کو دفع کرے۔ یہی کہتے کہتے دفعۃً بول اُٹھے کہ واہ واہ سبحان اللہ دیکھو میرے اُستاذ حضرت مولانا محمود حسن صاحب تشریف لائے۔ دیکھو وہ شیطان بھاگا۔ ارے خبیث کہاں جاتا ہے۔ ایک ساعت کے بعد طالب علم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا اُس واقعہ کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ مگر روحانی تصرف سے امداد فرمائی اور فَقِيهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ کے ایک معنے آنکھوں سے دکھلا دیئے اسی لئے حضرت عارف رومی رح فرماتے ہیں ؎

دامن اُو گیر زُو تر بے گماں　　تا رہی از آفتِ آخر زماں +

مرض الموت سے چند ہی روز پہلے ایک بوڑھے شخص آئے اور مولانا روم رح کا یہ شعر پڑھکر ؎ بُد ز گستاخی کسوفِ آفتاب + شد عزازیلے ز جرأت رد باب + معنے دریافت کئے۔ احقر کو چونکہ اتفاقیہ اسی شعر کے چند معنے محفوظ تھے خطرہ گذرا کہ یہ شخص مجھسے دریافت کرتے تو خوب سمجھا دیتا۔ حضرت نے اُن کے سوال پر بلا تامل میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اِن سے پوچھو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپکو بہت سے معنے یاد ہونگے مگر شرح میں یہ لکھا ہے (کہیں صحیح روایات میں تو ہے نہیں) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بدن سے کرتہ نکالکر پھٹے ہوئے کو درست کرنے کے لئے سی رہے تھے۔ دھوپ کی تیزی سے بدن کو تکلیف محسوس ہوئی تو تیز نظر سے آفتاب کو دیکھا فوراً کسوف ہوگیا"۔ اور پھر آہستہ آہستہ کئی معنے پیر مرد کو سمجھائے (جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے) اُنھوں نے خوش ہوکر حضرت سے عرض کیا کہ کئی آدمیوں سے دریافت کیا ایسے معنے کسی نے نہیں تبلائے تھے۔ حضرت نے تبسم سے فرمایا کہ اسی لئے تو کہتا تھا کہ ان سے دریافت کرو +

مولانا مفتی سید مبارک علی صاحب قاضی سرونج (ریاست ٹونک) کی ایک تجویزِ مقدمہ سے مقامی علمائے (جنمیں بعض مقتدر علما بھی شامل تھے) اختلاف کیا اور اُن کی تجویز کے خلاف سرکار سے فیصلہ کرا دیا۔ اپیل میں

جب صورت واقعہ علمائے دیوبند و لکھنؤ کو لکھی گئی تو سب نے مولویصاحب کی تجویز سے موافقت کی اور مقامی علما کے فیصلے کو باطل ٹھیرایا۔ اسپر برافروختہ ہوکر علمائے مولوی صاحب کی ایذارسانی پر کمر باندھی اور خود نواب صاحب سے انکی شکایت کی۔ معاملہ خطرناک ہوگیا تو مولوی صاحب نے اپنے ماوا و ملجا پیر و مرشد حضرت مولانا کو اطلاع دی اور پوری حالت سے مطلع کیا۔ حضرت نے خاص توجہ اور شفقت سے دعا فرمائی اور خلاف امید حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے مولوی صاحب کو بعزت و حرمت سرخرو رکھا اور شکایت کرنے والوں کے منہ پر نواب صاحب نے مولوی صاحب کی تعریف و تائید کرکے مخالفین کو ناکام و نامراد کیا ✤

احقر کے زمانۂ قیام جونپور میں حضرت مولانا بھاگل پور سے واپس ہوتے ہوئے ایک روز کیلئے جونپور ٹھیرے مولانا حسین احمد صاحب ہمراہ تھے۔ رمضان المبارک کا تیسرا روزہ تھا شب بیداری کے کسل سے صبح کی نماز کے بعد حضرت نے آرام کرنا چاہا تنہائی کیلئے مسجد اٹالہ کی بالائی درجہ پر بستر بچھاکر حضرت کو لٹادیا۔ مولانا حسین احمد صاحب (جو اس زمانہ میں "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے صحیح مصداق ہوگئے ہیں) ہمیشہ سفر و حضر میں خدمت کرکے حضرت کو راحت پہونچاتے رہتے تھے حسب عادت پاؤں دبانے لگے۔ خاکسار محروم الخدمت کو بھی حرص آئی دوسرا پاؤں دبانا شروع کیا اور ہنسکر مولانا حسین احمد صاحب سے کہا کہ "مولوی صاحب آج تو ہم بھی آپکی برابر ہوگئے" حضرت نے سُنکر فرمایا بھائی تم کہاں کہاں انکی برابری کروگے اُسوقت تو یہ ایک معمولی فقرہ سمجھا گیا لیکن مولانا حسین احمد صاحب کا مدینہ منورہ میں، اور پھر اپنی بیش قیمت آزادی کو قربان کرکے خوشی سے نظربندی میں حضرت کی معیت اختیار کرنا، تمام سفر خصوصاً زندان قاہرہ اور اسیری مالٹا میں جان نثاری و خدمت کرنا اور پھر کلمۃ الحق کے اعلان پر زندان کراچی میں اسیر ہونا، اور تمام ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر مدحیہ اشعار میں مولانا حسین احمد کا نام ہونا بتلا رہا ہے کہ وہ ایک پُرمغز کلام تھا اور مولانا حسین احمد صاحب کی آئندہ شاندار دینی و قومی زندگی کیلئے ایک معنی خیز اشارۂ خیر و برکت تھا ✤

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی مقدس زندگی آپکا اتباع سنت اشاعت علوم دین اشتغال بالحدیث النبوی اور تمام سیرت و حالات اُمید دلانے والے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپکو اُس عالم میں مدارج عظمیٰ اور درجات عالیہ عطا فرمائے ہونگے۔ اور اسی کے ساتھ بعض مخلص و بیدار، بے لوث حضرات کی قابل قدر متبرک خوابیں بھی (اگرچہ مفید علم قطعی نہیں) اسی حسن ظن کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ کسی نے دیکھا کہ حضرت شاداں و فرحاں باغ میں کھڑے ہیں۔ کسی کو نظر آیا کہ بعزت و شان دربار لگا ہوا ہے اور تخت پر بیٹھے ہوئے قضایا فیصل فرما رہے ہیں

ایک شخص نے حدیث شریف کا درس دیتے ہوئے معاینہ کیا ✦

اگرچہ مضمون ماحصل سب کا تقریباً ایک ہی ہے لیکن سب سے فائق وہ خواب ہے، جو ایک مخلص خادم نے وفات کے بعد بالکل متصل دیکھا کہ ایک عظیم الشان مکان تیار ہے جسکی خوبصورتی اور زینت اور نورانیت و لذت کا بیان محال و دشوار ہے - خدام حاضرین ہر طرف خوشی و اہتمام سے دوڑ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور جدید مہمان حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا انتظار ہے - حق تعالیٰ ان سب مبشرات منامیہ کو سچا کر کے حضرت سید الکونین فخر عالم کی مہمانداری کی عزت آپکو نصیب فرماویں اور اپنی رحمت اور مغفرت سے معزز و ممتاز اور درجات جنت میں سرفراز فرماویں - آمین یا رب العلمین ✦

خاتمہ - عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمْ - پہلے صرف تشریف آوری کے حالات حضرت کے تشریف لانیکے بعد ہی فوراً طبع کرنیکا ارادہ تھا - امراض و اعذار نے فرصت نہ دی یہانتک کہ مرض و وفات کے دردانگیز حالات بھی بتقضائے الٰہی شامل کئے گئے اور صرف دو جزو پر طبع کرنیکا مصمم قصد کر لیا لیکن مالٹا کے واقعات کا اضافہ مناسب سمجھا - پھر دیگر معمولی حالات بھی تحریر ہو گئے یہانتک کہ یہ رسالہ اسقدر طویل ہو گیا کہ بعض عدیم الفرصت یا نازک طبع ناظرین کو تکلیف مطالعہ بھی ناگوار گذریگی مگر کیا کیجئے

؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم - تنزل و تلون ارادہ اور تغیر حالات ہی باعث ہے کہ بعض واقعات میں بالکل اجمال ہے اور بعض جگہ تفصیل تشریف آوری کے حالات شوال ۱۳۳۸ھ کے تحریر کئے ہوئے ہیں اور دیباچہ اور بعض واقعات رجب ۱۳۳۹ھ کے لکھے ہوئے اور آخری اوراق ماہ صفر ۱۳۴۰ھ کے ✦

یقین فرمائیے کہ طول فضول ہی کے خوف سے دوسروں سے دریافت کرنا تو درکنار بہت سے واقعات کو ذکر کرتے ہوئے اختصار سے گلا مروڑ دیا - مضامین علمیہ اور تقریرات احادیث کو اس مختصر کتاب میں اسلئے نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ طلبہ اور اہل علم کے مطالعہ میں تو حضرت مولانا کی تصانیف و تقریرات موجود ہیں وہ اُن سے استفادہ کر رہے ہیں اُن کے لئے ضرورت نہیں اور عام اُردو داں اصحاب سمجھ نہیں سکیں گے اور مناسبت و دلچسپی نہ ہوگی - اس قسم کے مضامین اور دیگر ضروری امور کیلئے جن سے یہ رسالہ خالی ہے مستند اہل علم کی جمع فرمودہ حیات شیخ کے منتظر رہیں جو کسی نہ کسی وقت منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہوگی ✦

اب حضرت مولانا کا شجرۂ متبرکہ نقل کر کے اور اُسکے بعد ہزارہا قطعات و اشعار تاریخی میں سے چند منتخب درج کر کے اور مکرر یہ کہکر کہ "حضرت مولانا کے حالات طیبات کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا جا سکا اور آپکے کمالات کے ہزارویں حصہ کا بھی اظہار نہیں ہو سکا" باعتراف عجز و قصور و بامید عفو و اصلاح اس اپنے دردنامہ کو ختم کرتا ہوں ؎

مرا بسادہ دلی ہائے من تواں بخشید | خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ - وصل علیٰ سیدنا و مولانا محمد النبی الکریم -

شجرۂ مبارکہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ امدادیہ بواسطۂ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

یَا دَائِمَ الْاِنْعَامِ وَالْاِحْسَانِ — ارحم علی العبد الفقیر الجانی
فبسیدی مولای محمود حسن — ممدوح اهل الحمد والاحسان
فبحق مولانا محمد قاسم — هو قاسم للعلم والعرفان
فبرشدی غوث الوری شمس الهدی — ق — مقدام اهل العشق والهیمان
الشیخ امداد الله القطب العلی — الجامع ذی التمکین والعرفان
وبکاشف الظلمات نور محمد — وبسیدی عبد الرحیم الفانی
وبعبد باری ذاك شیخ شیوخنا — وبعبد هادی للزمان امان
وبحق عضد الدین حق محمد — ومحمدی ظاهر البرهان
وبحق مولانا محب الله من — اعیت مدائحه وسیع بیان
بابی سعید ماجد متورع — بنظام دین عارف ربانی
بجلال دین ذی المکارم والعلی — وبعبد قدوس عظیم الشان
محمد قطب الوری وبعارف — هو للوری کالماء للظمآن
وبحق عبد الحق قدس سره — بجلال دین ذا کبیر اوان
بالشیخ شمس الدین قدوۃ عصر — بعلاء دین صابر حقانی
بفرید دین الحق عم فیوضه — وبقطب دین ذاك قطب زمان
بمعین دین الله صاحب سره — غوث الوری وبسیدی عثمان
وبحرمة الحاجی الشریف امامنا — بالخواجه مودود وجیل زمان
وبسیدی کهف الوری علم الهدی — بویوسف فی الفیض کالتهتان

شجرۂ مختصرہ تاج الاولیاء قدوۃ الاصفیا
حضرت مولانا محمود حسن صاحب
شیخ الہند قدس سرہ العزیز

از طفیل ذات پاک و بہر ختم المرسلین
بہر حضرت مرشدی مولائی محمود الحسن
حضرت امداد و نور و حاجی عبد الرحیم
شہ محمدی شہ محب اللہ و شاہ بوسعید

بہر حق اولیاء و بندگان صالحین
مظہر فیض رشید و قاسم و امداد دین
عبد باری عبد ہادی عضد دین بلی امس
شہ نظام و شہ جلال و عبد قدوس قطبین

سیدی شیخ محمد شیخ عارف عبد حق
شہ معین و شاہ عثمان زندنی مودود شاہ
شہ ابی احمد ابی اسحاق و ممشاد علو
شہ فضیل و عبد واحد شہ حسن حضرت علی

شہ جلال و شمس و صابر شہ فرید و قطب دین
شہ ابو یوسف ولی و بو محمد ذی الیقین
بو ہبیرہ شہ حذیفہ ابن ادہم شاہ دین
آمنا الحسنات فی الدارین رب العالمین

بمحمدٍ ذی المجد و العلیاء من ۔۔۔ قد فاق عز فاننا علی الاقران

و بحرمۃِ الشیخ الکریم المقتدی ۔۔۔ بو احمدٍ فی السرّ و الاعلان

و بحق بو اسحاق مرشدِ دہرہٖ ۔۔۔ و بحق ممشادٍ عدیم الثانی

بابی ہبیرۃ ذی المقام العالی ۔۔۔ بحذ یفۃٍ ہو نخبۃ الاعیان

و بحق ابراہیم سلطان الوری ۔۔۔ بفضیلٍ الہادی الی الاحسان

و بحق عبد الواحد الفرد الذی ۔۔۔ ہو فی الغرام کطافحٍ سکران

و بحق خیر الاصفیاء امامہم ۔۔۔ حسنٍ و لم یر مثلہ العینان

و بحق مولی المومنین امیرہم ۔۔۔ و امام اہل الدین و الایمان

اعنی علیاً خیر من وطی الثری ۔۔۔ ماوی الضعاف مجلی الاحزان

و بحق سیدنا النبی محمدٍ ۔۔۔ ہو للخلائق رحمۃ الرحمان

من فاق کل الخلق فضلاً باذخاً ۔۔۔ من سلا مجداً عالم الامکان

و بفضلک الجم العمیم الہنا ۔۔۔ یا غافر الذنب و العصیان

قد جاء عبدک بالبا مستضرخاً ۔۔۔ متوسلاً باولیائک الاعیان

فاغفر خطایاہ و طہر قلبہ ۔۔۔ عن ما سواک ایا رجاء العانی

سلط علیہ العشق حتی لا یری ۔۔۔ مولای غیرک کائناً بمکان

ثم السلام علی النبی المصطفی ۔۔۔ خیر الوری و رسولک العدنانی

بعض اشعار از قطعہ تاریخ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی مقیم دہلی دام اللہ فضلہم

رفت زیں دارِ فنا حبرِ نبیل ۔۔۔ کش ندیدہ چشم احول نیز جفت

بر کفے سندانِ عشقے داشتے ۔۔۔ بر کفے جام شریعت از نخست

بہر نشر علم تا پنجاہ سال ۔۔۔ چشم بیدارش بسے شبہا نخفت

ہمت عالیش وقت امتحاں ۔۔۔ گردش اندر صد بلا بسیار چست

از رخ گوشہ نشیناں جبر تش ۔۔۔ داغ کمزوری و بیکاری بشست

عالمے را کردہ از پیغام حق ۔۔۔ با خبر۔ در دامن رحمت بخفت

گر ببینے ایں چنیں گلبن ندید ۔۔۔ گرچہ بر روئے زمیں گلہا شگفت

نوک مژگان خلائق ز اشک خوں ۔۔۔ در فراق او چہ گوہرہا بسفت

بندہ دلریش تاریخ وفات ۔۔۔ در کلام خیر خلق اللہ بجست

بے سر چیف از دل پُر غم سروش ۔۔۔ موت عالم ثلمۃ فی الدین بگفت

۱۲ ۶ ۳۹

قطعات تاریخ وفات حضرت قطب الواصلین خاتم المحدثین مولانا محمود حسن صاحب شیخ الهند نور الله مرقدهم

چند اشعار از قطعۂ تاریخ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب محدث دار العلوم دیوبند دام الله فیوضهم

نهضت لاحرق عالمًا ثمّ عالمًا	حديثًا وفقهًا ثم ما شئت اجمعا
وهديًا وسمتًا سنّةً وجماعةً	وخلقًا وخُلقًا بما اناف واوسعا
وعزمًا وحزمًا حِكمةً واصابةً	وزهدًا وتقوىً كان اروع اورعا
مقامًا وحالًا نيّةً واستقامةً	وخبرًا وخيرًا فارثها كلها معًا
كبيرًا ينادى فى السمٰوٰت امّةً	امامُ الهدىٰ شيخًا اجلّ وارفعا
ومولى الورى محمودهم وحميدهم	ومُسندهم فيما روى ثم اسمعا
وبلّغ عنهٗ شاهدًا ثمّ غائبًا	امانةَ ربٍّ عنده ثم اودعا
وقام بامر الله فى كلّ حالهٖ	فيخشاه إن لم يخش حصنًا ممنّعا
تصدى بظلّ العرش فى عدّ ربّهٖ	ومقعد صدقٍ قد عاه فاسرعا
وابقى قلوبًا فى الصدور كانّما	تضرّب حيتانٌ لماءٍ تفجّعا
بكيتُ امامًا اوّ وليًّا لربّهٖ	وان شئت حقًّا فالفضائل اجمعا
وكان حشًا اذنىّ دُرًّا وحكمةً	فتخرج من عينىّ دمعًا مرصّعا
سرى نعشُهٗ فوق الرقاب وطالما	سرى علمه فوق الرقاب رفّعا
وشيّعه المخلوقُ من كلّ جانبٍ	فلم ارَ الّا الفضل كان مودّعا
ولم ارَ مثل اليوم كم كان باكيًا	وما كان دمع القوم معًا مضيّعا
ولمّا حسبتُ العام عند قضائهٖ	وجدتُ وكان الله قد رسمعًا
سقى الله مثواهُ كرامةَ رَبعهٖ	وكان غدًا الى شافعًا ومشفّعا

١٣ ٥ ٣٩

جناب مولوی حکیم خلیفہ احمد حسن صاحب دیوبندی ابن عم حضرت شیخ الهند رحمة الله علیه

چو محمود الحسن واصل بحق شد	همه از شیخ و مارا مایۂ ناز
بیامد هفت سال از من مؤخر	باین عجلت چرا گردید پس باز
بدهلی از ربیع الاول هژده	سه شنبه چاشت جا بالله لقد فاز
بیاوردند نعش او بدیوبند	بمرقد مولانا قاسم سرافراز
مزار او مزار قاسمی شد	بوصل مولانا قاسم لقد فاز
بصبح چارشنبه گشته مدفون	بپابوس پدر گردید ممتاز
بگو احمد حسن فوزا ز سر درد	که شیخ الهند محمود الحسن فاز

١٣ ٥ ٣٩

بعض اشعار قصیدۂ راس الاذکیا استاذ العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی اعظمی رضی اللہ عنہم ادام فیوضہم

اس طویل قصیدہ کے (جو انشاء اللہ کامل ہو کر اپنی نظیر آپ ہی ہوگا) جناب ممدوح کو صرف چونتیس شعر لکھنے کی فرصت ملی ہے - احقر کے اصرار پر انہیں میں سے چند اشعار کتاب میں شائع کرنے کی اجازت فرمائی -

اِذَا ذُکِرَ الاَسلافُ اھلُ المکارِم — فحیَّ ھلاً بالشیخ شیخ المکارمِ

وَاِن ذکروا مَن قام للّٰہِ جاھدًا — فاخلق بذکری قائمٍ خیرِ قائمِ

واِذ کان مثلَ الغیثِ اُمّۃُ احمدٍ — فما فی لحوق التبع ریبُ لواھمِ

وَاِن کانَ فضلُ المرءِ قدرَ بلائِہٖ — وَاَبلیٰ بلاءً سابقًا فی المغانمِ

فمحمودُ ھذا العصرِ ارفعُ رتبۃً — وَاحمدُ ذکرًا عند جمعِ المواسمِ

امامٌ اتی والفضلُ ملءُ ردائِہٖ — محیّاہ کالبدرِ المنیرِ لشائمِ

اذا ما تصدّی للعلومِ ونشرِھا — لکالسیلِ مجراہ ولیس بعارمِ

اُلینَ لہٗ صُمُّ العلومِ الخضارمِ — اُلینَ لداؤدَ الحدیدُ وانّہٗ

الیہ انتھی علمُ الاحادیث جملۃً — بفقہٍ واسنادٍ فھل مِن مزاحمِ

وَطبّقَ اطباقَ البسیطۃِ صیتُہٗ — من العربِ الا اقصی الارضِ الاعاجمِ

تلامیذہٗ مثلُ النجومِ منیرۃٌ — اَدِلّاءُ ضُلّالٍ مصابیحُ ھائمِ

بحورُ علومٍ ترتمی بجواھرٍ — وعلقٍ نفیسٍ من کنوزِ الکرائمِ

وما لِطَۃ صارت مثلَ سجنٍ لیوسفٍ — محلَّ خیارِ الناسِ او سجنِ عارمِ

مالٹہ ۱۲ — محمد بن حنفیہ وراں محبوس شدند ۱۲

اقام بھا لمّا ثوی بفنائھا — صبورًا شکورًا راضیًا غیرَ واجمِ

افاد وفودَ الناسِ من کلِّ موطنٍ — رشادًا ولم یحصرہ حسبانُ زاعمِ

فتعرُّس فھم ما لم یکونوا لیعرفوا — وسلّکھم طرقَ الھدی والمعالمِ

ینتھم یدُ العدوان فاغتنموا بھا — والا فتصبح قارعًا سنَّ نادمِ

فقم ایّھا الواقی لدینکَ واعتصم — بصدقٍ ستنجو من خصالِ الذمائمِ

فمحمودُ ھذا العصرِ خذ بذیولہ — ولا تکُ عبدًا من عبیدِ الدراھمِ

ولا تشترِ الدنیا بدینک ماجنًا — فما انت من ریبِ الزمانِ بسالمِ

ولا تکُ مغترًّا بمالکَ والغنی

منتخب از قطعۂ جناب مولوی ابو الوفا سید حبیب احمد صاحب افق موسوی الحسینی امروہوی

آہ مولانائے محمود الحسن
سیدِ دار العلومِ دیوبند

فیض بخشِ ہند و مصر و چین و روس
کابل و روم و حجاز و تاشقند

چل دئے جنت کو دنیا چھوڑ کر
جب نہ آیا ہند میں رہنا پسند

اے افق لکھدو یہ تاریخِ وفات
بجھ گیا ہے اب چراغِ دیوبند
۰ ۳۹ ۵ ۱۳

۱۳۳۹ فیضانِ درد ـ از مولانا حافظ محمد عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند دام فضلہم

یاالٰہی کیا ہوا اک دم کے دم میں انقلاب
کیوں اُداسی چھا رہی ہے تجھ میں اے دارالعلوم
کیا کوئی ماہِ دو ہفتہ چھپ گیا ہے زیرِ خاک
ہو گئی گاوِ زمین ثورِ فلک جلکر کباب
ہو گیا مشکل ہمیں فرقِ حقیقت اور مجاز
تھا اسی دریائے غم میں غوطہ زن قلبِ حزیں
آفتابِ چرخِ ہمت نیرِ برجِ کمال
چشمۂ فیضِ طریقت مہبطِ انوارِ حق
نکہتِ گلزارِ قدس و گلبنِ ہدو سلوک
روحِ صبر و جانِ حلم و دیدۂ عزم و ثبات
رونقِ بزمِ افاضل حضرتِ محمود حیف
وہ ہوا ہے آج رخصت جانبِ ملکِ یقیں
ہو گیا گل وائے ناکامی سمومِ مرگ سے
ان کا صدمہ ہے کہ سنبل کھا رہا ہے پیچ و تاب
لیتے لیتے ہچکیاں سوکھی ہے سوسن کی زباں
کیا کریں شکوہ کسی سے اپنی ویرانی کا ہم
کشتۂ غم سے کہا ہاتف نے یہ سالِ وفات

گلشنِ ایجاد کی کیوں یک بیک بدلی ہوا
کیوں تری بزمِ مسرت بنگئی بزمِ عزا
ہو رہی ہے خاک بر سر کس لئے بادِ صبا
دونوں جانب نعرۂ آتش فگن ہے کیوں بپا
ہیں یہ کوکب یا یہ ہیں اشکِ ملا یک رونما
آسماں سے ناگہاں کانوں میں پہنچی یہ ندا
مطلعِ نورِ ولایت گوہرِ درجِ ہدیٰ
سرمۂ چشمِ بصیرت دیدۂ اہلِ صفا
طوطیٔ نخلِ حقائق بلبلِ باغِ صفا
زینتِ صدرِ محاسن مردمِ چشمِ وفا
ہو گئے دار الفنا سے زینتِ دار البقا
تھا نمونہ جو رشید و قاسم و امداد کا
تھا سیہ بختوں کی قسمت کا جو اک روشن دیا
انکے غم سے ہو گیا ہے زرد رنگِ کہربا
روتے روتے چشمِ نرگس میں ہے اُترا موتیا
اُٹھ گیا سر سے ہمارے ہے دو ستو ظلِ ہما
آفتابِ ہدیٰ عرفان و معارف چھپ گیا ۱۳۳۹

قطعہ تاریخ از مولوی محمد موسیٰ رضا صاحب اثیم مہدالوی ساکن چھپرہ ضلع سارن

اسیرِ عرب مالٹا کا وہ قیدی
فدا جس نے اسلام پر جان کی تھی
بکا یک خبر اُسکی رحلت کی پہونچی
نگاہوں میں تاریکیاں چھا رہی ہیں

جو شمعِ فروزاں تھا بزمِ جہاں میں
رہا شیخِ مُسلم جو ہندوستاں میں
مکاں سے گیا آج وہ لامکاں میں
اندھیرا ہوا مجلسِ دوستاں میں

اثیم اب یہ تاریخِ رحلت کی کہدو
گئے آج محمود باغِ جناں میں
۱۳ ۶ ۳۹

قطعہ تاریخ جناب مولوی محمد شفیق صاحب اطہر گرواری سلمہ اللہ تعالیٰ

مولوی مولانا محمود الحسن
نیک خو خندہ رو دور بیں

از قضائے خالقِ ہر دو سرا
ناگہاں پوشیدہ رخ زیرِ زمیں

سالِ رحلت کلکِ اطہر زد رقم
رفت از دارِ فنا خلدِ بریں
۳۰ ۶ ۴۹

قطعاتِ تاریخ از مولانا سراج احمد صاحب معتمد المدیر القاسم و الرشید دار العلوم دیوبند دام فضلہم

کیا کوئی مرتے ہیں اللہ یہ مرنے والے
اُسکی آواز پہ لبیک کہا عالم نے
آپ مامور من اللہ تھے بہرِ تبلیغ
پئے دنیائے دنی ایک قدم بھی نہ اُٹھا
دَوْر تھا ساغرِ تحدیث کا ہر شام و پگاہ
ان کے شاگرد ہیں پھیلے ہوئے دنیا بھر میں
بولتے کچھ نہیں اور سب پہ تبسم ہی عیاں
سالِ رحلت یہ ہوا غیب سے دل میں القا

وفات کے بعد یہی حالت تھی ۱۲

لوحِ محفوظ پہ ہی ثبت دوامِ محمود
آن کی آن میں سب ہو گئے رامِ محمود
یعنی پیغامِ محمد ہے پیامِ محمود
راہِ حق میں ہی کبھی اُٹھا جب اُٹھا گامِ محمود
واہ واصِلؔ علی شربِ مدامِ محمود
واقعی زندۂ جاوید ہے نامِ محمود
موت ہی یقظہ ہی پایا ہے یہ بنامِ محمود

خلدِ اعلیٰ طرب افزا ہے مقامِ محمود
۱۳ ۳۹

(۴)

بے چین تھا اس فکر میں کیونکر لکھوں رحلت کا سن
کہنے لگا ہاتف معاً سُن اے سراج مبتلا
تیرہ سو اُنتالیس میں رحلت ہی شیخ الہند کی
تیرہ سو اُنتالیس میں ہے مادّہ تاریخ کا
۱۳ ۳۹ ھ

(۴)

شکستہ آہ پشتِ جوانانِ عالم
گل و غنچہ و سرو پژمردہ گشتہ
ز تبلیغِ اسرار چوں گشت فارغ
رواں شد بجلدِ بریں روحِ پاکش
بگو اے سراجِ حزیں سالِ رحلت

دریغا کہ پیرِ بہمّت جواں رفت
کہ از گلشنِ قاسمی باغباں رفت
ہماناں بسوئے خدائے جہاں رفت
ببستہ بار نامِ خدا بر زباں رفت
بدار البقا ہادیِ مہرباں رفت
۱۳ ۳۹ ھ

(۴)

چو اُستادِ ما شیخ روئے زمیں
بپرسیدم از دل سنِ رحلتش

بجاں آفریں جانِ شیریں سپرد
بگفتا چراغِ جہانتاب مرد
۱۳ ۳۹ ھ

(۴)

گلستانِ علم و ہنر شد تباہ
سروشے بمن گفت سالِ وصال
بلا شک بگو اے سراجِ حزیں

گل و گلبن و گلشنِ علم رفت
بہ جواں مامن و معدنِ علم رفت
ز دنیائے دوں مخزنِ علم رفت

جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم از سیوہارہ ضلع بجنور

امامِ زمن شیخ محمود حسن
نمودند عزمِ ریاضِ نعیم

لکھہ یہ تاریخ وفات اُنکی حسین
حیف گل و شمع فضیلت ہو گئی
۱۹ ۴ ۱۱

حضرت محمود شیخ الہند کی
ہائے اس دنیا سے رحلت ہو گئی

جناب مولوی محمد حسین صاحب بٹھالوی فضیلت یافتہ دار العلوم دیوبند از ریاست کپورتھلہ

پے سالِ ترحیل ناظم ز غیب
رسیدہ بگوشم شہیدِ عظیم
۱۳ ۳۹ ھ

شمس الشعراء نوابزادہ خواجہ محمد افضل خان صاحب المتخلص بہ افضل رئیس اعظم ڈھاکہ

آہ شیخ الہند محمود حسن فرخندہ خوے
شد خراماں بہر گلگشتِ گلستانِ ارم

افضل آہے برکشید و گفت سالِ ہجرتش
آہ، شیخ الہند محمود حسن والا ہمم
۱۳ ۳۹

جناب بشیر علی خاں صاحب ساغر از سہوارہ ضلع بجنور

یہ کیوں ہے زمانہ میں ماتم خدایا
کہ روتا ہے ہر ایک اپنا پرایا

گیا داد خواہی کو آگے خدا کے
وہ اللہ کے دشمنوں کا ستایا

پے سالِ تاریخ بولا یہ ہاتف
اٹھا شیخ کا قوم کے سر سے سایا
۲ ۱۹

جناب حافظ عبد المجید صاحب مضطر مظفر پوری سلمہٗ

ہو اگیا آفتابِ علمِ دینِ مصطفےٰ پنہاں
اندھیرا ہو رہا ہے آج کیوں ہندوستاں کہیے

اگر پوچھے کوئی تاریخ رحلت آپ سے مضطر
تو شیخ الہند محمود حسن زیب جناں کہیے
۳۹ ۵ ۱۳ (۵)

کہو فارسی میں یہ تاریخ فوت
امامِ زماں وائے شد زیر خاک
۳۹ ۵ ۱۳ (۵)

شاہِ اقلیمِ کتاب و سنت
بہر گلگشتِ جناں شد عازم

از سر آہ نوشتم تاریخ
رفت شاگردِ رشیدِ قاسم
۳۹ ۵ ۱۳ (۵)

زاہد و متقی و عالم گر
گئے دنیا سے سوئے عالم پاک

لکھدئے مضطر یہ مصرعِ تاریخ
آہ سالارِ قافلہ در خاک
۳۹ ۵ ۱۳

جناب حافظ محمد منیر الدین صاحب منیر دہلوی شاگرد حضرت مولانا محمد عبد الرحمن صاحب مرحوم مغفور

ہائے اے مولانا محمود الحسن
ہو گئے کیوں یک بیک ہم سے جدا

ابنِ حنبل لے گیا تھا کام جو
تم نے وہ کرکے ہمیں دکھلا دیا

مرکزِ دیں پر رہے ثابت قدم
مدتوں رہ کر اسیرِ مالٹا

جب کہا اعدائے اب فرمائیے
کلمۂ حق منہ سے نکلا برملا

ہو گیا ہندوستاں ظلمت کدہ
جب ہوئے تم راہیِ ملکِ بقا

لکھ سرِ افسوس سے سن اے منیر
آپ نے کی اچھی طے راہِ رضا
۳۹ ۵ ۱۳

جناب سید احمد مرتضیٰ صاحب نظر وکیل عدالت ہائے ریاست ٹونک

چوں جناب شیخ محمود الحسن
از قضائے ایزدی در خاک رفت

گفت جبریل امیں سالش نظر
روح مولانا بخلد پاک رفت
۳۹ ۵ ۱۳

جناب مولوی عبد الرحمن صاحب از ٹونک راجپوتانہ

مولوی مولانا محمود الحسن
رفت از دار الفنا سوئے معاد

گفت سالِ رحلتش ہاتف ہمیں
اے خدا ہم عاقبت محمود باد
۳۹ ۵ ۱۳

تاریخہائے حجابِ محمود ۔ از جناب مولانا حکیم محمد قیام الدین صاحب بجت جونپوری دام فضلہم

دنیا سے اُٹھے حضرت محمود شیخ ہند
غمناک کیوں نہ قوم ہو انکی وفات سے
تاریخ ہو وصال کی اِنکے حدیث سے
تو بجت حسبِ حال یہ تاریخ ہو گئی

بے شبہ انکی موت بڑے غم کی موت ہے
ہندوستاں کے شیخ و مکرم کی موت ہے
اے دِل کہ یہ محدثِ اعظم کی موت ہے
عالم کی موت جان لو عالم کی موت ہے

نمودہ وفات الاماں شیخِ ہند
نہ نالد چرا قوم از بہرِ او
چو از داعیِ حق شنیدہ تعال
ز اوّل ربیع آہ بُد ہیجدہ
بماہِ نومبر بہ بست ونہم
بہ دہلی و در ساعتِ ہشتمیں
ز دہلی جنازہ بُبردند پس
شدہ بود اوگرچہ پیر و ضعیف
ز فیضِ علوم و ز فنِ حدیث
چو پرسد کسے بجت عامِ وصال

دریغا شد از ما نہاں شیخِ ہند
کہ یابد کجا ہمچناں شیخِ ہند
بشوقِ لقا شد دواں شیخِ ہند
کہ دادہ غمِ جانستاں شیخِ ہند
بہ شنبہ شدہ در جناں شیخِ ہند
بدار البقا شد رواں شیخِ ہند
بہ دیوبند مدفون شد آں شیخِ ہند
مگر بُد بہمت جواں شیخِ ہند
تہی کرد ہندوستاں شیخِ ہند
بگو بود فخرِ جہاں شیخِ ہند

کرد شیخ الہند از دنیا حجاب
ہیژدہ بود از ربیع الاول آں
گشت در دہلی وفاتش وقتِ صبح
بجت کن منقوش بر سنگِ لحد

حسرتا دردا دریغا حیف آہ
بود شنبہ کہ رحلت شد نزدِ الٰہ
دفن در دیوبند شد بے اشتباہ
ہیں مزارِ شیخ ہندِ دیں پناہ

چل بسے اس جہاں سے شیخ الہند
کیسا چمن کا چمن کے آہ لیتی ہے
ہیجدہم تھی ربیع الاوّل کی
یوم شنبہ کو وصال ہوا

اِن کی رحلت کا رنج بے حد ہے
موت کو کاملوں سے کیوں کد ہے
جو کہ ماہِ وفاتِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے
ان کو بس راحتِ مخلّد ہے

انکی تربت پہ بجت لکھدو یہ
فاضلِ بے بدل کا مرقد ہے

رقم زدہ رنجور دلِ اندوہگیں
محمد قیام الدین

رشحاتِ قلم جناب ابو المقبول محمود الحسن صاحب محمود متوطن انبالہ

وا دریغا حسرتا دنیا سے رحلت کر گئے
حضرتِ علامہ شیخ الہند محمود الحسن

آہ کیسے شیخ نے کی عالمِ بالا کی راہ
ہائے کیسے نامور اُستاد نے چھوڑا وطن
ماتمی ہر شہر ہے اب غم میں شیخ الہند کے
کیا عرب کیا عجم کیا روم کیا ہند و دکن

حق تو یہ ہے بعد قاسم اور رشید احمد کے تھے
رونقِ ہندوستاں اور فخرِ ارباب وطن
جنت الفردوس میں انکو ملے اعلیٰ مقام
روح پر مرحوم کے ہو فضلِ ربِّ ذوالمنن

کہدیا ہاتف نے یوں محمود سے سالِ وفات
دیوبندی آہ شیخ الہند محمود الحسن

جناب منشی محمد جعفر شریف صاحب خاکی عرفانی ٹیپوری مرتبہ مہسور

مبتلائے رنج و ماتم کرکے ہمکو دہر میں
جانبِ جنت چلے ہیں شیخ محمود الحسن
سالِ ہجری میں کہی خاکی نے تاریخِ وفات
پائے رحلت صدر عالم آہ محمود الحسن

لے بہ محاورہ دکن ۱۲

مولانا سید محمد عبد الحمید صاحب حسینی متوطن بڑگا ضلع بنارس پور

شیخ وقت خویش محمود الحسن مقبول حق — یادگار کاملان و جانشین اولیا
آنکہ عمر خویش کردہ وقف قرآن و حدیث — علمائے راہبر ہا داد از علوم مصطفا
ہیجدہ تاریخ از ماہ ربیع الاولین — روز سہ شنبہ بوقت صبح چون دہ ہبا
سوئے حق شاد ان فرعابے تامل شد روان — تار گردید بچشم اہل ارض و سما
یافت دہلی وفات دفن شد در دیوبند — زانکہ می آرامد آنجا قاسم ذی الاعتلا
بہر تاریخ وصالش فکر میکردم حمید — ناگہاں در گوش من از غیب آمد این ندا
بے سر و پا در فراقش گشت از ہر دیدہ چرخ — علم و فقر و ورع و تقوی مجد و تسلیم و رضا

از فکر مولانا عبد الشکور صاحب مظفر پوری مدرس اول جامع العلوم مظفر پور

کیف لا اصلی نار الهم اذ لم یبق لی — من شیوخ اعطو ذی صلاح کریم
مات قطب الوقت شیخ الهند محمود الحسن — قیل لی ہا فاز بجنان نعیم
نالہا بگذشت از چرخ بریں — زانتقال حامی شرع متین
از سر دل سال رحلت گفت آہ — مات محمود الحسن موت الیقین

از قطعہ تاریخ مولوی محمد نور العین صاحب مراد آبادی مقیم چھتاری ضلع بلند شہر

بتاریخ وفاتش راغب اکنوں — امام الاتقیا جنت سرا گو
دفعتاً در گوش راغب ہاتف غیبی بگفت — جامی الدین آفتاب علم زیر خاک شد

از مولوی عبد الرحیم صاحب ادہم جعفر آبادی مقیم و انباری علاقہ مدراس

جہاں میں شور و فغاں ہے کہ کیا یہ حال ہوا — ہمارے شیخ مکرم کا انتقال ہوا
کہو یہ ادہم ناچیز مصرع تاریخ — یہ شیخ ہند کا صد حیف اب وصال ہوا

از مولوی عبد الغفور صاحب نہال قصبہ بلندہ ضلع فتحپور ہسوہ

قدوۃ السالکین شیخ الہند — شد ز دہلی بروضۂ رضواں
ہاتف غیب از پئے سال بگفت — شیخ ہندی در آمد بجناں

از مولوی حمید اختر صاحب حسینی مدرس مدرسہ گلاوٹھی

قطب عالم حضرت محمود را — آہ چوں پیک اجل از ما ببرد
سال رحلت بے سر آہ و بکا — گفت اختر حیف شیخ الہند مرد

از حاجی نور محمد صاحب نوری صفدر گنج ضلع بارہ بنکی

جب سدھارے جنت الفردوس کیا — بنے ریا محبوب رب ذو المنن
نور نے تاریخ لکھی آہ کھینچ — حیف شیخ الہند محمود الحسن

حافظ محمد عبد الرحمن صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر پولیس کاندہلہ ضلع مظفر نگر

شیخ ہندی ہوئے واصل حق سے — حافظا سخت ہے داغ ہندی
سنا ہاتف سے یہ سال رحلت — گل ہوا آج چراغ ہندی

از نتیجہ فکر مولوی امام الدین احمد خاں صاحب آرزو گوپامئوی ارا ضلع ہردوئی نیا

آہ حق آگاہ عالم بے بدل — سوئے جنت رفت از دار المحن
ماہر اسرار قرآں و حدیث — واقف احکام رب ذو المنن
چارہ ساز درد قوم و ملک بود — شام غم ہیہات شد صبح وطن
آرزو آمد خبر چوں ناگہاں — بہر سال وصل بارنج و محن
از تحیر گفت دل بے ساختہ — افّوہ شیخ الہند محمود الحسن
آہ بے سر وارثان دین شدند — حیف شیخ الہند محمود الحسن

۱۳۳۹ - ۲۶ - ۱۳۴۵

از مولوی ریاض محمد خاں صاحب چین پوری شاہ آبادی

شیخ ہند از ہند چوں در خلد رفت — بس ریاض از غم ملال آسا بگفت
از سر باب جناں آمد ندا — رفت در جنت شدہ سال وفات

مولوی محمد شفیق صاحب اطہر گرداوری سلمہ اللہ تعالیٰ

شیخ محمود الحسن والا گہر — دہر سے جب چل بسا وہ خوش نہاد
ہائے کے سر سے لکھا اطہر نے سال — داخل جنت ہوا قدسی نہاد

فہرست کتب مفید و معتبر تصنیفات سرتاج علمائے دار العلوم دیوبند وغیرہم

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القلوب۔ ذکر اشغال مراقبہ مجاہدہ وغیرہ متعلقہ تصوف بزبان فارسی قیمت ۴/
گلزار معرفت۔ مع قصیدہ منظوم ۲/
مثنوی تحفۃ العشاق۔ قیمت ۲/
ارشاد مرشد۔ ضروری اشغال و وظائف ۱/
دردنامہ غمناک عاشقان الٰہی کی فریاد ۔/
جہاد اکبر۔ ۲/
کلیات امدادیہ۔ اسمیں حضرت کی تمام [illegible] بالا تصانیف موجود ہیں بلکہ ایک رسالہ زیادہ ہے قیمت رعایتی ۱۲/

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مباحثہ شاہجہانپور۔ تمام مذاہب باطلہ کی تردید عقلی دلائل قابل دید قیمت ۷/
تحذیر الناس۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کا اعلیٰ ثبوت کئی طرز سے اور عجیب فضائل و کمالات۔ ۲/
مناظرہ عجیبہ۔ تحذیر الناس پر بعض اعتراضات کے نہایت علمی جواب دقیق مضمون قیمت ۶/
تحفہ لحمیہ۔ گوشت کے کھانے کا عقلی ثبوت ۲/
تصفیۃ العقائد۔ وہ دلچسپ مراسلت جو شمس العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم اور سی۔ ایس۔ آئی سر سید احمد خان صاحب بہادر بانی علیگڈھ کالج کے درمیان عقائد اسلام اور اصول شریعت کی تحقیق کے متعلق رہی۔ قیمت ۳/
جواب ترکی بترکی۔ ورود آریہ سماج ۳/
سوانح عمری۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند قیمت ۳/
اسرار قرآنی۔ از حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند۔ قیمت ۱/

حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ہدایۃ المعتدی۔ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے کی ممانعت احادیث سے علمی بیان ہے قیمت ۲/
ہدایۃ الشیعہ۔ ہادی علی لکھنوی کے اشتہار اور دس سوالوں کا جواب۔ ۴/
زبدۃ المناسک۔ مسائل و احکام حج کا ضروری و کار آمد بیان بہت چھوٹی تقطیع ۲/
براہین قاطعہ۔ انوار ساطعہ کا جواب ہے تمام ناجائز رسوم و بدعات کی تردید اور جملہ اعتراضات کا جواب نہایت علمی تحقیق سے دیا ہے۔ قیمت ۱/
فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم۔ ۱/
میلاد شریف کے متعلق بزرگوں کا فتویٰ ہے ۱/
رسالہ جمعہ یعنی چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں علمی بیان ہے عام فہم نہیں قیمت ۱/
احتیاط الظہر کا فتویٰ۔ قیمت ۔/
مفت تقسیم کرنے والوں کو ایک نسخہ کے چار نسخے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بہشتی زیور۔ عقائد و اعمال و فقہ کا یہ زیور نصاب عورتوں کے لئے تصنیف ہوا ہے مگر مرد و عورت کے لئے یکساں مفید ہے قیمت فی حصہ ۴/ کامل دس حصے خراب چھپے ہوئے ۱۲/
بہشتی گوہر۔ یہ بہشتی زیور کا گیارہواں حصہ ہے۔ اسمیں خاص مردوں کے مسائل اور معالجات اور مجرب نسخے ہیں قیمت ۹/
معرفت الحقیقت۔ ایک وعظ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱/
اصلاح الرسوم۔ رسوم مروجہ کی خرابیاں اُن کی اصلاح کا طریقہ شرعی قواعد سے علمی عبارت میں مدلل و مفصل بیان کیا ہے اہل انصاف و جاہل و مزدور کو نہیں ہے قیمت ۴/
قصد السبیل۔ تصوف کا نہایت جامع و با یکوزہ کا مصداق رسالہ عالم جاہل بیکار اور مشغول چار و کے لئے جدا جدا تعلیم ضرور خرید فرمائیے ۲/
تحقیق تعلیم انگریزی قیمت ۔/
حقیقت تصوف۔ امام جلال الدین سیوطی کے ایک رسالہ کا ترجمہ ہے مع اضافہ مفیدہ حضرت مولانا کے ایک شاگرد صاحب نے مولانا کے ملاحظہ کے بعد شائع کیا ہے قیمت ۱/
اعمال قرآنی۔ قرآن مجید کے وظیفے دعائیں تعویذ حصہ اول ۱/ دوم ۲/ سوم ۲/ ۵/
الاسلام۔ مؤلفہ مولانا الحاج الشاہ شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ جسمیں اسلام کی حقیقت دلائل عقلی سے نہایت مؤثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کی ہے قیمت ۴/

فہرست کتب معروف درسی وغیرہ

شمس الرمل	محبوب الرمل	سراج الرمل	انوار الرمل	کاشف اسرار خواب	مفتاح الجفر
تعبیر الرویا	انوار النجوم	آسمان نجوم	احسن القواعد	مسدس حالی	دیوان لطف
دیوان عبیدی	دیوان محسن	دیوان سید	دیوان غالب	واسوخت صفیر	واسوخت قلق
کلیات منیر	دیوان آتش	دیوان ناسخ	دیوان حافظ	دیوان ذوق	کلیات شاہ تراب
کلیات خاقانی	کلیات سعدی	کلیات جامی	کلیات خسرو	کلیات صائب	دیوان انوری
کلیات حزین	دیوان مخفی	دیوان شہید	کلیات نظیری	دیوان گویا	کلیات ظفر
دیوان خواجہ وزیر	دیوان نسیم	دیوان شمس تبریز	دیوان درد	دیوان ناصر علی	واسوخت امانت
کریما	مامقیمان	خالق باری	آمد نامہ	دستور الصبیان	انشا فائق
انشا خلیفہ	انشا مادھورام	انشا بہار عجم	گلستان	بوستان	یوسف زلیخا
سکندر نامہ	بہار دانش	ابوالفضل	انوار سہیلی	انشاء گلشا	خرد افروز
انشا عجیب	پنج رقعہ	محمود نامہ	عطائی نامہ	طاہر وحید	رسائل طغرا
قصائد عرفی	ہفت بند	شگوفہ محبت	گلشن جانفزا	فسانہ عجائب	اگر گل
باغ بہار	آرائش محفل	گلزار نسیم	گل بکاولی	قصہ شاہ روم	نورتن
گل صنوبر	بیتال پچیسی	سنگھاسن بتیسی	پدماوت	نلدمن	صبح کا ستارہ
قیامت نامہ	معراج نامہ	نور نامہ	وفات نامہ	عہد نامہ	چہل رسالہ
طوطا کہانی	مثنوی میر حسن	لیلے مجنون	کریم اللغات	برہان قاطع	صراح

العقل والنقل - مؤلفہ جامع العلوم العقلیہ والنقلیہ مولانا مولوی شاہ شبیر احمد صاحب عثمانی نہ فیضہ عجیب و غریب سلیس پیرایہ میں ۱۰/

سبیل السداد - از مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دربھنگوی بریلوی قیمت ۴/

تزکیۃ الخواطر - احمد رضا صاحب نے جو بزرگوں پر اتہام لگائے تھے اُن کا مفصل جواب از مولانا مرتضیٰ حسن صاحب قیمت ۳/

توضیح المراد - استمداد از اہل قبور میں مفصل جامع دلچسپ رسالہ از مولانا موصوف ۶/

نور الایضاح (عربی) فقہ کی نہایت جامع بجائے منیۃ المصلی درس میں داخل کی گئی ہے قیمت ۸/

مرقات - مع حاشیہ مرآت (عربی) درسی کتاب ہے جس کا جدید حاشیہ جو نہایت نافع ثابت ہوا ہے اسپر چڑھایا گیا ہے اس کے سامنے کوئی مرقات پسند نہیں کیجاتی متن خط عربی اور حاشیہ نستعلیق نہایت صاف اور عمدہ طبع ہوئی ہے کاغذ سفید وحنائی کی قیمت ۵/ ایضاً کاغذ زرد ۶/

سبعہ معلقہ (عربی) محشی بحواشی نافعہ ۵/

چند کتب عربیہ مفیدہ حاشیہ جدیدہ

کنز الدقائق - محشی بحواشی جدیدہ نافعہ (عربی) فقہ کی مشہور کتاب ہے جس کو اب بہترین حواشی اور طباعت سے مزین کیا گیا ہے کاغذ سفید حنائی - زرد - قیمت ۵/

ایضاً کاغذ گلابی و آسمانی ۶/

دیوان حماسہ - محشی جدید نہایت اعلیٰ حواشی اور طباعت نفیس علماء اور طلباء علم ادب کو جلد منگانا چاہیئے قلیل رکھا گیا ہے مع رسالہ الفاظ مترادفہ و شرحہا کاغذ سفید ولایتی ۱۲/ ایضاً حنائی ۱۲/ زرد ۱۲/ گلابی ۱۲/

دیوان متنبی - محشی بحواشی جدیدہ جسکے بعد کسی شرح کے دیکھنے کی ضرورت نہیں حل مطالب اور حل لغات جدا جدا نہایت نفیس اور عمدہ کاغذ سفید ۱۲/ کاغذ حنائی ۱۲/

سراجی - محشی بحواشی جدیدہ از مولانا سید اصغر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند قیمت ....

مولانا اصغر حسین صاحب کی بعض تالیفات

مفید الوارثین شرح میراث المسلمین { میراث المسلمین کو جس شخص نے دیکھا نہایت پسند کیا اور بڑے بڑے معتبر علماء نے اُسکی مضامین کی تصدیق و تعریف فرمائی لیکن اکثر حضرات نے فرمایا کہ کسی قدر مضمون بڑھادئے جائیں تو نہایت مناسب ہو اسلئے مؤلف صاحب نے نہایت محنت و سعی سے ایک نہایت مفصل اور طویل عام فہم مستقل رسالہ علم فرائض میں تصنیف فرمایا - میراث المسلمین کے تمام مضامین کو کامل تشریح اور وضاحت سے لکھدینے کے علاوہ علم فرائض کے فضائل اسکی حقیقت اسلام سے پہلے میراث تقسیم ہونے کا دستور - میراث کی ابتدا - اُسکے احکام نازل ہونے کے وقتے تجہیز و تکفین کا بیان - مرض کے اقرار اور وصیت - و قرض و طلاق و مہر وغیرہ کا ایسا مفصل بیان جو کسی دو کتاب میں نہیں ملیگا وارثوں کے مفصل حصے اور میراث جدات (یعنی) نانی دادی کی بے مثل تفصیل و تشریح عام فہم نقشوں اور فہرستوں کے بعض علمی فائدے - مثلاً والدہ کا حصہ والد سے کم کیوں ہے جابجا عام فہم مثالیں عصبات کی تفصیل ہر قسم کے وارثوں کا نقشہ مع دلیل شرعی - ذوی الارحام کے مختصر مسائل اور عام فہم نقشے اور شجرے ذوی الارحام کا بیان - حاجب - محجوب - مفقود موجود - محروم وغیرہ کا مستقل بیان ہر ایک وارث کے حالات کو تین تین دفعہ مختلف طریقوں سے سمجھا دیا ہے تاکہ بہت کم استعداد کے مسلمانوں کو بھی نفع پہونچے چھ نقشے نہایت محنت سے مرتب کرکے لگائے ہیں معمولی استعداد کا شخص اسکے مطالعہ سے ہزار ہا مسائل بتلانے پر قادر ہو جاتا ہے - طالب علمان عربی کیلئے بھی یہ کتاب بہت مفید ہے - تمام قواعد اور مسئلے بنانے کا طریقہ اس سے بسہولت معلوم ہو سکتا ہے اس کے چھ حصے ہیں کل حصے ایک جگہ عمدہ کاغذ کے ۲۲۴ صفحے پر خوبصورت خط ہیں قیمت ۱۰/ صرف ستر نسخے رہگئے ہیں پھر شاید مدتوں کے بعد تیار ہوگی - اور خرچہ ڈاک ۲/

فتاوی محمدی مع ترجمہ دیوبند دو حصہ

صحابہ رضی اللہ عنہم کے استفتاء کے جوابات خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماکر اُنکی تسلی فرمایا کرتے تھے اور وہ حضرات نہایت خوشی سے اُن پر عمل کرکے فلاح دارین حاصل کرتے تھے اُن فتاوی کے ایکسو بیس فتاوی کو نہایت معتبر و مستند کتب اسلامیہ سے انتخاب کرکے حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب محدث دار العلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دیوبندی شاگرد نے اردو میں ترجمہ کرکے جمع کر دیا ہے اور ہر استفتاء کے جواب کے بعد اُن [illegible]

بذریعہ خط و کتابت اس پتہ پر روانہ فرمائیے :- دار التدریس والاشاعت مولوی سید اصغر حسین صاحب دار العلوم دیوبند

غیاث اللغات	منتخب اللغات	فرہنگ جہانگیری	بہار عجم لغت	شفاء الامراض	طب اکبر اردو
طب اکبر فارسی	میزان الطب	طب احسانی	مرکبات احسانی	مخزن الادویہ	زبدة الحکمیہ
مجربات اکبری	قانونچہ	مفید الاجسام	تشریح الاجسام	افسر ابی	ہدایۃ الطبا
طب اکبر فارسی	طب یوسفی	استمداد الاستمتاع بمالیۃ ملذبہ الاسماع	رجوم الشیاطین	تردیدِ مذاہب	مسلمات لامذہبان
آیات بینات	تحفۂ اثنا عشریہ	ازالۃ الغین	درود تاج	درود اکبر	خدا کی رحمت
راحت القلوب	صبح ازل شام ابد	تاریخ حبیب الٰہ	میلاد شریف شہید	میلاد جدید	ظفر بلبل شرح حصن حصین
مشارق انوار	دلائل الخیرات	روضۃ الاحباب	شواہد النبوت	مثنوی مولانا روم	قائم نامہ
نیرنگ تقدیر	پنجسورہ مترجم	ریاض العارفین	وزیر نامہ	تاریخ بھوپال	سعدیہ غیوض
بہار عجم	بلقیس سلیمان	جامع التفاسیر	تفسیر سورۂ یوسف	صواعق محرقہ	منقبت حضرت
طوبا و نعم	کنز الشہادتین	ذکر الشہادتین	مخارج الحروف	اخلاق محسنی	اخلاق جلالی
اخلاق ناصری	حدیقۂ دانش	شرح بوستان	میرزاہد امور عامہ	میزان الصرف	پنج گنج زبدہ
ہدایۃ النحو	کافیہ	شرح ملا جامی	ضریری	زنجانی	مصباح
قال اقول	ملا حسن	رشیدیہ	الفیہ	عجائب المخلوقات	نام حق

سوائے انکے اور بھی ہر قسم کی کتابین مطبع مین موجود ہین اور ہر قسم کا کام مطبع مین طبع ہوتا ہے اور چھپائی وغیرہ صاحب فرمائش کو خط کتابت سے دریافت ہو سکتا ہے اور جس قسم کا مال ساخت لکھنؤ یا دہلی یا کلکتہ یا ڈھاکہ یا جا ٹگام وغیرہ کی ضرورت ہو وہ بھی مطبع سے روانہ کیا جا سکتا ہے۔

العبد قطب الدین احمد عفا عنہ مالک مطبع نامی لکھنؤ کٹرہ ابو تراب خان۔ مارچ سنہ ۸۵ع